محمد شریف منشی فاضل

جلد ۴ فہرست نمبر ۴

تصاویر:- سہ رنگی :- عرض و نیاز
یک رنگی :- (۱) سہیلیوں کی خوش فعلیاں - ۲- شاہجہان کی آخری گھڑیاں - ۳- آبشار

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام)

پنجاب کی اتحاد پارٹی کے رہنما جس سیاسی پروگرام کو لے کر میدان میں آئے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے کوئی سمجھ بوجھ کا انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پروگرام "آئیڈیلزم" یا شاعرانہ تخیلات کا آئینہ دار ہے - اور اس لئے ناممکن العمل ہے -

پنجاب کے سیاسی حالات کا مبصر بہ یک نظر اس پروگرام کو وقت کا بہترین نظام عمل تصور کرے گا -

اتحاد پارٹی کا پروگرام جمہوریت کی حسین ترین تصویر پیش کر رہا ہے - پھر اس پارٹی کے رہنما حکومت کے نظم و نسق کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں - اُن کی سابقہ خدمات صوبے کی تاریخ کے صفحات کو چمکا رہی ہیں - اس کے مقابلے میں جو پارٹیاں نبرد آزمائی کا ارادہ رکھتی ہیں نا تجربہ کار، فرقہ پرست، اور ان کے سیاسی پروگرام کا اصلی عنصر تعمیر کی بجائے تخریب ہے -

گذشتہ تجربات ہمارے لئے شاہد عادل اور گواہ ناطق کا حکم رکھتے ہیں ان تجربات کی جانب سے چشم و گوش کو بند کر لینا مستقبل کو خطرہ زار بنا لینے کے مرادف ہوگا -

اتحاد پارٹی کا پروگرام تعمیری ہے - وہ مانتی ہے کہ آئندہ دستورِ حکومت ہمارے مطالبات کو پورا نہیں کرتا - اس لئے ناقص بھی ہے اور ہمارے واجبی حقوق کے لئے غاصبانہ بھی - مگر اس لعنت کو ایک ضروری لعنت کے طور پر قبول کر لینے کے سوا چارہ کار بھی نہیں - موجودہ دستورِ حکومت اس سے بھی زیادہ ناقص اور حقوق کش تھا، لیکن اس کو رد کرنے کے تمام افسوں بیکار ثابت ہوئے اور اسے بادلِ ناخواستہ برگرم سے گرم پارٹی کو قبول کرنا پڑا - سول نافرمانی، پکٹنگ ٹیکس کی عدم ادائیگی، جیل، دار و رسن کے تمام ہنگامے بھی اس دستورِ حکومت کو تبدیل نہ کرا سکے - اور بالآخر ہنگامہ آفریں جماعتیں بھی تعاون و موالات پر مجبور ہوئیں اور اس تعاون کے ذریعہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا رہی ہیں - اس وقت مجلسِ قانون سازِ ہند میں سب سے طاقتور پارٹی کانگریسیوں اور سوشلسٹوں کی ہے - آئندہ دستورِ حکومت ناقص سہی مگر موجودہ دستور کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر ہے اور بقول پروفیسر گلشن رائے "یہ دستورِ حکومت کبھی نافذ ہوگا - اور کوئی

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد پارٹی ایک رہنما رہی ہے - وہ جانتی ہے کہ جدید دستورِ حکومت کو کامیاب بنانا موجودہ حالت میں صحیح پالیسی ہے - موجودہ ناقص ترین دستورِ حکومت سے تعاون کر کے اتحاد پارٹی نے اپنی اقلیت کے باوجود صوبے کی تعمیر و تخلیق سے متعلق جو شاندار اور زریں خدمات انجام دی ہیں - ہندوستان کا کوئی صوبہ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا - ذیل کے جدول سے اتحاد پارٹی کی قابلِ قدر مساعی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا -

موجودہ دستورِ حکومت سے پہلے صوبے کی تعلیمی رفتار حسبِ ذیل تھی -

آرٹ کالج	۳	پرائمری اسکول	۴۰۶۰
میڈیکل کالج	۱	زنانہ ہائی اسکول	۳
ایگریکلچر کالج	۱	" مڈل اسکول	۴
وٹرنری کالج	۱	" پرائمری اسکول	۶۹۵
ہائی اسکول	۴۰	طلبہ کی تعداد	۴۸۰۲۸۳
مڈل اسکول	۲۶۷	طالبات کی تعداد	۶۲۵۸۱

موجودہ دستورِ حکومت سے تعاون کر کے اتحاد پارٹی نے مذکورہ بالا رفتارِ تعلیم کو پرواز میں تبدیل کر دیا - ملاحظہ ہو -

ڈگری کالج	۵	ٹریننگ اسکول	۳
انٹرمیڈیٹ کالج	۱۹	صنعت و حرفت کے اسکول	۲۰۰
ہائی اسکول	۱۱۵	تعداد طلبہ	۱۰۷۹۸۷۹
مڈل اسکول	۳۱۰۶	تعداد طالبات	۲۸۰۰۰۰
پرائمری اسکول	۵۰۰۰۰		

یہ حیرت انگیز رفتارِ تعلیم حسبِ تفصیل ذیل ہوئی ہے - کہ ہر ضلع میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج - ہر تحصیل میں ایک ہائی اسکول - ہر آٹھ میل کے رقبے پر ایک اپر مڈل اسکول ہر چھ میل کے اندر ایک لوئر مڈل اسکول - ہر دو میل میں ایک پرائمری اسکول، جاری کیا گیا -

ادبی دنیا لاہور

سالنامہ ۱۹۳۷ء

فہرستِ مضامین

تنقیدی مضامین

ادبی مضامین

حصۂ نظم

فہرستِ تصاویر

تین درجن سے زیادہ اہلِ قلم کی تصاویر

۱۵- مسجدِ غرناطہ- اندلسی اور گاتھک طرزِ تعمیر و تزئین کا لاجواب مرقع جو ہمیں ہسپانیہ سے آئی ہوئی ایک خاتون نے عنایت کیا ہے (سہ رنگی)- ۱۶- ساحرہ- لیڈی ہیلٹن مشہور یونانی ساحرہ سرسی کے بھیس میں (یک رنگ)-

پیغاماتِ تہنیت

"ادبی دنیا" اس سالنامے کی اشاعت سے اپنی عمر کی دسویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس عرصے میں اس نے جو مفید خدمات انجام دیں اُن کی قدر دانی کے اظہار میں "ادبی دنیا" کے بعض معزز سرپرستوں نے ہمیں تہنیت کے پیغامات بھیجے ہیں۔ جو شکریے کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

آنریبل سر جگیندر سنگھ وزیرِ زراعت پنجاب

"ادبی دنیا" کا ایک مقصد اور پیغام ہے۔ یہ اپنے ناظرین کے سامنے آرٹ اور ادب کا بلند مطمح نظر پیش کر کے اُن میں ایک ایسی روح پھونکتا رہتا ہے جو زندگی کی اُن بے کیفیوں پر غالب آنا سکھاتی ہے جو ہماری طاقت کو ہر لمحہ سلب کرتی رہتی ہیں اور ہمیں اُن برکات سے بہرہ اندوز کرنے والی قوتوں سے محروم کرتی رہتی ہیں جو فطرت اور خدا کی طرف سے بارش کی طرح ہمارے ملک پر ارزانی ہوا کرتی ہیں۔ میں ہمیشہ "ادبی دنیا" کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

آنریبل سر گوکل چند نارنگ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب

مجھے یہ سُن کر نہایت مسرت ہوئی کہ "ادبی دنیا" اپنی عمر کی دسویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد اور بہترین خواہشات کا ہدیہ قبول کیجیے۔

آنریبل میجر سردار سر سکندر حیات خاں وزیر مالیات حکومت پنجاب

"ادبی دنیا" پچھلے نو سال سے پنجاب اور بیرونجات میں اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ اس

کے مضامین ہر پہلو سے نہایت پسندیدہ ہوتے ہیں۔ بالخصوص اقتصادی مضامین ملک کی بہبودی کے لئے نہایت مفید ثابت ہونے چاہئیں۔ امید ہے اس کی اشاعت میں دن بہ دن توسیع ہوتی رہے گی۔ میں ادارۂ "ادبی دنیا" کو اُن کی خدماتِ اردو ادب پر مبارکباد دیتا ہوں اور اس کی ترقی کا خواہاں ہوں۔

آنریبل ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ

میں آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ مجھے آپ کے رسالے کے لئے کوئی مضمون لکھنے کا شاید موقع نہ ملے گا۔ بہرحال میں ہر وقت "ادبی دنیا" کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

فاضلِ محترم سیّد عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانکل

مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ "ادبی دنیا" نے اپنی عمر کے نو سال ختم کر لیے ہیں۔ اس زمانے کے دوران میں اس نے اردو کے حق میں قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں میری دلی خواہش ہے کہ اس کو اپنے مقاصد میں بیش از بیش کامیابی ہو۔

خان بہادر نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ ایم ایل سی رئیسِ اعظم و چیف سیکرٹری یونینیسٹ پارٹی لاہور

ادبی دنیا مشرق کے بہترین رسائل میں سے ہے اور ہندوستان کے اردو رسائل میں تو اس کی مقبولیت اور ہردلعزیزی اپنا جواب نہیں رکھتی اس کی صورت اور سیرت دونوں نہایت مسرت افروز ہیں میں تہِ دل سے آرزومند ہوں کہ "ادبی دنیا" کے مدیر اور اُن کے معاونوں کو اپنی کوششوں میں ہمیشہ کامیابی ہو۔

بزم ادب

جیسے یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں ہر لحہ اپنے محور کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے اور مختلف فضاؤں اور ہواؤں سے انقلاب آفریں اثر لیتی رہتی ہے۔ یہی حال دنیائے ادب کا بھی ہے۔ اسے بھی ایک فضا میں قرار نہیں اور یہی اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ ادب کی مختلف تحریکات اور مختلف رجحانات اس کی اسی سرگشتگی کا نتیجہ ہیں۔ اور جو اخراجات یہ اخذ کرتی رہتی ہے اُن کے مآخذ کی تجدید اور تنوع بھی اس کی اسی حرکت پر منحصر ہے۔ گذشتہ چند سال کے اردو ادب پر اور خصوصاً اُس ادب پر جو رسائل کے ذریعے سے ملک میں پیش ہو رہا ہے اگر نظر ڈالی جائے تو بیسیوں نئی باتیں اور سینکڑوں نئے رنگ ملیں گے جنہوں نے ادب کی ترقی اور توسیع میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان چند سالوں میں چونکہ زبان کے خادموں کی توجہ متقابل مطالعے کی طرف رہی اس لئے اپنی زبان کے ساتھ دوسری زبانوں کی خوبیوں پر غور کرنے کا بھی انہیں موقع ملتا رہا۔ اردو چونکہ ایک چلتی زبان ہے اس کے لئے ایسے مواقع اس کی روحِ ترقی کو اور تازہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مفکرینِ ادب نے دیکھا ہوگا کہ اردو زبان آج کتنی شگفتگیوں جدتوں اور وسعتوں کی حامل بن رہی ہے۔ طرزِ تحریر کا انقلاب سلاست اور ٹھیٹھ پن میں نمودار ہوا ہے۔ علمی حیثیت سے مصنفین نے کئی نئے شعبہ ہائے علم پر قلم اٹھایا ہے تحقیقی لحاظ سے ایسے ایسے مضامین لکھے گئے جو نہ صرف حامیانِ زبان کے لئے باعثِ ناز ہو سکتے ہیں بلکہ جو السنۂ ملک کی صحیح حیثیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ شاعری میں کئی ایسے اسلوبِ بیان اور اصنافِ سخن رائج ہو چکے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے بغاوت خیال کئے جاتے تھے۔ غرضیکہ اردو نے اس سعی و جہد کے زمانے میں ترقی کی طرف جتنے قدم بھی اٹھائے ہیں اُن کے لئے وہ مستحق مبارک باد ہے۔

اس تجدید و توسیع کی ذمہ داری زبان اور ملک کے جن بیدار مغز اور تخلیق پرور طبقے پر عائد ہوتی ہے ہمیں مسرت ہے کہ اس کا ایک معتدبہ حصہ دوسرے بلند پایہ رسالوں کے ساتھ "ادبی دنیا" کو بھی ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ سالنامے میں جو مضامین درج ہوئے اگرچہ اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ ناظرین کو سرسری پڑھنے ہی سے ہوگا لیکن تعارف کے طور پر یا توجیہ انتخاب کے طور پر ہم یہاں چند سطور لکھنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ انتخاب شاید اس سے دس گنا زیادہ مواد میں سے عمل میں آیا۔

علمی مضامین میں علامہ کیفی دہلوی کا مضمون "پنجاب کا اولیں اردو ماہنامہ" حسبِ معمول اُن کے تحقیقی انداز کا ایک پُر از معلومات ذخیرہ ہے۔ اس اولیں ماہنامے کے موضوعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو صحافت پنجاب میں آغاز ہی سے ایک شاندار اٹھان کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ علومِ جدیدہ پر جس بے تکلفی سے اس کے مقالہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے اور جس خوبی سے انہیں نبھایا ہے اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ایسا ہی ایک اور تحقیقی مضمون "مسلمان اور ہندی زبان" ہے، جسے پروفیسر رام سروپ صاحب شاستری نے بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے۔ ایسے مضامین کی اشاعت اردو ہندی کے متعصب حامیوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ "جاپان میں جشنِ نوروز" اور "جاپان کی موجودہ تعلیم پر ایک نظر" دونوں مضامین ہمیں بیرونِ ہند سے موصول ہوئے ہیں۔ پہلا پروفیسر نور الحسن صاحب برلاس کا اور دوسرا پروفیسر آرگامو صاحب کا ہے۔ یہ دونوں حضرات ٹوکیو کے سکول آف فارن لینگوئجز کے فاضل اساتذہ میں سے ہیں اور جاپان میں اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ "پنڈت جواہر لال نہرو" کی سوانح عمری سید بادشاہ حسن صاحب نے لکھی ہے۔ اختصار کے باوجود انھوں نے کوئی اہم واقعہ نظر انداز نہیں کیا اور واقعات کی کثرت کے باوجود اسے دلچسپ بنانے اور ذاتی رنگ دینے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ "تہذیب کدھر جا رہی ہے" ڈاکٹر ایس ایم اختر صاحب کا ایک بصیرت افروز مضمون ہے جسے انہوں نے پورے تین مہینے کی محنت اور ہزارہا صفحات کے مطالعہ کے بعد قلمبند کیا ہے۔ دنیا کی موجودہ اقتصادی کشمکش کا تجزیہ اور تین بڑی آویزشوں کا تذکرہ انہوں نے ایسے طریق سے کیا ہے کہ اقوامِ عالم کے مسالک اور سیاسیاتِ حاضرہ سے کافی واقفیت ہو جاتی ہے میاں کفایت علی صاحب کا مضمون "آزادی" بھی ایک قیمتی مطالعہ ہے شہزادہ پیا

کی شاعری" حضرت تسکین عابدی کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے اور ایک ٹھوس سرمایۂ ادب ہونے کے ساتھ ہی بے حد دلچسپ بھی ہے۔

تنقیدی مضامین میں علامۂ عرشی امرت سری کا مضمون "مرزا غالب کی فارسی شاعری" مصنف کے تبحرِ علمی اور قوتِ تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ غالب کے فارسی کلام پر اس وقت تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ مضمون مبسوط ہونے کے ساتھ ہی اس کمی کو بھی بڑی حد تک پورا کر رہا ہے۔ مولانا فضل حق صاحب قریشی کا مضمون "نیپال کے دیہاتی گیت" ایک انوکھا اور دلکش موضوع ہے۔ سادگی اور اثر اس کی خصوصیات ہیں۔ حضرتِ تمکین کاظمی کے مضمون کی نسبت یہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ ایک نیا مضمون ہے۔ انہوں نے ہمیں اردو کے ایک خوش گو شاعر سے متعارف کرایا ہے اور اس کے لئے وہ تمام شائقین ادب کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ "ایران کی جدید شاعری" پر پروفیسر اظہر علی صاحب فاروقی کا تبصرہ ایک بغور پڑھنے کے لائق مضمون ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ ایرانی شاعری کی جدتیں اور موضوع اردو شعرا کے لئے دعوتِ فکر ثابت ہوں گی۔

ادبی مضامین میں جناب عظیم قریشی کے "رادھا کے گیت" اپنی رزم و شیریں ہندی زبان کے لئے، غلام عباس صاحب مولوی کا "شریک سفر" اپنی فلسفیانہ ظرافت کے لئے اور حضرتِ غلیل کا مضمون اپنے شگفتہ مزاح کے لئے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

افسانوں میں "تہاسانی کا تحفہ" اپنی رنگینی اور رفعت کے لحاظ سے خوب ہے۔ مصنف نے اس میں دنیائے احساس کی قیامت دکھائی ہے۔ مظفر احمد صاحب کا افسانہ "نینا" ایک دلکش انتخاب ہے اور اُن کی کوہستانی مصروفیات میں ایک جوئے شیر کا حکم رکھتا ہے۔ "دولہا دلہن کی ڈائری" حضرتِ نسیم رضوانی کا ایک واقعیت سے لبریز افسانہ ہے۔ معاشرت کے اس پہلو کو شاید نسیم صاحب نے پہلی بار چھیڑا ہے۔ اُن کے انوکھے طرزِ بیان نے اسے اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ ممتاز مفتی صاحب کا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" اُن کے آرٹ اور نفسیات کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ وہ تحلیل نفسی کے ایک سرگرم طالب علم ہیں۔ اور اس جدید علم کو وہ اپنے افسانوں میں اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی علمی حیثیت اور اثر اندازی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ عاشق حسین صاحب بٹالوی کا افسانہ "خوشبودار خط" واقعہ نگاری کا کمال ہے۔ حضرتِ طاہر قریشی کا افسانہ "مسرت" محبت کے کارناموں کا ایک مثالی بیان ہے۔ "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" میں محترمہ سلیمہ سلطانی بیگم صاحبہ لکھنوی نے ایک شگفتہ اور شوخ کردار کی تخلیق نہایت عمدگی سے کی ہے۔ ساقی صاحب کا افسانہ "محبت کے کرشمے" اپنے موضوع کی عظمت اپنے نام سے ظاہر کرتا ہے۔ "مینارِ غزالاں" حضرتِ ظفر قریشی کا ایک تاریخی افسانہ ہے جس کی سطر سطر سنسنی سے بھری ہوئی ہے۔ مہر محمد خاں صاحب شہاب اور حضرتِ آسی کے افسانے "بیاہ" اور "جھوٹ" ہندی طرزِ تحریر کے دو بہترین نمونے ہیں۔ "خواب یا حقیقت" محمود احمد خاں صاحب کا ایک روحانی افسانہ ہے جس کے واقعات کی دلچسپی اس کے انجام میں مرکوز ہے۔

ڈراموں میں اندر لال داس صاحب کا طبعزاد ڈراما "کمار" مکالمے، کرداروں کی تعمیر اور دوسری فنی خصوصیات کا بدرجہ اتم حامل ہے۔ مولانا شاہد احمد صاحب کا ڈراما "تخیل پرست انسان" کامیاب ترجمہ ہے اور دلچسپ ہے "بھیڑیا" مظفر احمد صاحب کا ترجمہ شدہ ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اسے خوب اپنایا ہے۔ "دو مسئلے" صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم نے ٹالسٹائی کے اسی انداز کے ڈراموں کو مدِنظر رکھ کر لکھے ہیں۔ دراصل ان میں دنیا دی معیاروں پر ایک طنزِ لطیف ہے۔

اب رہا **حصۂ نظم**۔ اس کی نسبت ابھی تک ہمارا مذہب وہی ہے جس کا اظہار ہم گزشتہ سالنامے میں کر چکے ہیں یعنی شعر ایک نہایت بلیغ اور وجدانی صنفِ ادب ہے۔ مجمل طور پر اس کا ذکر کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کے راگ، رنگ اور رس کو بدستور اہلِ ذوق کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ البتہ سالنامے کے اس باب کے متعلق اس قدر ہمیں ضرور کہنا ہے کہ اس دفعہ یہ پہلے سے بہت بڑھ چڑھ کر رہا ہے، اور تنوع کے لحاظ سے ایک ایسے چمن سے مشابہت رکھتا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوں اور ہر ایک کی خوشبو دوسرے سے الگ ہو۔

سالنامے کی ترتیب میں اس دفعہ تقدم وتاخر درجے کے لحاظ سے نہیں رہ سکا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بعض بہتر اور اہم تر مضامین دیر سے موصول ہوئے۔ اس کی ذمہ داری کچھ وقت پر اور کچھ خود مصنفین پر عاید ہوتی ہے۔ امید ہے کہ وہ ہمیں بری الذمہ سمجھیں گے۔

آخر میں ہم اپنے محترم اہلِ قلم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہیں کی اعانت اور انہیں کے علم و فضل نے اس بلند پایہ مجلّے کی تکمیل و تزئین کی۔ ہماری ناچیز کوششیں ان کی مساعی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

منور احمد

سیفو

سیفو کے عہد میں دنیا ابھی بالکل جوان تھی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک زمانے نے ہزاروں رنگ بدلے ہیں۔ نگاہ سے اوجھل بلکہ غالباً خیال سے بھی پرے اس کا مجلۂ ناز ہے۔

سیفو کی دنیا اور ہماری دنیا کے درمیان وقت کا جو وسیع عرصہ حائل ہے اسے سالوں کے پیمانے سے ناپ کر تخیل احساس کامل کی سرحد تک نہیں پہنچ سکتا، اسے دوروں میں بیان کرنا چاہئے، جیسے ہیئت دان ستاروں کے فاصلوں کا اظہار میلوں سے نہیں بلکہ نوری سالوں سے کرتے ہیں۔

ہمارے اور سیفو کے درمیان سلطنتِ رومہ اور حضرتِ مسیح کا عہد ہے اور واقعۂ صلیب سے پرے اثینہ کی تہذیب جس کا معراجِ کمال دنیا کا بلند ترین شہر تھا۔

سیفو کی چند ناتمام نظموں سے اندازہ لگا کر لوگ کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی شاعرِ تغزل تھی۔ لیکن اس کی آواز ایک غزل گو شاعر کی آواز سے بلند تر آواز ہے۔ یہ ایک اُس دنیا کی آواز ہے جو شادابی اور حسن کی دنیا تھی اور جو اب پھر کبھی پیدا نہیں ہوگی۔ اس آواز کی شیرینی میں اضافہ اس حقیقت نے کر دیا ہے کہ ہم تک یہ ایک بازگشت کی صورت میں پہنچ رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سیفو کا بمشکل کوئی شعر ایسا ہوگا جو براہِ راست ہم تک پہنچا ہو اور جو اُس کے حُسنِ ادا و خیال یا شوکتِ بیان یا دانش و حکمت کے کسی پرستار کی تحریر میں نقل ہو کر اہلِ بینش کی آنکھوں کا سرمہ نہ بنا ہو۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ سیفو کی تصانیف قسطنطنیہ یا روم کے عیسائیوں نے جلا دی تھیں۔ یہ بات قدیم عیسائیوں کی ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ بعید بھی معلوم نہیں ہوتی۔ بعض کہتے ہیں کہ بازنطینی شہنشاہوں نے انہیں جلایا تھا اور ان کی جگہ گریگوری نازین زن کی نظموں کی اشاعت کی تھی۔

لیکن تقدیر نے سیفو کی شاعری کو مٹانے کی جتنی بھی تدبیریں کیں وہ سب ناکام رہیں۔ سیفو شعری کی طرح ہمیشہ کے لئے تاباں و درخشاں ہے اور یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اگر اس کا کلام محفوظ و مصئون رہتا تو اُس صورت میں بھی اُس کی شیرینی اور اثر اندازی کا یہی حال ہوتا۔

سیفو کے کلام کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں جسے پڑھ کر پڑھنے والے کا دل ایک ابدائی قوسِ قزح میں لپٹ نہ گیا ہو۔ جس طرح دیوتاؤں نے انسانی پیکر کو لباس میں ملبوس کر کے آرزو کو تخیل عطا کیا ہے اسی طرح شاید تقدیر نے نہیں بلکہ کسی دیوتا ہی نے سیفو کے قلب کو ہم سے چھپا لیا ہے

سیفو کا حسن اس کے کلام کے ذرے ذرے میں روشن ہے اس کے نغموں کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں بھی ایک زندہ و پائندہ طاقت ہے جو ہر زمانے کی ادبیات میں تازہ روح پھونکتی رہتی ہے، اور یہ روح ایک رشتۂ تابندہ کی طرح تمام ادب میں جاری و ساری ہے۔

سیفو کے متفرق اشعار تو ہم ناظرینِ "ادبی دنیا" کی خدمت میں کسی اور وقت پیش کریں گے، یہاں ہم اس کی ایک طویل نظم کا ترجمہ درج کر رہے ہیں جس میں اس نے اپنے محبوب سے خطاب کیا ہے۔

سیفو فے آن سے

(۱)

فے آن اے حسین ترین اور میرے دل سے قریب ترین،
کیا تیری پیاری پیاری آنکھیں بھول سکتی ہیں یا مجھے اب تیری یاد ہی کے سہارے زندہ رہنا ہوگا۔

اے محبوب! جو مجھ سے دور ایک دوسرے ملک میں ہے۔
اب سیفو تجھے بلا رہی ہے۔ نغمے اُس کو بھول چکے ہیں اور اُس کا رباب ٹوٹ چکا ہے،
اور اُس کی خطاؤں نے جو آنسو پیدا کئے تھے
وہ اس کی آنکھوں کو اندھا کر رہے ہیں،
وہ آسمان کی طرف لگی ہوئی ہیں، لیکن فے آن کو نہیں دیکھتیں جو تمام نغمہ ہائے مسرت کا سرچشمہ ہے

میں جل رہی ہوں، اور جس طرح ہوا سے اٹھائے ہوئے تنکوں پر شعلہ تیزی سے لپکتا ہے
اسی طرح میری آرزو کی آگ مجھ پر لپک رہی ہے۔

اُنا کے شعلے میری آتشِ آرزو کے آگے کیا ہیں،
اے وہ جو اُنا کے قریب محوِ خرام ہے!
شاعری کی دیوی نے بھی اُسی طرح مجھ سے مُنہ پھیر لیا ہے جس طرح میں اس سے روگرداں ہوگئی،
سکون، ہاں سکون ہی اب پھر ہمیں گلے ملا سکتا ہے،
نیلا سمندر اپنی تنہائی میں اُسی طرح حسین ہے
مگر میں جب کبھی جاتی ہوں اُس کے ساحلوں سے درد لے کر واپس آتی ہوں۔
لزباس کی لڑکیاں اب میرے دل کو نہیں بھاتیں،
اُن کے لئے اب میری بے لوث محبت ختم ہو چکی،
اے میرے محبوب تیری محبت کے سامنے دوسروں کی محبت کو قیام نہیں،
اے مجھ سے دُور ساحلوں پر پھرنے والے سرد مہر محبوب،

آہ تو کتنا حسین ہے! اگر تو اپالو کے بھیس میں کھڑا ہو
تو اپالو تیرے پہلو میں ایک سائے کی طرح نظر آئے۔
اگر تو اپنے بالوں کو عشق پیچے کی بیلوں میں گوندھ لے
تو بیکس تیرے سامنے مرجھا جائے
اپالو نے سرِ تسلیم خم کیا اور بیکس شکست کھا گیا،
ایک کرنوں سے اور دوسرا دافنے کی آگ سے،
مگر میرے آگے وہ کیا ہیں،
میرا جادو خشکی و تری پر برابر چلتا ہے۔
میرے رباب کا نغمہ اُس دنیا سے بھی پرے گونجتا ہے جس میں فانی انسان رہتے ہیں،
اور دنیا کو اپنی آواز سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔

السیس کا نغمہ اولمپس سے ٹکراتا ہے،
اور اس کی موسیقی بے باکانہ و آزادانہ اپنا مامن ڈھونڈ لیتی ہے۔
میری آواز کا تعلق انسانوں سے ہے
دیکھو دور سے افروڈائٹ مجھ پر ہنس رہی ہے۔
کیا میں حسین نہیں ہوں؟
کیا خوش ذوقی نے سادگی کو حسن کی دنیا سے نکال دیا ہے۔
کیا میں بہت ادنیٰ ہوں!
تو پھر وہ عالی قدر کون ہے کہ جس کے لئے میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں۔

ہاں میرا رنگ ہیچ ہے ——
لیکن اُس شعلۂ جوالہ پرسیس کو بھی تو ایک سیہ فام نے بے راہ کر دیا تھا۔
کیا سفید کبوتر خوبصورت ہوتے ہیں یا سیاہ؟
کیا وہ یکساں نہیں ہوتے، خواہشات کے پیکر؟

اگر اپنے حُسنِ شاداب کے مقابلے میں تجھے کوئی حُسن متاثر نہیں کرسکتا
تو آہ پھر افسوس ہے میرے حال پر!
دنیا کی آگ تیری سرد مہری کو گرما نہیں سکتی،
اور آہ نے آن تو اپنا آپ محبوب ہے۔

تاہم ایک دفعہ آہ ایک دفعہ! دنیا جہان کو بھول کر
اس میری دنیا میں تو محصور ہو گیا تھا،
وہ راتیں آہ وہ راتیں! کاش یہ کرۂ زمین ابدی تاریکی میں لڑھکا دیا جائے ——
جذبات کی عشرتِ ابدی کی غیر فانی راتیں تھیں۔
میرے نغمے پرندوں کی طرح تیرے آس پاس چہچہاتے تھے
اور صرف میری آواز کی موسیقی تیرے کانوں میں گونجتی تھی۔
اپنے آتشیں بوسوں سے تو میرے الفاظ کو جلا ڈالتا تھا
اور میرے بوسے تجھے اپنی آرزو سے زیادہ شیریں معلوم ہوتے تھے۔
میری تنگ آغوشیاں تیرے جامِ مسرت کو لبریز کر دیتی تھیں
اور محبت کے آخری مرحلے میں میں تجھے بہشت میں پہنچا دیتی تھی۔
پھر جب ہم مست و مدہوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف کھنچتے تھے۔
اور پھر جب ہم تھک کر چور ہو جاتے تھے،

یہاں تک کہ محبت آدھی رہ جاتی تھی
دنیا اور زندگی آدھی رہ جاتی تھی گو بہشت حاصل ہو چکی تھی۔

اور اب اے سسلی کی لڑکیو ــــ اے میرے دل،
آہ میں کیوں سسلی سے اتنی دور پیدا ہوئی! ــــ
اے سسلی کی لڑکیو، میری بات توجہ سے سنو،
تم سحر کن تبسم سے اور بے وفائی سے ہوشیار رہنا،
اُن الفاظ سے ہوشیار رہنا جو کبھی میری ملکیت تھے،
عشق کے ثمروں سے اور غم کے بیجوں سے،
اے سسلی کے حسین سمندر پر بسنے والے مجبوب!
اب سیفو تجھے بلاتی ہے، اس کی تسکین خاطر کے لئے آ!

کیا اب بھی دولت مجھ بدبخت کا تعاقب کرے گی،
مصیبت انگیز بھیڑیے ساتھ سے کرتا عمر میرا تعاقب کرے گی؟
جب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں غم میرے حصے میں آ چکا تھا،
میرے ماں باپ کی خاک میرے آنسوؤں سے نمناک تھی۔
میرا بھائی تمام تحائف زندگی سے دست بردار ہو گیا
اُس ایک نا سزا شخص کے لئے جسے زر کہتے ہیں،
ایک غم کے بعد دوسرا غم آتا ہے، اور آج کے بدبخت دن
ایک دودھ پیتی بچی میری آغوش میں ہے۔
اے میری تقدیر! تو اور کیا کر سکتی ہے، تو اب کس کوشش میں ہے!
فے آن! ہائے وہ آخری ہستی جسے میں جانتی ہوں۔
اے میری تقدیر! جو اب ملول ہے اور کبھی ہنستی تھی۔
میری ارغوانی قبا پر سیاہ نقاب ڈال دے۔
میری زلفیں اب وہ زلفیں نہیں۔
نہ اب وہ ہوا کو مصر کے پھولوں کی خوشبو سے معطر کرتی ہیں۔
سونے کے وہ تار جو ان حسین لٹوں میں گندھے رہتے تھے۔
اب ان کو چھوڑ گئے ہیں تاکہ ہوا انہیں اڑائے۔
عشق کے سب ہنر میرے تھے جب وہ میرے پاس تھا،
وہ جس کے شب و روز اب سسلی میں گزرتے ہیں۔

فے آن! جب میں پیدا ہوئی تو تین عارفوں نے
مجھ پر نگاہ کرنے کے لئے افروڈائٹ کو بلایا
اُس نے میری طرف سے مڑ کر مجھے آواز دی۔
کہ تو آئے اور میری قسمت بنے اور میرے خوابوں اور میری بیداریوں کو بھرپور کرے۔
تو جس کے لئے آرورا کی نگاہ سیفالوس سے ہٹ جائے
یا جس پر ستھیارات کی مرمریں سراحی میں سے شراب انڈیل کر نیند طاری کر دے۔
اور انڈیمین کو تیری بھیڑوں کی پاسبانی سپرد کر دے۔

دیکھنا! لکھتے لکھتے میں رونے لگی
اور کچھ مجھے سجھائی نہیں دیتا، مگر عشق،
جس پر ٹوٹے ہوئے لفظوں اور آنسوؤں کا ایک نیم نقاب سا پڑا ہے۔

تم! تم! جو مجھے ایک بوسہ یا ایک آنسو یا ایک لفظ اپنی یادگار دیئے بغیر رخصت ہو گئے،
آہ، فریب تمہاری اس خاموشی سے کم بے رحمی کا حامل ہوتا،
تم جو کتنی ہی دفعہ جھوٹ موٹ مسکرا دیئے ہو گے کیا تمہارے پاس کہنے کے لئے ایک جھوٹا کلمہ نہیں تھا ــــ
تم جو اکثر جھوٹی کہانیاں کہا کرتے تھے ــــ
کیا رخصت کے وقت ایک بات بھی تمہاری زبان سے نکل نہ سکتی تھی،
تم کہتے "رخصت اے محبوب!" یا بس "رخصت!"

جب تم مجھ سے جدا ہوئے میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کوئی تحفہ نہ تھا،
اور جو تحفے تم نے مجھے دیئے تھے وہ خطائیں تھیں اور عیب،
آخری وقت میرے پاس تم سے کہنے کو کوئی بات نہ تھی،
مگر یہ کہ "زندگی کو نہ چھوڑو، مجھ کو نہ بھولو"
اور جب میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتی تھی کہ تم چلے گئے۔

تو غم سے میں پتھر کے مانند ہو جاتی تھی۔
خاموش، جیسے میں کبھی بولی ہی نہیں
بے حس و حرکت، کھوئی ہوئی، تنہا، بے بس۔
ایک آہ میرے منہ سے نہ نکلتی تھی اور ایک آنسو میری آنکھوں سے نہ ٹپکتا تھا
غم، بے حساب غم مجھے گنگ کر دیتا تھا۔
پھر میں اٹھتی تھی جیسے کوئی مر کر دوبارہ اٹھتا ہے۔
میری روح آگے بڑھتی تھی جیسے کوئی قتل کرنے کے لئے بڑھتا ہے،
میرے سارے جسم کو چھیدتی اور زخمی کرتی،
دیوتاؤں، لمحوں اور رسالوں پر لعنت بھیجتی،
کبھی طوفان بھرے بادلوں کی طرح جس میں بجلیاں چمکتی ہوں،
کبھی برس کر پھر آنسو بن جاتی ہوئی۔
رسوائی کا احساس دل میں لئے ہوئے جب میرا بھائی آتا ہے
اور میرے غم کی ہنسی اڑاتا ہوا میری بچی کی طرف حقارت کے ساتھ انگلی اٹھاتا ہے
تو دیوانگی مجھ پر اس طرح حملہ کرتی ہے جس طرح آگ تنکوں سے لپٹتی ہے۔
اور تم رسوا ہوتے ہو تو میں بھی رسوا ہوتی ہوں۔

آہ اگر رات کے وقت،
رات کے وقت میں تمہارے پاس ہوتی ہوں۔
خواب میں ہمارے جسم اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں جیسے شعلے سے شعلہ،
خواب میں پھر تمہاری باہیں میرے گرد حائل ہوتی ہیں،
میں تمہاری روح سے لذت اندوز ہوتی ہوں اور مجھے وہ مسرت حاصل ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

آہ، اگر رات کے بعد جب دن آتا ہے
تو میرا ویران اور اجاڑ دل مجھے مرغزار میں لے جاتا ہے
کہ میں اُن مقامات کو ڈھونڈوں جو میری کھوئی ہوئی عشرتوں کی یادگار ہیں۔
آہ بہار کی وہ اوٹ جواب کبھی ہماری پردہ داری نہ کرے گی۔

یہ ہے وہ گھاس جسے اعمال محبت میں ہم نے روندا تھا۔
جب ہمارے لب و اعضا ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے،
آج میں اس زمین کو چومتی ہوں۔
بوٹیاں مرجھا گئی ہیں اور پرندے خاموش ہیں
اور درخت خزاں سے بے برگ و بار ہو چکے ہیں۔
رات دن کو آلیتی ہے اور درختوں کے جھنڈ پر چھا جاتی ہے
صرف بلبل نالے کرنے کے لئے باقی رہ گئی ہے،
وہ اُس لے میں نوحے گاتی ہے جو غم کو پسند ہے
وہ ٹیبس کو بلاتی ہے اور میں فےآن کو۔

---

(۲)

ایک بہار ایسی بھی ہوتی ہے جس کے ٹھنڈے پانیوں میں سے ریت چاندی کی طرح سفید نظر آتی ہے، صاف جیسے ہوا میں سے نظر آئے۔
ایک بہار ایسی بھی ہوتی ہے جس کے آئینے پر
کنول چمن کے ایک خوبصورت کنج کی طرح کھلتا ہے۔
جب میں یہاں پڑی رو رہی تھی ایک روح میرے سامنے آ کھڑی ہوئی
جو پانی سے پیدا ہوئی تھی۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا:
"سیفو، محبت کی دیوانی، غم تیرا دیوانہ ہے،
سیفو، نیلے لیوکیڈین سمندر کے کنارے
ایک چٹان ہے، اور وہاں، غاروں کے اوپر،
جن کی گونج اپالو کے مندر تک پہنچتی ہے،
اور نیچے نیلے سمندر اور ٹکراتی ہوئی موجوں تک جاتی ہے
عشاق کو نیند آ جاتی ہے اور پھر وہ محبت کے خواب نہیں دیکھتے۔
ڈیوکیلین نے پراہ کی بے وفائی سے یہیں پناہ لی تھی،
سیفو! اٹھ اور جہاں پہاڑیوں کی بلندیاں سیدھی نیچے کو آتی ہیں

اپنا جسم، جو پیدا نہ ہوتا تو بہتر تھا،
لہروں کے حوالے کر دے ، نیلی نیلی پکارتی ہوئی موجوں کے حوالے"
میں اٹھتی ہوں، اور خاموشی سے روتی ہوئی روانہ ہو جاتی ہوں،
میں بہت ڈرتی ہوں، مگر ڈر سے زیادہ میری محبت ہے۔
اس محبت سے تو ویرانی اور خلا بہتر،
اور فے آن سے تو نیلی لہریں زیادہ شفیق اور رحمدل ہیں۔

اے ساز گار ہواؤ، آج میرا دھیان رکھنا،
اے عشق، اپنے پر مجھے مستعار دے کہ سمندر کو عبور کر سکوں
اور وہاں جہاں اے فیبس تیرا مندر ہے
میں اس تحریر کے ساتھ اپنا رباب ڈال دوں گی۔
"سیفو اپنا رباب فیبس کی نذر کرتی ہے،
تحفہ دیوتا کے لئے، آگ آگ کے لئے!"

---

(۳)

افسوس! افسوس ہے مجھ پر۔
مگر کیا مجھے فیبس کے آستانے پر جانا سزاوار ہے؟
او فے آن! فیبس میرے لئے فے آن سے کمتر ہے ــــ
کیا تو مجھے یوں پستی میں گرا دے گا
شکستہ و ریختہ، اور یہ ظالم چیلیں میرے سینے کے پرخچے
اڑائیں گی
اُس برباد شدہ سینے کے جس نے تجھ سے محبت کی ہے؟
آہ! وہ نغمہ، جسے موسیقی کی پریوں نے جنا
مجھے چھوڑ رہا ہے اور میرا رباب خاموش ہو گیا ہے،
وہ اب میری دوست نہیں ہیں،
اور اس تاریکی میں آسمانی آگ بھی خاموش ہو رہی ہے۔

رخصت اے لزباس کی لڑکیو، رخصت!
اب یہ کنج میرے نغموں کا جواب نہیں دیں گے، میری آواز سے
نہیں گونجیں گے
اب یہ ہاتھ عشق اور زندگی کا راگ سنانے کے لئے کبھی بیدار نہ
ہوں گے۔
یہ فے آن کی ملکیت ہیں،
اور وہ بھاگ گیا ہے۔
اے شگفتگی و شادابی واپس آ،
ایک دفعہ پھر میری روح کو پھر اُسی پہلی سی مسرت کے ساتھ
گانے دے،
ایک دفعہ پھر اُسی بھڑکتی ہوئی آگ سے اس دل کو لذت یاب کر
اے دیوتاؤ! کیا اب کوئی دعا قبول نہ ہوگی۔

کیا اُسے کوئی گیت واپس نہیں لا سکتا جو کھو گیا،
کیا اُسے کوئی آہ واپس نہیں لا سکتی جو کھو گیا،
میرا محبوب، میری زندگی، میری کل کائنات؟

آجا! آجا!
اپنا بادبان ہوا میں بلند کر دے،
عرصۂ بحر کو عبور کر اور وقت کو میرے لئے لوٹا کے لے آ،
اپرل ہوا کو تیرے لئے ساز گار کر دے گا۔
وہی سیدھی راہ ہے جس طرف افرو ڈائٹ رہنمائی کرتی
ہے۔
اُس افق سے اپنا سفید بادبان بلند کر
جہاں آسمان نفاق ڈالنے والے سیاہ سمندروں کو الگ
الگ کرتا ہے۔
اگر تیرا سفید بادبان بلند نہ ہوا تو وہ نیلی گہرائیاں
جن کو کبھی ڈیوکیلین نے اپنا مامن بنایا تھا، اسی طرح
تاریک رہیں گی،
اگر تیرا سفید بادبان بلند نہ ہوا تو یہ موجیں
یا مجھے موت دیں گی، یا فراموشی اگر میں زندہ رہی۔

منصور احمد

سیفو کے چند اشعار

مضمون ختم کر چکنے کے بعد بلا ارادہ سیفو کا کچھ کلام اردو اشعار میں منتقل ہوگیا ہے۔ اب اسے کسی آئندہ اشاعت کے لئے ملتوی کرنا موزوں معلوم نہیں ہوتا اس لئے یہیں ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پیشین گوئی

ہماری زندگی کے بعد شاید کوئی فصل بہار آئے گی ایسی
اٹھے گی اک صدائے بازگشت اور ہمارے گیت اک دنیا سنے گی

دوست

اے دوست نگاہ اُٹھاؤ آنکھوں میں آنکھیں ڈالو
اس راہ سے دل میں اترو تن من کو حسین بنا دو

خوبی

خوب ہے جو حسیں ہوا بُت ہوا نازنیں ہوا
جو نہ حسیں ہوا مگر خوب ہوا حسیں ہوا

بندِ عشق

اب مجھ کو گرفتار محبت نے کیا ہے سر تا بہ قدم خوف سے میں کانپ گئی ہوں
تلخی ہے تو شیریں ہے ستم ہے تو مروت اس راحتِ جاں سوز کو میں بھانپ گئی ہوں

ایک زمانہ

میں نے بھی ایک زمانے میں تم سے الفت کی ہے
ایک زمانے میں جس کو اب مدت ہی گزری ہے

طُوفان

جب عشق کے آثار نظر آتے ہیں   اس طرح یہ جسم و روح گھبراتے ہیں
طوفان میں جس طرح ہوا کے اندر   اشجار کہُستان کے تھرّاتے ہیں

شام

بچے ماؤں کی گودوں میں   بھیڑیں اپنے گلوں میں
بکری بکری والے کے پاس   لال شفق میں پرند اداس
حورِ سحر نے بکھیری ہے   زرّیں ہاتھوں سے جو جو شے
تو اُس پر چھائی ہے اے شام
جادو ہے تیرا کتنا عام

نیند

کالی کالی آنکھوں والی   نیند رات کی بیٹی

منصور احمد

رُوحِ استبداد کا فرمان

ہاں اے مرے ذی ہوش و فسوں کار سپوتو
جاگے ہوئے محکوم دماغوں کو سُلا دو

تہذیب کے جادو سے ہر اک پیر و جواں کو
اپنی روشِ عام کا نقّال بنا دو

چلتی ہیں جن افکار سے اقوام کی نبضیں
ذہنوں میں اُن افکار کی بنیاد ہلا دو

جو قفل سکھاتا ہے زبانوں کو خموشی
وہ قفلِ خطابات زبانوں پہ لگا دو

حاصل ہو جو پبلک کے اداروں کی صدارت
چندہ تو نہ دو صرف ترقی کی دعا دو

اوروں کو جو روزی سے لگانے پہ مصر ہے
چپ کرنے کی خاطر اُسے روزی سے لگا دو

جو عدل و مساوات کا ہو خاص منادی
چپکے سے اُسے عدل کی کرسی پہ بٹھا دو

اس خاص رعایت پہ بھی وہ سرکش و باغی
بیٹھے نہ جو کرسی پہ تو سر تن سے اُڑا دو

پہلے تو ہر اک رہرو آزاد کو ٹوکو
مانے نہ اگر بات تو زنجیر پنہا دو

جل جاتا ہے جس آگ سے ظالم کا کلیجہ
اُس آگ کو مظلوم کے سینے میں گھسا دو

اور آگ اگر بجھ نہ سکے آب رہا سے
جلتے ہوئے سینوں کو تہِ خاک چھپا دو

محکوم کو دو فکر و تامل کی نہ فرصت ہر فرد کو بے ہودہ مشاغل میں لگا دو

سچائی سے تابل نہ سکیں بزم کے ارکان جو جھوٹ پہ مبنی ہے وہ تاریخ پڑھا دو

گھر آئیں جو بادل کی طرح تند عناصر آپس ہی میں ان تند عناصر کو لڑا دو

دنیا میں پنپنے کے جو آئین سکھائے کچھ دے کے اُسے دین کے دھندے میں لگا دو

جس مُرغ کی پرواز ہے تا عرشِ معلّٰے اس مرغ کو شہباز کے چنگل میں پھنسا دو

اوہام کے بندوں کے یہی دو تو ہیں دلال پنڈت کو جو زنّار تو ملّا کو عبا دو

تحقیق سے تابندہ ہے جس ذہن کا میدان اُس ذہن میں اک وہم کی دیوار اٹھا دو

بہتے ہوئے آنسو جو کریں رحم کی درخواست پگھلے ہوئے الفاظ کا انبار لگا دو

چھیڑے کوئی کمزور اگر نغمۂ طاقت اُس شخص کو تلوار کی جھنکار سنا دو

روٹی کا جو طالب ہو اُسے بھوک سے مارو جو بھوک کا شاکی ہو اُسے زہر کھلا دو

پانی کا طلبگار ہو جس کھیت کا دہقان اُس کھیت میں پانی کے عوض آگ لگا دو

سینے میں کھٹکتی ہے مرے جوش کی ہر سانس
اس شاعرِ گستاخ کو سولی پہ چڑھا دو

جوشؔ

پنجاب کا اوّلیں اردو ماہنامہ

پچھلے سال اردو سبھا کی سرپرستی میں راقم نے قدیم اردو اخبارات سے متعلق لکچروں کا ایک سلسلہ ختم کیا تھا جو مجموعی صورت میں اورنگ آباد کے مشہور رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۳۵ء میں "اب سے آدمی صدی پہلے کے اردو اخبار" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ آج میں پنجاب کے اوّلیں ماہ نامہ سے متعلق اپنی تحقیقات ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں میں نے احتیاط کی نظر سے اوپر کے عنوان میں اردو کا لفظ بڑھا دیا ہے ورنہ میری تلاش میں اس وقت تک پنجاب سے کسی اور دیسی زبان کا (دیسی کا لفظ بھی احتیاطاً استعمال کیا گیا ہے) رسالہ نہیں نکلا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور میں آکر مطبع کوہ نور اور اخبار "کوہ نور" جاری کیا۔ اردو کے اسی ہندو بزرگ نے جنوری ۱۸۵۶ء سے پنجاب میں پہلا ماہنامہ یعنی رسالہ جاری کیا۔ اس کا نام خورشید پنجاب تھا۔ اس کی تقطیع $\frac{21}{4}$×17 تھی۔ ضخامت عموماً پچاس صفحے ہوا کرتی تھی۔ ہر صفحہ دو کالموں پر منقسم تھا۔ سالانہ قیمت چار روپے اور ڈاک کا محصول بارہ آنے تھا۔ اُس زمانے میں رسالہ کا لفظ کم ضخامت کی کتابوں کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا جیسے "رسالہ عبدالواسع ہانسوی" صاحب خورشید پنجاب اپنے رسالے کو کتاب کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ خورشید پنجاب کی سب سے پہلی اشاعت کی پشت پر یہ عبارت درج ہے:۔

"واضح ہو کہ درصورت روانہ کرنے اس کتاب کے بہ صیغہ بیرنگ شائقین کو فی کتاب ۲ر دینے پڑتے اس واسطے بہ صیغہ پوسپیڈ روانہ کی جاتی ہے . . ."

اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں ڈاک خانے کا ضابطہ ایسا تھا کہ اس رسالے کی روانگی ایک آنہ کے ٹکٹ سے ہوتی تھی۔

راقم کے کتب خانے میں اس رسالے کی پہلی جلد موجود ہے۔ یہ رسالہ کب بند ہوا اس کا حال معلوم نہیں۔ اس واقفیت کے بعد اب اس رسالے کے مندرجات ملاحظہ ہوں۔

اردو رسالوں کے بارے میں پنجاب ہندوستان کے ہر صوبے سے بازی لے گیا ہے۔ اس امر واقعہ سے سب کو اقرار ہے اس لئے یہ معلوم کرنا کہ پنجاب کے اولیں ماہ نامے میں کیا کچھ ہوا کرتا تھا صحافت کے محقق اور خواندہ پبلک کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جلد ا نمبر ا کے مندرجات ملاحظہ ہوں:۔

"تمہید
خیالات متعلق زبان اردو
اخلاق
اقوال حکما
لطائف وظرائف
حال طریقۂ تعلیم
تواریخ
خیالات نسبت کرۂ ہوائی
احکام سرکلر دائرکٹ بہادر گورنمنٹ مغربی"

اب کہیں کہیں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں

تمہید میں منشی ہرسکھ رائے خورشید پنجاب کی وجہ اشاعت اس طرح لکھتے ہیں:۔

"واجب یہ ہے کہ سب سے پہلے سبب طلوع اور وجہ سیوع اس خورشید پنجاب کا ظاہر کیا جائے جس سے دقیقہ سنجان حقیقت آگاہ کو واضح ہو کہ شیوع اس خورشید سے کیا مقصود ہے۔ سو گزارش کیا جاتا ہے کہ غرض اصلی اجرائے اس نسخۂ دلپذیر سے یہ ہے کہ پنجاب میں جو زبان اردو کا ربط ابھی اچھی طرح نہیں ہوا ہے اور بسبب اس کے کہ فی زماننا زبان اردو کو بدرجہ غایت اقتدار ہے دفاتر سرکاری میں بھی اُسی کا ہی رواج ہے شعر و سخن میں بھی اُس کو لطیف سمجھتے ہیں۔ بول چال میں بھی اُس کی فصاحت پر توجہ فرماتے ہیں اردو دفاتر سرکاری کے عملگان بعض بعض ایسے ہیں کہ تنگی معاش کے باعث مکتب سے اٹھتے ہی تلاش نوکری میں مصروف

ہو گئے اور نوکری بہم پہنچا کر قبیل آئندہ سے محروم ہو رہے ہیں . . . سو اس میں اکثر ایسے مضامین درج ہوا کریں گے کہ جن سے زبان اردو کی ماہیت بوجہ احسن واضح ہو گی اور اس زبان کے شائقوں کو نفع خاطر خواہ با آئین ہیں حاصل ہو گا اور پنجاب کے شرفا طالب علموں کو اس سے مدد کافی ملے گی اور عملگان کچہریوں سرکاری کو اس کے مطالعہ سے ترقی علوم و فنون و ہم کار سررشتہ ہو گی۔ آئین اور قانون سے واقفیت بہم پہنچے گی اور ان کی طبیعت کو علوم کی طرف توجہ ہو گی یعنی علاوہ کار سرکار کے دے یہ بھی جانیں گے کہ جغرافیہ تواریخ ہیئت ہندسہ حساب وغیرہ کیا شے ہوتی ہے اور اس سے کیا نفع حاصل ہوتا ہے . . . "

آگے چل کر ان موضوعوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو رسالے میں ہوا کریں گے۔ تفصیل اور شرح کو طوالت کے خوف سے چھوڑ کر محض وہ عنوانات نیچے دیے جاتے ہیں :۔

طریقۂ تعلیم۔ تہذیب اخلاق۔ تہذیب رسم و عادات نیک۔ بحث علمی بحث قانونی۔ علم طبیعی۔ تجارت۔ عمارات و انہار۔ ریاست (یعنی دیسی ریاستیں) جغرافیہ تواریخ۔ لطائف و ظرائف۔ طلسمات۔ اور اور جو جو مراتب مفید عام ہوں گے بیان کئے جاویں گے۔"

پنڈت راجارام صاحب طوطہ منشی مطبع کوہ نور لاہور نے ۲۹ شعروں کی ایک فارسی نظم میں اس مصرعہ سے خورشید پنجاب کے شیوع کی تاریخ نکالی ہے۔

جہاں افروز شد خورشید پنجاب

۱۸۵۶ء

اور میاں مختار شاہ صاحب تاجر پشمینہ جنت نظیر خطۂ کشمیر نے بھی اس تاریخی موقع پر ایک قطعۂ تاریخ لکھا۔ جو مختصر ہونے کی وجہ سے درج کیا جاتا ہے :۔

حبذا طبع بیاضی کز صفائے صفحہ اش
مہر انور چوں سہا شد محو در بین السطور
از زلال معنیٔ پاکیزہ نہر جد ولش
آب حیواں چشمۂ فیض است و ہم دریائے نور
شد بجا خورشید پنجابش لقب چوں یافتند
نکتہ سنجاں مطلعش لاہور و مطبع کوہ نور

از پے تاریخ طبعش انجمن آراستند
یک بیک اجرام علوی در فلک افگندہ شور
نور سال ہجری از طبع عطارد جوش زد
جلوۂ خورشید پنجاب آمدہ۔ گفت از سرور

سنہ ۱۲۷۲ھ

پاکشیدہ زہرہ رقصاں گفت از سمت دگر
جلوہ گر خورشید پنجاب از صفائے کوہ نور

سنہ ۱۹۱۳ بکرمی

با سر بہجت میان جمع آمد ماہ و گفت
جلوہ گر خورشید پنجاب از سواد کوہ نور

سنہ ۱۸۵۶ء

جو ہندو مسلمان اردو ہندی کے قضیہ کو ملی رنگ میں ڈوب دینا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ انکشاف سبق آموز ہے کہ پنجاب میں اولین اخبار اور رسالہ نکالنے والا ایک ہندو تھا اور تمام دنیا میں پہلا اردو رسالہ نکالنے والا بھی ایک ہندو تھا۔ اس وقت کے بوڑھے ان بزرگوں کی نبیرگی کی حیثیت سے آگے نہیں گئے ہیں اور یہ ملک کا قانون ہے کہ ایک مکسوبہ جائیداد تیسری پشت میں جا کر جدی جائداد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ قلیت اور اکثریت کے سراب سے بچ کر یہ امر ثابت ہے کہ اردو کی صحافت کے بارے میں ہندوؤں کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی ایک موروثی جائداد سے متعلق مشترکہ خاندان کے ایک فرد کی۔ حال کے افراتفری کے زمانے میں کبھی کبھی کوئی مجھ سے کہہ جاتا ہے کہ ہندو ملی جذبات کے زیر اثر اردو کو چھوڑ کر ہندی کو لے رہے ہیں۔ یہ اطلاع کہاں تک واقعی ہے اس کی جانچ کا میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ بہرحال اردو کے رسالوں اور خاص کر ادبی رسالوں کا اور ان میں زمانے کا جہاں تک تعلق ہے اس خبر کی تصدیق نہیں ہوتی۔ منشی پریم چند کا معاملہ اس قضیہ سے جدا ہے۔ بہرحال اس بارے میں خوف کا موقع مجھے تو نظر نہیں آتا۔ یہ سب مانتے ہیں کہ ہندو دوراندیشی اور معاملہ فہمی میں کسی سے کم نہیں۔ پھر اس غیر مطلوبہ ترک کا امکان کیا معنی۔ خیر بات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ بہرحال اردو صحافت اور خاص کر ماہانہ صحافت میں دہلی اور پنجاب کا جہاں تک تعلق ہے ہندو اس فن لطیف کے بانی اور پیشرو ہیں وہ روایت پرست اور قدامت پرست ہیں یہ ان کو اور سب کو یاد رکھنا چاہیئے۔ اب خورشید پنجاب کی کتھا سنئے۔

سر سید، حالی، اور سر اقبال یہ معلوم کرکے نہایت خوش اور مسرور ہوں گے کہ پنجاب کے اولیں ماہنامہ کا خیر مقدم کرنے والے اُن کے ہم خطّہ اور ہم فرقہ تھے اب دیکھیں اس رسالے میں ہے کیا؟

پنجاب میں انگریزی تسلّط کو چھ سات ہی برس ہوئے تھے اس کا اور اس سے ماقبل عزل و نصب کا ذکر کرکے لکھتے ہیں :-

"غرضکہ آسان تر طریق تعلیم ایک قوم کا دوسری قوم سے یہ ہے کہ دونوں قوم آپس میں ملیں۔ اکثر یہ نتیجہ لڑائی سے حاصل ہوتا ہے۔ ملاحظہ تاریخ سے واضح ہے کہ جب خطہ یونان پر رومیہ کبریٰ کی بادشاہت ہوئی تو رومی جہل سے نکل کر یونان کی علم و ہنر سے بہرہ یاب ہوئے۔ اسی طرح جب تک روم کی سلطنت کو فروغ رہا تو جو جو ملک اُس میں شامل ہوتے گئے اُن میں کچھ نہ کچھ ترقی ہوتی رہی۔"

طریقۂ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے پرانے مکتب اور نئے مدرسے کے موازنہ میں لکھتے ہیں :-

"فارسی طالب علم نے جب معلم کو دیکھا تو اوس کو ملک الموت سمجھا۔ انگریزی طالب علم کو جہاں استاد نظر پڑا وہ خوش ہوگیا اور ادب اور محبت سے پیش آیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں جبر ہوتا ہے یہاں شوق۔ وہاں اس ترکیب سے تعلیم دی جاتی ہے کہ جس میں لڑکے کی طبیعت گھبراوے اور اوس کو نفرت ہو اور سمجھ میں خاک نہ آوے۔ یہاں اس ڈھنگ سے تربیت ہوتی ہے کہ لڑکے کا دل ایسا خوش ہو کہ اوس کو کھیل سے بھی اچھا جانے . . ."

غالباً منشی ہرسکھ رائے کا مطمحِ نظر یہ ہوگا کہ نئی حکومت نے جو نئے طرز کے مدرسے جاری کئے تھے وہ عام پسند اور ہر دلعزیز ہوں یا خود حکومت نئے سکولوں کو اس طرز پر چلانا چاہتی تھی کہ پرانے مکتب خود ہی مدھم پڑ جائیں یہ کچھ ہی ہو بعد میں وہ کیفیت نہ رہی جس کا راگ اقتباس صدر میں گایا گیا ہے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج کے دو استادوں کا ذکر اس ضمن میں بے جا نہ ہوگا یعنی پروفیسر محمد حسین آزاد اور پروفیسر چیارام۔ اتفاق سے یہ دونوں بزرگ دہلی کے تھے لیکن دونوں کے کلاس کے برتاؤ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آزاد مرحوم کو جو محبت اپنے شاگردوں سے اور ان کو اپنے شفیق استاد سے تھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات مشہور تھی کہ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج لاہور کے بزرگ پرنسپل ہنسراج کو کالج کے حدود میں کسی نے مسکراتے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں سمجھئے زمانہ بدلتا رہتا ہے۔

تواریخ کے عنوان کے تحت "صوبہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد" کے تاریخی کوائف درج ہیں۔ یہ تذکرہ منشی ہرسکھ رائے کے لئے بالطبع تھا کیونکہ ان کا نکاس مضافات دہلی سے ہوا۔

"خیالات نسبت کرۂ ہوائی" ایک سائنٹیفک موضوع ہے۔ اس وقت کی علمی واقفیت کے لحاظ سے یہ مضمون قابل توصیف ہے۔ لکھتے ہیں :-

"یہ ہوا مخزن اور مجمع بے انتہا خوبیوں کی ہے یعنی اول تو ہر یک جسم انسان اوسط اندام کے اوپر تخمیناً ساڑھے سات سو من کا بوجھ ہوا کا پڑتا ہے۔ مگر کیا اُس کی قدرت ہے کہ انسان کو ایک رائی کے برابر بھی یہ بوجھ معلوم نہیں پڑتا . . . اگر خلا ممکن ہووے تو انسان سے ایک قدم بھی نہ سرکا جاوے۔ اور ایک لحہ میں رشتہ حیات کا ٹوٹ جاوے . . ."

اس وقت حکومت نئی تھی۔ صوبہ کے قوانین اور ضابطے مرتب نہ ہوئے تھے۔ انگریزی اور ہندوستانی افسر اور اکثر عمال اضلاع آئین سے (صوبہ مغربی و شمالی جسے آج کل یو۔ پی کہتے ہیں) آئے تھے۔ وہ وہیں کا ضابطہ ساتھ لائے۔ اسی وجہ سے وہاں کے سرکلر اور قوانین وغیرہ کا اعلان خورشید پنجاب میں واقفیت عامہ کے لئے ہوا کرتا تھا۔

اس کے ساتھ **خورشید پنجاب** کا پہلا نمبر یعنی بابت جنوری ۱۸۵۶ء ختم ہوتا ہے۔

فروری ۱۸۵۶ء کے مندرجات حسب ذیل ہیں :- (۱) نوعِ انسان میں شریف تر کون ہے؟ مرد یا عورت؟ (۲) سراج العلم (۳) کیفیت ڈاک بجلی (۴) تتمہ خیالات متعلق زبان اردو (۵) اخلاق (۶) تاریخ (۷) تتمہ خیالات متعلق کرۂ ہوائی (۸) پیداوار ملک (۹) سوالات قانونی (۱۰) احکام و سرکلر وایکٹ مجریہ گورنمنٹ مغربی۔

آج کل کہ صوبہ صوبہ میں زنانی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں اور قریباً ہر شہر میں کوئی نہ کوئی عورتوں کی انجمن یا استری سماج قائم ہے۔ عورتیں اپنے حقوق اور مرتبے سے متعلق مردوں سے مساوات کا مطالبہ پیش کرتی ہیں۔ حفظِ تولید کا موضوع ہر شخص کی زبان پر ہے۔ جن جماعتوں میں طلاق کا رواج نہیں ان میں طلاق کے اجرا کا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ عام بحثیں ہوتی ہیں کہ ایک قوم کا مستقبل عورت کے ہاتھ میں ہے۔ القصہ اس ماحول میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اب سے اسّی برس پہلے عورت ذات کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات تھے اور اس بارے میں پنجاب کا اولیں رسالہ کیا رائے رکھتا ہے۔ موضوع رکھا ہے "نوعِ انسان میں شریف تر

کون ہے ؛ مرد یا عورت ؟

عورت کے متعلق بعض رائیں لکھ کر کہتے ہیں :۔

لیکن دلائل کے تولنے پر بہتر یہ بات معلوم ہوئی کہ اس معاملے میں رائے ندی جا دے تو بہتر ہوتا کہ نہ تو مردوں کو احتمال اپنی کمتری کے اظہار کا ہوگا اور نہ احتمال مستورات کے خفا کرنے کا ہوگا اور یہ بات مشہور ہے کہ مستورات کا خفا کر دینا آسان ہے اور اُن کا منانا مشکل . . ."

پھر کہتے ہیں :۔

کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو کہ مرد کی نسبت عورت میں فائق درجہ پر نہیں پائی جاتی ہے۔ جسم کی خوبیوں میں کہ جن میں سب سے اچھی شئے حُسن ہے مرد بالکل ہار گئے ہیں اور نفس ناطق کی خوبیوں میں بھی مرد عورتوں پر کچھ فوق نہیں لی جاسکتے . . . عورتیں مردوں کی نسبت عموماً نیک کام زیادہ کرتی ہیں . . . یہ بات مانی ہوئی ہے کہ مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ رحیم اور وفادار اور زیادہ خیر کی طرف متوجہ ہیں اور پارسائی اُن میں بہ مرتبہ مردوں سے زیادہ ہے . . ."

خاتمہ اس مضمون کا اس طرح ہوتا ہے :۔

". . . پس مقتضائے عقل یہ ہے کہ حتی الوسع عورت کی قدر اور فکر آسائش کرنی چاہئے اور جو شخص اس طرح پر عمل کرے گا یقین ہے کہ وہ خود بھی عورت کی طرف سے خوش رہے گا . . ."

سراج العلم والے مضمون کو انہوں نے دو شقوں یعنی (۱) علوم و (۲) فنون پر تقسیم کیا ہے۔ علوم میں علم معانی۔ علم بیان۔ علم بدیع۔ علم عروض و قوافی۔ علم طریقت۔ علم طب۔ علم حساب۔ علم ہیئت۔ علم جر ثقیل۔ علم حکمت علم طبیعات۔ علم منطق۔ علم مناظرہ۔ علم کیمیا وغیرہ کو جگہ دی ہے اور فنون میں "فن بلاغت۔ فن ادیباں و اتالیقاں۔ فن کاشتکاران۔ فن طبع فن ارباب رزم۔ فن مصوراں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ آج کل کے پڑھنے والے کو اس تقسیم کے بہت سے اجزا سے اختلاف ہوگا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ اُس وقت یہ اور اس قسم کی باتیں فارسی میں ہوا کرتی تھیں اردو ان سے محروم تھی۔

"کیفیت ڈاک بجلی" یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ تار برقی یا ٹیلیگراف جسے آج کل "قاہرہ کے تتبع میں تلغراف لکھنا بعض اہل صحافت کا مذہب ہو گیا ہے۔ اُس زمانے میں نئی کیا اعجوبہ چیز تھی۔ اس لئے صاحب خورشید پنجاب نے اس موضوع کو اپنے دوسرے نمبر کے لئے انتخاب کیا۔ چونکہ اس میں ایک بجلی کے تار کے ذریعے خبر آتی ہے اس لئے اسے ڈاک بجلی کہا گیا اس مضمون میں تار برقی کے آلات کی کئی تصویریں اور نقشے بھی دیئے ہیں۔

بجلی کی قوت اور خواص کہربائیہ کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

"اگر چہ یہ کسی کو اب تک نہیں معلوم ہوا ہے کہ مادہ بجلی کا کیا شے ہے اور اُس کی اصل ماہیت کیا ہے۔ لیکن حکماء یونان اور فرانس اور انگلس نے اُس کی بعض بعض قوتیں اور خاصیتیں اور مادہ پیدا کرنے کی راہیں دریافت کر کے اُس سے بہت بہت سے مفید مطلب نکالے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ کہربائی یعنی قوتِ بجلی ایک سیال نہایت لطیف جمیع اقسام میں بمقادیر مختلفہ پھیلی ہوئی ہے اور اُس کے چند وصف مخصوص ہیں جن کا آگے بیان آوے گا۔ اس کہربائی سے حوادث عجیبہ مہتم بالشان ہوتے ہیں اور اُس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اول ہی اول وجود کہربائی کا کسی جسم میں سوا جسم کہربا کے نہیں پایا گیا۔ چنانچہ یہ نام کہربائی بعینہٖ ترجمہ (الیکٹریسیتی) انگریزی لغت کا ہے کیونکہ یہ لفظ الیکٹرون سے جس کو کہربا کہتے ہیں بنایا گیا ہے . . ."

بجلی کے پوزیٹو اور نگیٹو کو ایجابی اور سلبی لکھا ہے اور اس سے نفس معنی اخذ کر کے موجبہ اور سالبہ منطق کی دو اصطلاحوں کا کس خوبی سے اس ضمن میں استعمال کیا ہے۔ میں نہیں خیال کرسکتا کہ آج کل کے سائنس کی کتابوں کے ترجمہ کرنے والے شعور ادبی کا اس سے بہتر ثبوت پیش کرسکتے ہیں۔ اوپر کے اقتباس میں ایک مرکب مہتم بالشان استعمال ہوا ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ اختراع علی گڑھ کے تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں کا ہے۔ لیکن یہاں اس کا استعمال اس سے کہیں پہلے ہو چکا ہے جبکہ کوئل سے علی گڑھ بنا

ایک اور سائنٹفک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"ہیرے کی جس کی جہان میں اتنی قدر او قیمت ہے اور کوئلے کی دونوں کی اصل ایک ہے۔ پانی کے اجزا بکثرت ایسے ہیں کہ جو جلنے کے لائق ہیں۔ جتنے تیزاب ہیں ان کی ماہیت اور کرہ ہوائی کی ماہیت ایک ہے اور ایک خاص تیزاب بالکل اُسی اجزا سے بنا ہوا ہے کہ جن سے وہ ہوا بنی ہے کہ جس کے سبب سے تنفس کا سلسلہ جاری ہے اور وہ تیزاب ایسا ہے کہ اگر سخت سے سخت فولاد پر لگا یا جا دے تو اس کو کھا جاتا ہے"

یہ وہی تیزاب ہے جس کے ایک سلنڈر نے پھٹ کر

حال ہی میں مغلپورہ (لاہور) کے ریلوے ورکشاپ میں کئی جانیں لیں اور بہتوں کو زخمی کیا۔ انگریزی لفظ آکسیجن کے استعمال سے بچ کر نفس مطلب کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ اس زمانے میں سائنس کی اتنی اہم واقفیت اور اس سہل اسلوب اور سلیس زبان میں اس کی شرح اور اشاعت داد سے مستغنی ہے۔ ہم کو اس سے سبق لینا چاہئیے۔

پیداوار ملک کی ذیل میں پھٹکڑی۔ اس کی تیاری کی ترکیب۔ اس کے خواص وغیرہ کا مفصل اور باتصویر ذکر ہے

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ پنجاب میں منشی ہرسکھ رائے کے اس اختراع نے اور صوبوں سے جہاں اردو کا رواج تھا معقول خراج تحسین وصول کیا۔ آگرہ کالج کے مدرس دوم "حضرت مولوی ابوالحسن صاحب" نے یہ خط منشی صاحب موصوف کو لکھا جو خورشید پنجاب مورخہ۔ ماہ مارچ ۱۸۵۶ء (جلد ۱، نمبر ۳) سے نقل کیا جاتا ہے:۔

"صاحب مہتمم کوہ نور سلامت۔ دریں لا کہ رسالہ خورشید پنجاب باہتمام والا حسن ترتیب یافتہ درو ست عزیزے بود از دیگرفتم وسراپائش را بہ نظر اجمال دیدم۔ بے تکلف رسالہ نیکو ترکیب گرفتہ۔ والا ہمتی را آفریں باد کہ باتحمل اینہمہ مشاق کم ارزی را بر خود آسان کردہ اند چناں می نماید کہ در کمتر زمانے خطۂ ہند را مثل خورشید فرا گیرد . . ."

"الراقم ابوالحسن۔ آگرہ کالج ۲۴ر فروری ۱۸۵۶ء"

اس رسالہ کے مارچ ۱۸۵۶ء کے نمبر کے مندرجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ر فروری ۱۸۵۶ء کو آگرہ میں رائے جگل کشور صاحب وکیل صدر کی کوٹھی میں ایک جلسہ ہوا جس میں شہر کے تعلیم یافتہ اور ذی رسوخ اصحاب کی بڑی تعداد شریک تھی۔ اس جلسہ میں قاضی صفدر علی صاحب نے حاضرین کو تجربہ "تار مخبر کہربائی" کا دکھلایا۔ ایک ٹکڑا قاضی صاحب کی تقریر کا یہاں دیا جاتا ہے جو اس امر پر روشنی ڈالے گا کہ قاضی صاحب کو اہم علمی موضوع کی سہل اور سلیس زبان میں تشریح پر منشی ہرسکھ رائے صاحب سے کم قدرت حاصل نہ تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"صاحبو۔ علم دو قسم کے ہیں اول وہ جس کو انسان بدون مشاہدہ اور استعمال اجسام کے حاصل کرسکتا ہے اوس کو ریاضی کہتے ہیں دوسرے وہ جس کا جاننا بغیر تجربے کے نہیں ہوسکتا کیونکہ فرض کرو ایک شخص پیدا ہوا اور اُس نے کچھ بھی گرم و سرد زمانہ کا نہیں دیکھا فقط ایک اندھیرے گھر میں رہتا ہے تو وہ اپنی عقل سے ریاضی کے اصول دریافت کرسکتا ہے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں مگر چونکہ اس نے اجساموں کے تجربے نہیں کئے اس واسطے وہ نہیں جان سکتا کہ اگر پتھر کو پانی میں ڈالیں تو اس سے کیا نتیجہ ہوگا اور اگر نمک ڈالیں تو وہ گھلے گا یا نہیں وہ علم جو تجربے پر منحصر ہے اس کی قسموں میں سے ایک قسم علم طبیعی ہے . . ."

اب اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ اب سے اسی برس پیشتر کی انشا اور املا کی نسبت جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ راقم اپنے بسیط مضمون میں جو قدیم اخبارات سے متعلق ہے اول طبقہ کے اخبارات کی ذیل میں لکھ چکا ہے۔ جس کی اشاعت کا حوالہ آگے اسی مضمون میں آچکا ہے۔ یہاں سرسری طور پر یہ کہنا ہے کہ انشا کا اسلوب وہی پرانا تھا۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان واؤ عطف اکثر استعمال ہوتا تھا جو باوجود ہدایت اور تنبیہہ کے بعد میں استعمال ہوتا رہا اور آج کل بھی کم و بیش مستعمل ہے اور جس کی نسبت راقم کی یہ رائے ہے کہ یہ قید اٹھا دینی چاہئیے۔ وَیا وآہنگی کے حروف ربط میں سے ہے۔ یہ اور پھر یہ بات کہ اس سے کسی کا کلام یا احتیاط سے کئے اکثر و بیشتر کا کلام نہیں بچا اس قید کے اڑا دینے کی دلیل ساطع ہے۔ گڈمڈ ترکیبیں جیسے "عملگان کچہریوں سرکاری کو"۔ "ترقی علوم و فنون وہم (بھی) کا رسرشتہ ہوگی"۔ "وے" جمع "وہ"۔ اور "یے" جمع "یہ"۔ "یہ ہوا مخزن اور مجمع ہے بے انتہا خوبیوں کی"۔ "کا" کے بدلے۔ اور "مادہ بجلی" وغیرہ جیسے کلمے اور فقرے اس ابتدائی ماہنامہ کے مضامین میں اکثر پائے گئے۔ املا کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یائے معروف ۹۹ فی صدی موقعوں پر گول لکھی گئی ہے یہ طریق امتیازی پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو نے بھی اپنی زندگی کے بہت برس بعد اختیار کیا۔ قواعد اردو جو ۱۸۶۷ء میں بک ڈپو کے سرکاری مطبع سے شائع ہوئی۔ اس میں ی کا یہ امتیاز غائب ہے۔ اس لئے یہ واقعہ مسلّم ہے کہ املا میں یائے معروف کو امتیازی شکل دینا یعنی گول لکھنا منشی ہرسکھ رائے کی جدت طرازی ہے جس کو اس وقت کل اردو دنیا اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس رسالہ کے نمبروں میں املا سے متعلق ایک بات یہ دیکھی گئی کہ دوچشمی ھ اس کے صفحات سے بالکل غائب ہے۔ استاد ذوق کی ہائے کو ہائے دوچشمی سے کیا نکھنے[1]۔ ہائے مخلوط التلفظ بھی اس سے محروم رہی۔ پڑھنا کو پڑہنا

---

[1] استاد ذوق کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے۔

ہائے رے حسرت دیدار مری ہائے کو بھی ؛ لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

لڑائی کو لڑآئی ۔ ہر ایک کے بدلے فارسی کا ہر یک ۔ ہو کی جگہہ ہوے وغیرہ کا استعمال اور اشارہ بعید میں واؤ کی ایزادی مثلاً اوس ۔ ان یہ سب کچھ اُس وقت کے رواج اور دستور کے مطابق ہے جو آج کل اجنبی معلوم ہوگا۔

آخر میں یہ دکھانا پبلک کی واقفیت کے لئے مفید ہوگا کہ پنجاب کے ۵۰۰ موں یعنی رسالوں میں اردو رسالوں کی کیا حیثیت ہے۔ جنوری ۱۹۳۶ء کے اعداد سے پایا جاتا ہے کہ پنجاب میں ۱۹۳۵ء کے اختتام پر ماہانہ رسالوں کی مجموعی تعداد ۳۴۵ تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے :-

انگریزی - ۵۵

ورنیکلر (اردو - ہندی - گورمکھی) ۲۵۷

دو زبانوں کے	۱۴	۳۳
تین زبانوں کے	۱۲	
تین سے زیادہ زبانوں کے	۷	

اس ۳۳ و ۵۵ سے ہمیں سروکار نہیں۔ ورنیکلر کے ۲۵۷ ماہناموں میں اردو کے رسالوں کی تعداد ۱۵۳ دکھائی گئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰۴ دوسری ورنیکلر زبانوں کے رسالوں کے مقابلے میں ۱۵۳ ماہنامے اردو کے شائع ہوتے ہیں۔ ان اعداد کی بنا پر جو مستند ہیں پنجاب میں اردو رسالوں کی تعداد باقی ہر قسم کی زبانوں کے رسالوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اردو ماہناموں کی یہ تعدادی اور نیز استعدادی ترقی اسی برس کی مدت میں ہوئی اور جب یہ واقعہ نظر میں رہے کہ اولیں ماہنامہ اردو کا (خورشید پنجاب) تھا تو ماہانہ صحافت کے بارے میں اردو کا یہ کارنامہ مہتم بالشان حیثیت رکھتا ہے اور جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں۔ کہ بلالحاظ زبان کے پنجاب کا پہلا اخبار بھی اردو تھا یعنی کوہ نور جو ۱۸۵۰ء کے شروع سے جاری ہوا تو پنجاب میں اردو کی وقعت قدامت اور نیز عہد حاضر کے اعتبار سے سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہنے کی دلیری کرے کہ اردو پنجاب کے مدارس اور دفاتر سے رخصت کردی جائے یا یہ کہ اردو ایک خاص حصۂ آبادی سے تعلق رکھتی ہے تو ایسے موقع پر ایک ہندی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ ہے ڈھٹائی۔

کیفی

ترانۂ عشق

جلوۂ گل بلبل کو بہت ہے — شمع کو گریۂ شام
یاد بہاری گل کو بہت ہے — مجھ کو تیرا نام

بجلی چمکے کالی گھٹا میں — جام میں آتش سرد
چمکے راکھ جوگی کی جٹا میں — مجھ میں تیرا درد

بل نہ چھٹے کالے بالوں سے — اور نَے سے فریاد
پل بھر میں نہ چھٹے کالوں سے — مجھ سے تیری یاد

شاخ پہ شعلۂ گل کی لپک ہو — چرخ پہ انجم و ماہ
دنیا پر سورج کی چمک ہو — مجھ پہ تیری نگاہ

فراق

(گورکھپوری)

رباعیات

(۱)

نظارہ بیدار بھی محمل ٹھہرا
ہے ایک سے بڑھ کے ایک پردہ ٹھہرا
افسانہ شاہد حقیقت ہے ایک سا باطل
کہتا ہوں تو نکلے ہے اور تماشا ٹھہرا

(۲)

فطرت کچھ اور ہے خدا ہے کچھ اور
بالغ نظروں کا منتہا ہے کچھ اور
جب تک کہ دم سے ہے دل کی دنیا روشن
اس جاتی جوت کے سوا ہے کچھ اور

(۳)

ترسی ہوئی آنکھوں کا تقاضا ہے تو کیا؟
پھولی ہوئی آنکھوں کی تمنا ہے تو کیا؟
اترے گا کبھی نہ جن پیکر کا عکس
روشن ہے تو کیا آئینہ اندھا ہے تو کیا؟

(۴)

پڑھتا ہے کوئی شعر کوئی سنتا ہے
منہ تکتا ہے کوئی کوئی سر دھنتا ہے
ارباب نگاہ رولتے ہیں موتی
اندھا نقاد سنگریزے چنتا ہے

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

مرزا غالب کی فارسی شاعری

مرزا غالب علیہ الرحمۃ کو عموماً نہ اُن کے ہمعصروں نے پہچانا نہ اُن کے بعد کے لوگوں نے۔ اس زمانے میں اُن کے ادا شناس کم اور منکرین کمال بہت زیادہ تھے آج اُن کے مداح بہ کثرت اور مخالف کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے بے شمار مداحوں میں بہت تھوڑے اصحاب کو حقیقی مداح سمجھتے۔ ان کی زندگی میں اُن کی مخالفت محض عوام کی کورانہ ذہنیت اور مقلدانہ روش کا نتیجہ تھی۔ آج اُن کی مدح و ستائش کا عنصر غالب بھی رواج اور فیشن کی حد سے زیادہ نہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے کلام میں عروج و قبول کی استعداد نہیں۔ سب کچھ ہے اور اس سے بہت بڑھ کر ہے جتنی ہم اس وقت تصور کر سکتے ہیں۔ میرا مقصودِ سخن یہ ہے کہ ان کو بنظر تحقیق دیکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور بچشم تقلید نظارہ کرنے والے بے شمار ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے بعض بالغ نظر بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ مرزا کی فارسی سے ان کی اردو کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ہمارے ادارات ادبی و طبقات علمی کے رجحان سے بھی یہی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مرزا خود فرماتے ہیں۔

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از اردو کہ آں مجموعۂ بے رنگ منست

ور تیرہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

کلیات فارسی کے آخر میں لکھتے ہیں۔

گر ذوق سخن بدہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ہم کو بغیر کسی معقول دلیل اور بیّن وجہ کے مرزا کی اپنی رائے کو ٹھکرانے کا حق ہرگز نہیں پہنچتا۔ وہی بے نظیر دماغ جس کی کاوش کا نتیجہ یہ دونوں مجموعے ہیں بقائمی ہوش و حواس ایک کو "نقشہائے رنگ رنگ" کا خطاب دیتا ہے اور دوسرے کو "مجموعۂ بے رنگ" کہہ کر پکارتا ہے۔ ہم کون ہیں جو اس کا انکار کریں۔

میرے نزدیک ہمارے اہل الرائے کی لغزش کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُن کے سامنے مجموعۂ اردو روزِ اول ہی سے بصورت انتخاب پیش ہوا۔ اگر نسخۂ حمیدیہ سے سابقہ پڑا ہوتا تو یقیناً ہمارے دماغوں اور ہمارے لٹریچر میں غالب کی تصویر موجودہ غالب سے بالکل الگ خد و خال کی ہوتی۔ یا اگر اُن کے کلام فارسی سے بھی ہم بہ شکل انتخاب روشناس کرائے جاتے تو ہماری رائے موجودہ روش سے بالکل مغائر ہوتی۔

جہاں تک کلام غالب سے میری تحقیق و مطالعہ کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی کا رتبہ کئی وجوہ سے اردو سے بلند تر ہے۔ فارسی میں مرزا کی فطرت عمیق کے تمام گوشے روشن نظر آتے ہیں۔ ان کی استعداد بلند کی تمام تجلیاں آشکار ہو جاتی ہیں توحید، تصوف، اخلاق، فلسفہ، رندی، مذہب، مدح، ہجو، مرثیہ، عشق اور مناظر فطرت وغیرہ تمام مضامین کو جدت و ندرت اور شدت و قدرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہر صنف کلام مثنوی، قطعہ، قصیدہ، ترجیع بند، ترکیب بند، غزل، رباعی وغیرہ میں مشاقی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس تکمیل و تنوّع کے ساتھ اردو میں نہیں ضرورت تھی کہ ان میں سے ہر عنوان پر الگ الگ مستقل مضمون متعدد اصحابِ ذوق سے لکھوائے جاتے تاکہ دنیائے اردو کو مرزا کی فارسیت کے "نقشہائے رنگ رنگ" کے اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ مرزا کی زبان میں خسرو اور سعدی کی حلاوت نہیں۔ اُن کے شعر میں حافظ کی رندی و آزادگی نہیں۔ اُن کی غزل میں نظیری کا سوز اور روحانیت نہیں۔ اُن کے قصائد میں ظہیر کی عذوبت اور قاآنی کی طوفان انگیز روانی نہیں۔ ان کی مثنوی میں نظامی کا فلسفہ اور فردوسی کی سادگی نہیں۔ ان کی رباعی میں خیام کی سرمستی اور سحابی کا تصوف نہیں۔ لیکن یہ سب صفات ایک خاص حد تک موجود ہونے کے علاوہ یقیناً ایک ایسی چیز بھی اُن کی ہر صنف سخن میں موجود ہے جو ان کو ممتاز اور الگ کر دیتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مرزا اسی دنیا میں رہتے تھے ان کی تخلیق انہی عناصر سے ہوئی تھی۔ جن سے اُن کے معاصرین اور متقدمین کی، ان کو انہی حالات و واقعات سے سابقہ پڑتا تھا جن کے جادۂ حیات کے ہر راہ رو کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اُن کے پاس اظہار خیال کا ذریعہ وہی الفاظ و محاورات تھے جو زید و عمرو کی متاع نطق ہو سکتے ہیں۔ مگر باوجود ان تمام ہم رنگیوں اور یکسانیوں کے وہ ہر بات میں انوکھے، ممتاز اور ایک حد تک نرالے تھے۔ وہ ناظر کائنات سے تمام عملیات اور معمولی انعامات کے علاوہ کوئی خاص چیز لے کر کارگاہ ہستی میں وارد ہوئے تھے یعنی ان کی دکان ادب میں اسلوب بیان کی بداعت اور نفس مضمون کا عمق ایسی چیزیں ہیں جن سے سخن کا تمام مینا بازار ایک بڑی حد تک خالی نظر آتا ہے۔ وہ ہر بات کو خواہ وہ نثر ہو یا نظم، بیان صحت ہو یا تقریر مرض، دوست کا ذکر ہو یا دشمن کا قصہ انوکھے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ نہیں چاہتے کہ کسی امر میں بھی اسلاف و اقران کی بنائی ہوئی راہوں پر چلیں۔ ان کا بس چلے تو کسی نئے ستارے میں اپنی دنیا جا بسائیں جو انسان کے سانس سے ملوث نہ ہو چکا ہو۔ اگر اُن کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس پر متقدمین سے ہم رنگ ہونے کا شبہ ہو سکے تو وہ اس شبہ کو بھی برداشت نہیں کرتے اور اپنے سامعین کو صاف الفاظ میں وہ بات کہہ دیتے ہیں جس سے اُن کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاع من ز نہاں خانۂ ازل بردہ ست

اور یہ ان کی صاحب نظری کی دلیل ہے۔

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اب میں مختلف عنوانات کے تحت میں ان کا کلام پیش کرتا ہوں میں مخصوص اور معتقدانہ طریق انتخاب سے ان کی تصویر کا صرف ایک ہی جاذب توجہ رخ نہیں دکھانا چاہتا بلکہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے اس بیان میں غالب سے صحیح تعارف کا حق ادا کرنے کی امکانی کوشش کروں۔

توحید و تصوف

سب سے پہلے مضمون کے شرف و تقدس کے لحاظ سے توحید و تصوف کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ مضمون جتنا عام اور معمولی ہے خواص کے لئے اتنا ہی اہم و مشکل بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مرزا عملی حیثیت سے نہ رومی تھے نہ سنائی انہوں نے جو کچھ کہا اپنی ورائی اور طباعی سے کہا اگر مجھے صرف اسی ایک بات پر اظہار خیال کی اجازت ہوتی تو میں بتاتا کہ غالب کے فارسی کلام میں تصوف اپنی پوری شان اور اپنے تمام مدارج و مقاصد کے ساتھ کس طرح جلوہ گر ہے۔

مولانا رومی، حکیم سنائی، شیخ عطار وغیرہ شعرائے صوفیا اپنے واردات و حالات کو شعر میں ادا کرتے تھے۔ شعر ان کا مقصود نہ تھا۔ صرف آلۂ اظہار مافی الضمیر یا کیفیات باطن کا دھندلا سا عکس کہا جا سکتا ہے لیکن شعرائے ایک گروہ کثیر نے بجائے عرفان حقیقت کے صرف شعر کو اپنا مطمح نظر بنایا اور محض تصوف کی چاشنی سے شعر کو لذیذ بنانا چاہا۔ مرزا ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک تیسری راہ کے سالک تھے۔ وہ تو نگر سنائی سے بیزار تھے اور اس کو "باد خوانی" سمجھتے تھے۔ غزل سرائی سے پشیمان تھے اور یہ اُن کے نزدیک "ہوا پرستی" سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ مضامین عالیہ کے بیان میں ان کے سمائے فطرت سے ایک ابر مطیر صرف گہرباری ہو جاتا تھا۔ وہ مقامات تصوف کی مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ انہوں نے کسی شیخ وقت کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ وہ ترک و تفرید، مراقبہ و مجاہدہ، ستر و تجلی، صحو و سکر اور قبض و بسط وغیرہ حالات و مقامات کی لذت و الم سے ایک مسترشد طریقت کی طرح آگاہ نہیں تھے۔ لیکن چاہتے تھے کہ لذائذ روحانی کے سمندر میں ڈوب جائیں فقر و فنا کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری کر لیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

کو فنا تا ہمہ آلائش پندار برد؟ | از صور جلوہ وار آئینہ زنگار برد

اسی غزل کا مقطع ہے۔

میرند دم ز فنا غالب و تسکینش نیست | بو کہ توفیق ز گفتار بہ کردار برد

قصیدہ اول عرفی کے تتبع میں توحید کے لئے وقف کیا ہے۔ فرماتے ہیں

اے زد ہم غیر غوغا در جہاں انداختہ | گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون و دروں ز خویشتن پروانگیے | پردۂ بہم پیش درمیاں انداختہ

اس کے بعد عالم کثرت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی | مردہ را از خویش دریا بر کراں انداختہ

پھر مقام توحید میں عرفا و فلاسفہ کی نارسائی کا ذکر کرتے ہیں۔

رفتہ ہر کس تا قد مگاہے وز آنجا خویش را | پا بہ پایہ از فراز نردباں انداختہ

سید الطائفہ جنید نے کہا تھا "وہ حد و انتہا جس پر پہنچ کر توحید کے متعلق عقلمندوں کی عقلیں منتہی ہوتی ہیں حیرت ہے"۔ اویم کہتے ہیں "توحید یہ ہے

کہ بشریت کے آثار محو ہو جائیں اور الوہیت کا تجرد بھی مٹ جائے"۔ یوسف بن حسین کے نزدیک "جو شخص توحید کے سمندروں میں آپڑا وہ اوقات کے رہگزر میں ہرگز رتا ہوا زیادہ سے زیادہ تشنہ کام ہوتا جائے گا" یہی باتیں ہیں جو توحید و تجرید کے عنوان سے مرزا کے باطن فکر سے سرزد ہوئیں۔

اے بخلاو ملاخوئے تو ہنگامہ زا
با ہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا

آب نہ بخشی بہ دور خون سکندر ہدر
جاں نہ پذیری بہیچ، نقد خضر ناروا

بزم ترا شمع و گل خستگئ بوتراب
ساز ترا زیر و بم، واقعۂ کربلا

گرمی نبض کسے کز تبدل داشت
سوختہ در مغز خاک ریشۂ دار و گیا

ذات باری اپنی کنہ و حقیقت کے لحاظ سے عقول و افہام کی حدود سے بالاتر ہے لیکن اپنے مظاہر صفات اور تجلیات خلق و صنع کی حیثیت سے یکسر ھوالظاہر کا مصداق ہے۔

بر رُخ چوں ماہ برقع از کتاں انداختہ
در نہفتن پردہ از راز نہاں انداختہ

ہر ذرہ مظہر تجلی خورشید ہے۔ ہر قطرہ رہنمائے حقیقت بحر ہے۔

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

اس شعر میں "بادیہ را بہ رہبری" پر غور فرمائیے کتنی نادر سچائی ہے۔

آفتاب عالم سرگشتگی ہائے خودیم
میرسد بوئے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

بعض جگہہ کوئی اپنا دنیوی قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے مسائل وجود و نمود اشیاء وغیرہ اچھل پڑتے ہیں۔ سفر کلکتہ میں قتیل کے مداحوں سے بہت دکھ پہنچا۔ اس کا ذکر کرتے ہیں اور تمہید میں درس تصوف شروع ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں

ساقیٔ بزم آگہی روزے
رادقے ریخت در پیالہ من

سرور میں آکر ساقی سے خطاب کرتے ہیں۔

گفتم اے محرم سرائے سرور
از ادب دور نیست پرسیدن

اول از دعوی وجود بگو
گفت کفر است در طریقت من

گفتم آخر نمود اشیا چیست!
گفت ہے ہے نمی تواں گفتن!

گفتم ایں جب جاہ دنیا چیست!
گفت دام فریب اہرمن

پھر مختلف بلاد و امصار کے متعلق سوال و جواب ہوتے ہیں آخر میں پوچھتے ہیں۔

گفتم اکنوں مرا چہ زیبد، گفت
آستیں بر دو عالم افشاندن

یہی بات اپنے مخصوص رنگ میں دوسری جگہہ کہتے ہیں۔

اگر بدل نخلد ہر چہ از نظر گزرد
خوشا روانی عمرے کہ در سفر گزرد

سبحان اللہ اس سے آگے تمنا کا دروازہ بند ہے۔

ایک اور جگہہ ساقی میکدہ ہوش سے یوں ہم کلام ہوتے ہیں۔

گفتمش چیست جہاں گفت سراپردۂ راز
گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست

گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوئے برمز
گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

انسان کے لئے ادراکِ حقیقت محال ہے لیکن جزوی ادراک سے مایوس ہو بیٹھنا بھی نازیبا ہے۔ کتنی لطیف بات اور سچی رہنمائی ہے۔

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال
گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست

جامی کی مشہور غزل ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ
پس بچشمِ عاشقاں آں را تماشا کردۂ

اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں لکھتے ہیں اور کتنے پیارے انداز سے لکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قطرہ سمندر کو اپنی گود میں لے لینا چاہتا ہے برگ گل گلشن کی تمام رنگینی و تعطر کو سمیٹ لینے کے لئے بے قرار ہے۔ انسان کی ہیچ میرز روح اور محدود و مجروح دانش اس کو پا لینا چاہتی ہے جس کو نہیں جانتی کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے چیخنا چاہتی ہے اور چیخ نہیں سکتی۔ تڑپنے کے لئے بے تاب ہے لیکن قوی جواب دے دیتے ہیں۔

چوں زیا نہالال و جا نہا پر زغوغا کردۂ
بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ

اے جمال حقیقت اے شور افگن قلوب!

گر نہ مشتاق عرض دستگاہِ حسن خویش
جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردۂ

خوشا نصیب ان کے جن کے لئے آج گوشہ نقاب سرکایا گیا۔ مسرت ہماں کو جو زیارت فردا کی امید پر شاہد تسکین سے ہمکنار ہیں۔

صد کشادآں را کہ ہم امروز رخ بنمودۂ
مژدہ باد آں را کہ محوِ ذوق فردا کردۂ

میں اور تو اے گل!

ذرہ را رُو شناس صد بیاباں گفتۂ
قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردۂ

پائے تحقیق کی آخری منزل یہ ہے کہ

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

سالکان راہ کے اوصاف و مقامات کا بیان سنئے۔ محبوب کی

طلب میں ایذا پسندی۔

رہرواں چوں گہرِ آبلہ پا بینند   پائے را پایہ فرا تر ز ثریا بینند
نستوہند اگر ہمرہ مجنوں گردند   نخروشند اگر محمل لیلےٰ بینند

فراست خاصۂ اولیا ہے جو دوام مراقبہ ، اتباع اوامر اور اجتناب نواہی سے حاصل ہوتا ہے۔

ہرچہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند   ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند
دور بینانِ ازل کوری چشم بدبیں   ہم دریں جا نگرند آنچہ درانجا بینند
راز زیں دیدہ دراں جو کہ ازندیذ وری   نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی   جادہ چوں نبض تپاں در رگِ صحرا بینند

ہونے والے واقعات اُن کی ضمیر منیر پر پہلے ہی منکشف ہو جاتے ہیں۔

شررے راکہ بناگاہ بدر خواہد جست   زخمہ کردار بتارِ رگ خارا بینند
قطرہ راکہ ہر آئینہ گہر خواہد بست   صورت آبلہ بر چہرہ دریا بینند

اپنی فطرتِ صالح کے سبب نظامِ کائنات میں کوئی نقص نہیں دیکھتے۔

راستی از رقم صفحہ ہستی خوانند   نقش کج بر ورق شہپر عنقا بینند

آیہ کریمہ ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر ھل تری من فطور" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

تصورِ حضور وشہودِ ذات کی ابقائی کیفیت میں مستہلک رہتے ہیں۔

ہرچہ در سونتواں یافت ز ہر سو یابند   ہرچہ در جا نتواں دید بہر جا بینند

ننگ ونام کی الجھنیں ، کفر واسلام کے امتیازات ، دیر وحرم کی تفریقات عارف کے دل پر موثر نہیں ہوتیں۔

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود   پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود
بااین کہ عاشقم سخن از ننگ ونام چیست   در امرِ خاص حجت دستور عام چیست
مقصود ما ز دیر وحرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

عشق کے سامنے عوارض واعتبارات کی کوئی ہستی نہیں۔

خشک وتر سوزی ایں شعلہ تماشا دارد   عشق یک رنگ کن بندہ وآزاد آمد

کائنات عالم کی کل کا ہر پرزہ ایک ہی منتظم جل ذکرہٗ کے اشارہ ابرو پر گردش کر رہا ہے۔

نشاط معنویاں از شراب خانہ تست   فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست
مراچہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست   نہ تیز گامی تو سن ز تازیانۂ تست

بجام وآئنہ حرف سکندر وجم چیست   کہ ہرچہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست
ہم از احاطۂ تست ایں کہ در جہاں مارا   قدم بہ بتکدہ وسر بر آستانۂ تست

جب بات یہ ہے تو شکوہ روزگار وشکایت فلک سے کیا حاصل

از دستِ دیگریست سفید وسیاہ ما   باروز وشب بعربدہ بودن چہ احتیاج

اس فقیہ کے حسب مراد نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

از تست اگر ساختہ پر داختہ ما   کفر ست نبود مطلب بے ساختہ ما

سالک جس مقام کو تھک کر اپنی منزل سمجھ لیتا ہے۔ ذرا سستانے اور ہوش میں آنے کے بعد دیکھتا ہے کہ وہیں سے ایک آغاز جدید رونما ہو جاتا ہے۔

من سراز پا نشناسم برہِ سعی وسپہر   ہردم انجام مرا جلوۂ آغاز دہد

اخلاق | اخلاق کے متعلق کلام غالب سے ایک بڑا ذخیرہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مرزا کا مرتبہ ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے۔ ان کی تعلیمِ اخلاق واعظانہ نہیں فلسفیانہ ہے۔ ہر عمل کی علت بیان کرتے ہیں۔ نتائج سے روشناس کراتے ہیں اور سامع کو متاثر کرنے میں عموماً کامیاب رہتے ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے لاتزکو انفسکم واللہ اعلم بمن اتقی یعنی اپنی بڑائی نہ بیان کرتے پھرو۔ حاضر وموجود خدا کو اہل تقویٰ کا خوب علم ہے یہ نکتہ اساس اخلاق ہے اگر کسی شخص کی گفتار وکردار کا مقصود ریا ونمائش جلب دنیا اور تسمین نفس ہے تو اس کی روح یقیناً مریض ہے۔ اس کا کامل مطلق ذات پر صحیح ایمان نہیں۔ اس کے نزدیک نیک عمل کوئی بالذات چیز نہیں بلکہ حطام دنیا کے حصول کا ذریعہ ہے اگر اس کو یہ چیزیں نٹشے کے گمراہ کن فلسفے کے مطابق کسی ناروا ذریعے سے حاصل ہو سکیں تو وہ اس کے ارتکاب سے باز نہیں رہے گا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

آں کن کہ در نگاہ کساں محتشم شوی   بر خویش ہم ز خویش فزودن چہ احتیاج

قرآن مجید ایک اور نکتہ بیان فرماتا ہے لم تقولون مالا تفعلون۔

تم ایسی بات منہ سے کیوں نکالتے ہو جس سے تمہارا عمل مطابقت نہیں رکھتا۔ اس آیت میں کتنا مضبوط کیریکٹر طلب کیا گیا ہے۔ مرزا فرماتے ہیں۔

باصرد گفتم نشان اہل معنی باز گوے   گفت گفتار یکہ باکردار پیوندش بود

شیراز کے معلم کا ارشاد ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا   دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام   کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

مرزا نے اسی محبوب تخیل کو ایک نئے لباس میں پیش کیا ہے۔

آنکہ خواہد در صفِ مردان بقائے نامِ خویش   خون دشمن سرخ تر از خونِ فرزندش بود

درد دل کے متعلق کتنی بلند بات کہہ دی ہے۔

بے غم ہنادِ مردِ گرامی نمی شود   زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

سرلبے کہ رخشد بویرانہ خوشتر   ز حشمے کہ پیرایہ نم ندارد

اولادِ آدم کے اعمال ایک مربوط سلسلہ علت و معلول کی طرح متولد ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے مصائب و محاسن اسلاف کی تقلید و پیروی کا نتیجہ ہیں اور اخلاف کی زشتی و خوبی کا باعث۔

نقش پے رفتگاں جادہ بود در جہاں   ہر کہ رود بایدش پاس قدم داشتن

درس قناعت و خودداری سنئے۔

کعز ست کفر در پے روزی شتافتن   ننگ است ننگ در غم دنیا گریستن

مرزا کی خودداری مشہور ہے۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم   گز بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

تواضع نکم ز بے تواضع غالب   بسایۂ خم تیغش خمیدہ نم بنگر

مذہب | مرزا کے مذہب کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ وہ اسلام کے کس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے ان کے کلام سے صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ باوجود شاعرانہ بذلہ سنجیوں کے نفس مذہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ محققین ادیان و مذہب کے نزدیک بالعموم تین باتیں مسلّم ہیں۔ توحید، عمل صالح، اور یقین پاداش۔ توحید کے متعلق فرماتے ہیں۔

غالب آزادہ موحد کیشم   برپاکیٔ خویشتن گواہِ خویشم

شرک اور عمل غیر صالح سے اعتراض۔

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم   پرستارِ خورشید و آزر نیم

نکشتم کسے را با ہر پیشنی   نبردم زکس مایہ در رہزنی

اسی مثنوی کے آخری اشعار ایمان جزا کے متعلق ملاحظہ ہوں۔

بدیں دیدہ درد زامید و بیم   نگیرم بدا انساں کہ عرش عظیم

شود از تو سیلاب را چہ رہ جوئے   تو بخشی بداں گریہ ام آبروئے

پھر اعتراف خطا کرتے ہیں اور جناب رسول و رسالت پر ایمان رکھنے کا ذکر کر کے امید نجات کرتے ہیں۔

کہ البتہ ایں رندِ ناپارسا   کج اندیشہ گبر مسلماں نما

پرستارِ فرخندہ منشور تست   ہوادارِ فرزانہ دستور تست

بہ بندِ امید استواری ز تست   بہ غالب خطِ رستگاری ز تست

فلسفہ | یوں تو مرزا کی کوئی بات فلسفہ سے خالی نہیں۔ تاہم ایسے اشعار جن پر خالص فلسفہ کا اطلاق ہو سکے کم نہیں ہیں۔ یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

انسان کو اگر کسی تکلیف آئندہ کا پہلے سے علم ہو جائے تو وہ اسی وقت سے مبتلائے تکلیف ہو جاتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ ع مترس از بلائے کہ شب درمیان است۔ بلکہ وہ درمیانی شب تمام استقبال بلا کی نذر ہو کر خود ایک مہیب بلا بن جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست   قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

حظ و الم کا احساس و اظہار ناگزیر ہے۔ فکر بشری اس تاثر کے لئے مجبور ہے۔ آئینے میں قبول عکس کی استعداد فطری ہے۔ جیسے وہ خود موجد عکس نہیں ویسے ہی ہم حظ و الم کے موجد نہیں۔

گر بہر و گرکیں ہمہ از دوست قبول است   اندیشہ جز آئینہ تصویر نما نیست

عالم مادی کا ہر لحظہ تغیر سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہ نیز خرام گردات، یہ متحرک ذراتِ فضا، یہ متغیر افکار و اعمال اور یہ ابدان میں گردش خون اسی حقیقت کی طرف رہنما ہیں۔

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید ست   نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

اجزائے کائنات بنی آدم کی خدمت میں مصروف عمل ہیں ارشاد وحی ہے۔

سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض۔ یہی نوع تکرم و فضل ہے۔ لقد کرمنا بنی ادم۔ فضلناکم علے کثیر ممن خلقنا۔ ارتقائے مادہ کا آخری مقام آدم ہے۔ اس مضمون کو مرزا یوں ادا کرتے ہیں

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست   بگرد نقطۂ ما دور ہفت پرکار ست

فطرت نے انسان میں جو بلند استعدادیں ودیعت کی ہیں۔ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا حال کا انسان جو کچھ کر رہا ہے ماضی کا انسان اس کو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی طرح آیندہ پر قیاس کر لو۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را   قیامت می دمد از پردہ خاکے کہ انساں شد

اس لحاظ سے مرتبۂ انسان کتنا عظیم ہو جاتا ہے۔

جزوے از عالم از ہمہ عالم بیشیم   ہمچو موئے کہ بتاں از میاں برخیزد

کسی بزرگ کا ایسا ہی شعر ہے۔

در جہانی و از جہاں بیشی   ہمچو معنی کہ در کلام بود

لیکن یہ سب معالی و مراتب عطیہ الٰہی ہیں۔ ہم اپنی ذات میں

کچھ نہیں اگر ادھر سے تائید نہ حاصل ہوتی رہے۔

شوخیٔ اندیشہ خویش است سراپائے ما
تار و پود ہستی ما پیچ و تابے بیش نیست

عشق و محبت ایک طوفان انگیز، ہیجان آفریں اور زلزلہ افگن فطری جذبہ ہے۔ علمائے نباتات نے باہم قریب رہنے والے پودوں کو جدا رکھ کر تجربہ کیا ہے۔ ان کی نشو و نما کم ہو جاتی ہے۔ ان کی تازگی و جمال پر افسردگی چھانے لگتی ہے۔ حیوانات میں طبعاً تجاذب و تواصل کی استعداد نباتات سے بدرجہا بڑھ کر ہے وہ اپنے ابنائے جنس بلکہ غیر جنس تک کی نفرت و انس میں پوری طرح امتیاز کرتے ہیں۔ مانوس اشخاص و اشیا کے قرب و بعد سے بدیہی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ جب نبات و حیوان میں روح کی خفتگی و نیم بیداری اور احساس کے سکون و عدم بلوغ کی حالت میں یہ شراب مرد افگن اتنا تند اثر رکھتی ہے تو فطرت کی مکمل صنعت گری، نشو و نمائے حواس کے مظہر اتم حضرت انسان کے بطون قلب و دماغ میں گھس کر یہ جذبہ جو بھی قیامت برپا کرے کم ہے۔ بالخصوص شعرا کی لطافت حس و رقت وجدان عام بنی آدم سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ یہ لوگ اس سے بدرجہ غایت متاثر و متکیف ہوتے ہیں اور شعرا میں مرزا غالب جن کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے خاتم الشعرا کہا جا سکتا ہے۔ جن کی نگاہ حسن کی باریک ترین اداؤں تک پہنچتی تھی جو حسن کو خود حسن سے بہت زیادہ سمجھنے کے لئے طبعاً مجبور تھے۔ کیوں نہ اپنی تمام متاع ہستی لئے ہوئے اس سیلاب بے پناہ میں بہ جاتے۔ وہ عرفی کی طرح معشوق بھی تھے اور عاشق بھی۔ وہ حسن کی زبان تھے اور عشق کے ترجمان۔ وہ عشق سے زیادہ نفسیات حسن کو بیان کرتے ہیں۔ اس خصوص میں ان کے دماغ نے وہ نکتے اخذ کئے جن کو پیشروؤں کی زبان و قلم نے مس نہیں کیا تھا لیکن ان کے وقوع کی عمومیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اعلیٰ شعر کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ اس کے مضمون کو کوئی نظم نہ کر سکے اور جب کوئی قادر الکلام نظم کر دے تو سب اُسے اپنے خیال کی ترجمانی سمجھنے لگیں۔

مرزا کی شبہائے شباب جنون عشق کے بادہ تند سے سرشار تھیں۔ وہ اس شعلۂ آتشیں کی حدت سے برسوں سلگا کئے۔ ان کے اس نوع کے اشعار آج بھی ایک ہنگامہ زا خروش عشق و تلاطم جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔ اُن کی عمیق تمناؤں اور لازوال تشنگی کو کبھی سیرابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ معشوق میں فنا ہو جانے کے لئے بے تاب تھے یا اس کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے تھے۔ اُن کی حیاتِ معاشقہ کی گہرائیوں تک کون پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے بساطِ سخن پر جو پھول بکھیرے۔ اُن سے استشمام کرنا فنون مکتبہ کے بڑے بڑے فضلا کے بس کی بات نہیں۔ اس مائدہ روح سے لذت اندوز ہونے کے لئے واردات اور فطرت سلیمہ کی ضرورت ہے۔ بالغ نظر، ادا فہم، اور نکتہ شناس لوگ اُن کی اعجاز کاریوں کے سے حیرت سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔

متاخرین ہند اور مرزا کے معاصرین کے ہاں غزل ایک بے جان چیز ہو چکی تھی۔ علامہ آزاد بلگرامی، سراج الدین علی خاں آرزو، امام بخش صہبائی وغیرہم کی فضیلت و تبحر اور تحقیق و تدقیق سے کس کو مجال انکار ہے۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان کا تغزل مصر قدیم کی ممی شدہ نعشوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جن کی نوک پلک کی آراستگی میں شبہ نہیں۔ گرانبہا ہار زیب گلو ہیں۔ انگلیاں مرصع انگوٹھیوں سے مزین ہیں۔ بناگوش زریں بالیوں میں مستور رہیں تمام اعضا و جوارح اپنا فرض ادا کرنے کے لئے تیار معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے کارخانہ کمال میں سب کچھ ہے لیکن روح نہیں۔ طرفداری ہو گی۔ اگر میں یہ کہوں کہ مرزا پر اس ماحول کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

اُن کے کلام میں یقیناً ایسے اشعار بھی موجود ہیں۔ جن کو لفظی صنعت گروں کے کلام سے ملا دیا جائے تو کوئی تمیز نہ ہو سکے۔ لیکن اُن کی روشنی طبع نے ان کو اس اغلاق و پیچیدگی کی تاریکیوں سے نکالنے میں بڑا زور صرف کیا اور حقیقت نگاری کی شاہراہ پر لانے میں مسلسل سعی کی شوخی بیان، نزاکت خیال، رشک، تاثراتِ فراق، تمنائے وصل، معاملات فی مابین وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کو پیکر غزل کے اعضائے رئیسہ کہا جا سکتا ہے۔ ان سب کے متعلق چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں۔ جن کے معانی کی طرف اشارہ کرنے کی بھی مجھ میں تاب نہیں۔ سنئے اور بحر معنی میں غوطہ لگایئے۔

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شدہ — تشنہ بے دار و رسن بر سر جاہے دریاب

فغانی کا مشہور شعر یاد آ گیا۔

غمِ ناامیدی من نگر آں زماں بدانی — کہ برون باغ آئی و گلے بچیدہ باشی

محاکات کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔

بخوابم می رسد بند قبا وا کردہ از مستی — ندانم شوق من بر کے چہ افسوں خواندہ است امشب

اپنا اور معشوق کا تعلق اور مابہ الامتیاز۔

میرم ز بے تبسم کز فرط بدگمانی — دانند کہ جاں سپردن از عافیت گزیست
در بادہ دیر ستم آرے ز سخت جانیست — در غمزہ زود رنجی آرے ز نازنینیست
من سوئے او بہ بینم داند ز بے حیائیست — او سوئے من نہ بیند دانم ز شرمگینیست

شوخی بیان ملاحظہ ہو۔

ایں سخن حق بود و دو گاہی بزبان ما رفت — چون تو خود گفتنی کہ خوباں اہل از غار ہست،
من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا — فریبمش کہ مگر می تواں فریفت مرا

توجیہ عجیب

بے وجہ در رہت نیست از پا فتادن من — بر دیدہ می فشانم در رہ قدم قدم را

نزاکت خیال

بے خود بوقت ذبح طپیدن گناہ من — دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست
شباہتیست مرا ز آنکہ در پیالہ ہست — دگر نہ موئے بباریکی میان تو نیست
فغاں سہی ز من تصور کمرش — جو نقطہ کہ ہنوزش وجود در نظر است
فریب وعدہ بوس و کنار یعنی چہ — کمر دروغ دروغ و دہن دروغ دروغ

مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔

بمرگ من کہ پس از من بمرگ من یاد آر — بکوئے خویشتن آں نعش بے کفن یاد آر
من آں نیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد — فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر
بہ بام و در زرہم جوان و پیر مگیبے — بکوے و برزن از اندوہ مرد و زن یاد آر
بساز نالہ گرہے ز اہل دل دریاب — بہ بند مرثیہ جمعے ز اہل فن یاد آر
ملال خلق و نشاط رقیب در ہر حال — ز خویش خویش بہ تحسین تیغ زن یاد آر

ان کا محبوب نظیری کے محبوب کی طرح کسی اور پر عاشق ہو چکا ہے۔
چنانچہ لکھتے ہیں۔

چشمش پر آب زلف دہر پریشیست — من در گماں کہ از اثر دود آہ کیست
ظالم تو در شکایت عشق ایں چہ باجرات — باری بمن بگو کہ دل داد خواہ کیست
نیرنگ عشق شوکت رعنائی تو برد — در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست
گویند عجز جو تو خدا ناشناس حیف — یا چوں خودی کہ داد گیتی گواہ کیست

غالب کنوں کہ قبلۂ او کوئے دلبر ست
کے میرسد بدیں کہ درش سجدہ گاہ کیست

یہی مضمون ایک دوسری غزل میں ملاحظہ فرمائیے۔

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر — واں سینہ سوزن آتشش بر خاک بستاکش نگر
برقے کہ جا بہا سوختی دل از جفا بردش ببیں — شمعے کہ خونہا ریختی دست از حنا پاکش نگر
آں کو بخلوت با خدا ہرگز نگفتے التجا — نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر

آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزن چاکش نگر
بر مقدم صید افگنی گو تلے بر آوازش ببیں — در بازگشت توسنے چشمے بفتراکش نگر

با خوئی چشم و دلش باگرمی آب و گلش
چشم گہربارش ببیں آہ شرر ناکش نگر

بزم وصال کی راز داری و احتیاط اور نشاط و استغنا کا نقشہ کھینچتے ہیں

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم
بگوشہ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیرودار نندیشیم — و گر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم — و گر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے برہ گزر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنے کارواں بگردانیم
گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم — گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

نہیم شرم بیک سوئے و باہم آویزیم
بشوخی کہ رخ اختراں بگردانیم

مجاز سے حقیقت کی طرف سعود کر رہے ہیں۔

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے — گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ قیس را بسگے ستودمے — در جاہلے ستائش فرہاد کردمے
رفت آنکہ جانب رخ و قدرت گرفتمے — در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے
رفت آنکہ در ادائے سپاس پیام تو — ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمے

اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے

غالب ہوائے کعبہ بسر گرفتہ است — رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

اور چند اشعار سنئے جن میں حقیقی تغزل نمایاں ہیں۔

سیرم نتواں کرد ز دیدار نکویاں — نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہائے

نظارہ و دل، شبنم و ریگ کیا نادر تشبیہ ہے۔

ذوقیست درین ہو بہ کہ بر نقش منقش — با دلشدہ ہیچ مگوئے ہمہ زاں ہائے

دوسرا مصرع دیکھئے بولتا، پھڑکتا اور تڑپتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

در خلوت تابوت ز رفتست زیادم — بر تختہ در دوختہ چشم نگراں ہائے

ہائے کتنی ظالم منظر میت ہے۔

معشوق کا تصور، اُسے پالینے کا خیال، عاشق کے نزدیک انتہائے مقصود، کمال مراد یا کامرانی کونین جو کچھ بھی کہو کم ہے معلوم ہوتے ہیں۔

مژدۂ خرمی و بے خللی را مانی — ابدی جنت و فیض ازلی را مانی
بسکہ ہموارہ و لاآویزی و شیریں حرکات — سایۂ طوبیٰ و جوئے عسلی را مانی
جلوہ فرمائی و جاوید نمائی بہ کسے — بیمائی و بہشت عملی را مانی
بہ توانائی کوشش نتواں یافت ترا — سر خوشیہائے قبول ازلی را مانی

ایک اور غزل کے چند شعر سنئے۔ حسرت امید اور آرزو کی مکمل نقاشی ہے۔

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم — ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
نیاز مندی حسرت کشاں نمیدانی — نگاہ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
بہار من شو و گل گل شگفتنم دریاب — بخلوتم برو ساغر کشیدنم بنگر
بداد من نرسیدی ز درد جاں دادم
بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر

رشک | رشک ایک طبعی ملکہ ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس کا صحیح استعمال بام ترقی و فلاح تک پہنچنے کے لئے بمنزلۂ نردبان ہے۔ صنعت علم تجارت اور حکومت وغیرہ ہر شعبہ عمل میں اس کی شعبدہ کاریاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن معاملات حسن و عشق میں اس کا تسلط بہت بڑھ جاتا ہے جس سے متاثر نہ ہونا انسان کے بس کی بات نہیں۔

خطا معاف نگاہوں کو کھینچ لیتا ہے حسن — خطا معاف یہ آنکھیں نہیں ہیں پتھر کی

لیکن عاشق نہیں چاہتا کہ اس کے معشوق کی پیاری صورت کوئی دیکھے۔ اس کی نازک اور نغمہ خیز آواز کوئی سنے۔ اس کی نرم انگلیوں کو بطور مصافحہ بھی کوئی مس کرے۔ وہ اس کی تمام ہستی و ملحقات ہستی کو اپنے لئے وقف کرلینا چاہتا ہے۔ اس میں بقدر وہم و گمان بھی کسی دوسرے کا دخل اُسے گوارا نہیں۔ مرزا اس میں بھی گوناگوں مضامین اور نوقلموں نکتے پیدا کرتے ہیں۔

رقیب کی یاد اپنے دل میں لانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہی دل یاد دوست کا مسکن ہے۔ اس طرح دشمن کو دوست سے ہمنشینی حاصل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

یاد از عدو نیارم آنہم ز دوربینی است — کاندر دلم گزشتن با دوست ہمنشینی است

افراط رشک دوزخ ہے۔

بر روئے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک — از مہر خویش جنت دلبستہ ایم ما

ماتم امام میں تنہا رونا چاہتے ہیں۔

با خاکیان بکلم و ز افلاکیاں برشک — خواہم بہ آستان تو تنہا گریستن

قاصد کے سامنے محبوب کا نام لینے سے بھی جھجکتے ہیں۔

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگزارد کہ گویم نام را

یہی مضمون اردو میں بھی ادا کیا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر میں

رشک آیدم ز روشنی دیدہ ہائے خلق
دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست
یا من بخواب ناز و من از رشک بدگماں
تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

خمریات | خمریات سے مرزا کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ اس زمین میں بھی بہت گل کاری کی اور اپنی ایجاد آفریں طبیعت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے ظلمت کدۂ ہستی میں ان کو اگر کبھی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے تو محض برق شراب کی طفیل۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا — ہلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

ان کے درد کی دوا، دل کی قوت اور جان کا نور یہی چیز ہے۔
وہ بطور میراث کوئی دنیوی سامان اس کے سوا اپنے مورث سے نہیں چاہتے

رنجورم و بے بدہر در ماں بودم — نیروئے دل و روشنی جاں بودم
گفتم بہ پدر کہ خوب مے نوشی کن — تا بادہ بمیراث فراواں بودم

لیکن خود اپنے وارث کے لئے ایک دو خم مے بھی باقی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔

اے آنکہ ترا سعی بدرمان من است — منعم مکن از بادہ کہ نقصان من است
حیف است کہ بعد من بمیراث رود — ایں یک دو سہ خم کہ در شبستان من است

جلوۂ ساقی و ساغر مے سے یکساں گرمی بزم کا ساماں فراہم کرتے ہیں۔

چناں گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری — گداز جوہر نظارہ در جام است مستاں را

عکس جمال دوست سے فروغ بادہ کو دیکھ کر کیا تشبیہ پیدا کی ہے۔

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست — گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

بھوئے معشوق کا شغل دیکھئے۔

سوز و گریش مے داد ہم چناں بہ لہو — ریز [illegible] شراب را

آب و شراب کا امتیاز ملاحظہ ہو

آبش دہم بہ بادہ و او ہر دم از تمیز — نوشد مے و ز جام فرو ریزد آب را

حلت شراب کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتے ہیں، واعظ کو مخاطب کرتے ہیں۔

نگفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر — برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

کبھی شراب کے حرام ہونے کا خیال آجاتا ہے اس کا ترک کرنا بھی گوارا نہیں۔ اپنی تسلی کے لئے خود ہی جواز کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

بہ بادہ گر بودم انس شاعرم نہ فقیہم — سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد

بلکہ اگر زاہد لوگ شاعر سے فتویٰ لینے کی تکلیف گوارا کریں تو آئیں اور سنیں کہ ایک حیلہ سے وہ بھی پی پلا کر مغفور ہو سکتے ہیں۔

صہبا حلال زاہد شب زندہ دار را — اما بشرط آنکہ ہماں صبحدم کشد

مرزا کے نزدیک شباب و زہد اجتماع نقیضین سے کم نہیں۔

شباب و زہد چہ ناقدر دانیٔ ہستی است — بلا بجان جوانان پارسا ریزد

<u>شکوہ سنجی</u> شکایت زمانہ مرزا کا خاص مضمون ہے اس کو بارہا بیان کیا ہے اور ہر جگہ اسلوب بدیع اور انداز عجیب کے ساتھ غزل، رباعی، قصیدہ، قطعہ، مثنوی غرض کوئی صنف سخن اس سے خالی نہیں لکھتے ہیں

در باغ مراد ما ز بیداد تگرگ — نہ نخل بجائے ماندنے شاخ نہ برگ

چوں خانہ خراب است چہ نالیم ز سیل — چوں زیست وبال است چہ ترسیم ز مرگ

در بزم نشاط خستگاں را چہ نشاط — از عربدہ پائے بستگاں را چہ نشاط

گر از شراب ناب بارد غالب — ما جام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

تمام عمر عبث توقعات میں گزر گئی۔

بازیٔ خورد روزگار بودم ہمہ عمر — از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر

بے مایہ بفکر سود ماندم ہمہ جا — بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ کوئی کمال کام نہ آیا۔ آخر بڑھاپے میں تمام خواہشیں ترک کرکے صرف مے کو مراد ٹھہرا لیا تھا اس نے بھی وفا نہ کی

اوراق زمانہ در نوشتیم و گذشت — در فن سخن یگانہ گشتیم و گذشت

مے بود دوائے ما بہ پیری غالب — زاں نیز بہ ناکام گذشتیم و گذشت

آسمان کو کسی کی تابندگی نہیں بھاتی۔

داغم از پرورش چرخ کہ در بزم امید — سر شمعے کہ فروزد دہدم گاز دہد

حزن اعوام کے خلاف جرمن کے مشہور فلسفی شوپنہار کی طرح کسی کا مینائی پر مسرور نہیں ہوتے بلکہ فطرت کائنات کے ماہر ہونے کے سبب ایک انوکھی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی مراد بر آئے تو خوش نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ایک دوسری نامرادی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے آسائش کی تلاش ہی فضول ہے۔ ایک الجھن سے نکلوگے دوسری میں پھنس جاؤ گے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

عشوہ مرحمت چرخ محر کیں عیار — یوسف از چاہ برآرد کہ بہ بازار دہد

محو آسودگی گر مرد رہی کاندریں وادی — چو خار از پا بر آید پا ز دامن بر نمی آید

ہستی موجب علائق ہے اور علائق موجب مصائب نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مصائب کی جڑ اقرار ہستی اور تعمیر ہستی یہی ہے۔

تمام زحمتم از ہستیم چہ می پرسی — ز جسم لاغر خویشم بہ پیرہن خار است

علائق سے نجات چاہتے ہیں لیکن کامیابی کہاں۔

دامن افشاندم بجیب و ماندہ در بند تنم — وحشتے کو تا بروں آرد ز عریانی مرا

ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم — غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

اسی خیال کو اردو میں یوں ادا کیا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اپنے خون میں تڑپنے کی شکایت کرتے ہیں اس ذات کے حضور میں جس کے علم میں نہاں و آشکارا اور شہود و غیب یکساں ہے۔

حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ بشمری نالہ بسینہ بنگری

بخت بد کی یہ تاثیر ہے کہ کوثر خشک ہو جائے اور طوبیٰ پر بھی خزاں آجائے۔

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم ز بے نمی — طوبیٰ اگر ز من شود ہیمہ کنم ز بے بری

ایک قطعہ میں اپنے آپ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ اے غالب زیاں کار جب خدا نے رزق عباد اپنے ذمے رکھا ہے تو تم کیوں بھوکے مرتے ہو؟ دراصل بات یہ ہے کہ چند سال سے تمہاری قطع حیات اور انسداد رزق کا حکم ہو چکا ہے۔ فرشتہ رزق بہت فرمانبردار ہے۔ اس نے فوراً تعمیل ارشاد کی اور رزق بند کر دیا۔ دوسرے فرشتے نے تجھ کو ہلاک کرنے میں دیر لگا رکھی ہے۔

دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد — روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل

لطیفہ گیرم از قول شاعرے تضمیں — کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبود عدیل

اگر خدائے بداند کہ زندہ تو ہس[illegible]

ہزار مشت زند بر دہان عزرائی[illegible]

انتہائے شکوہ یہ ہے کہ صاحب شکوہ تمام وسائط و وسائل اور اسباب وعلل کو نظرانداز کر کے ایک آخری جرأت سے مسبب حقیقی کی بارگاہِ جلال میں کھڑا ہو کر اپنی داستانِ اندوہ پیش کر دے اور اپنی ہستی حقیر کو صدورِ افعال کے ناقابل سمجھ کر سب کچھ اسی طرف منسوب کرنے میں باک نہ کرے۔ یہ مضمون سب سے پہلے عہد نامہ قدیم کے صحیفۂ ایوب میں اکمل واتم طریق پر موجود ہے اس صحیفہ کے تمام ابواب میں ستم رسیدہ ایوب جناب باری میں نہایت کھلے ہوئے شکوہ سنج نظر آتے ہیں جس کو پڑھ کر کوئی صاحب دل کرب واذیت اور حیرت واستعجاب کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مرزا نے بھی اپنی مثنوی گہر بار کے قریبًا ۶۰ شعر اس مضمون کے لئے وقف کئے ہیں۔ غالبًا علامہ سر اقبال کے شکوے کا ماخذ یہی مثنوی ہے۔ مرزا نے اپنے شکوہ کو لفظ و معنی کے اعتبار سے معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ باز پرس کا دن ہے صالحین اپنی صلاحیت کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہیں اسی ہجوم میں ایک حسرت مند اور سر نگیں جماعت نمودار ہوتی ہے۔ ان میں مرزا غالب دہلوی سینہ کوباں نظر آتے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے داورِ محشر کے حضور اپنی شفاعت و وکالت پر خود ہی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے:-

"میرے اعمال کو ترازو میں نہ رکھ۔ میرے ہر رنج و درد کا باعث تیری ذات کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ مجھے حساب و پرسش سے معذور رکھ یا مجھے صاف گوئی کی جرأت دے۔ میری گستاخ گفتاری معاف کر۔ اے گفتہ و ناگفتہ سے یکساں واقف۔ مجھ کو کہہ لینے دے جو میرے دل میں ہے۔ میں قتل و غارت اور شرک و کفر کا مجرم نہیں مے خوار ہوں اور وہ بھی برائے نام۔ بہت سی چاندنی راتیں اور بہار کے دن حسرتِ مے نوشی میں گزر گئے۔ دمِ عیش رقصِ بسمل سے زیادہ نہ تھا تو نے مجھے دنیا میں ہمیشہ بے برگ و نوا ہی رکھا۔ دنیا کے دکھوں کی یاد مجھے بہشت میں بے چین کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میرے گناہوں سے حسرتِ گناہ کا پلڑہ بھاری ہے۔ بے شک میں رند ناپارسا اور گبرِ مسلماں نما ہوں لیکن تیری پاک کتاب کا عابد اور تیرے دانا پیامبر کا محب ہوں مجھے نجات سے بہرہ یاب کر۔"

یہ مثنوی تنہا ہی مرزا کی قوتِ ایجاد و مادہ اجتہاد پر ایک برہانِ قاطع ہے۔

مراثی | مرثیہ میں چند قصاید اور متعدد قطعات و ترکیب بند لکھے ہیں۔ جن میں مضمون کی ندرت کے ساتھ ساتھ درد و اثر کی فراوانی ہے۔ غالب کو آج تک مرثیہ گو کی حیثیت سے بالکل خاموش سمجھا گیا ہے۔ لیکن یہ قطعاً ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان مراثی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اندوہ و ماتم کے مضامین کو بیان کرنے پر بھی انہیں کافی قدرت حاصل تھی۔ ملاحظہ فرمایئے شاہزادہ کا مرثیہ لکھتے ہیں۔

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو   اے چشم از زاوش دل اشکبار شو
اے خاک چرخ گر نتواں زد بجادرا   اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط   اے روزگار چوں شب ماہ تار شو
اے ماہتاب روئے بسیلی کبود کن   اے آفتاب داغ دلِ روزگار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

اے قوم خویش را بشکیب امتحاں کنید   ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید
طفلست شاہزادہ دررہ خطر بسیت   منعش ز عزم رہروے آں جہاں کنید
ازمیوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید   از جملہ آنچہ لائے شما باشد آں کنید
درخود ز رفتنش نتوانید باز داشت   بیخود شوید و جامہ درید و فغاں کنید

اے اہل شہر مدفن ایں دودماں کجاست
خاکم بفرق خواب گہ خسرواں کجاست

زاں سبزہ خط کہ بر رخ او نادمیدہ ماند   گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند
درمدح شاہزادہ سخنہائے دلپذیر   دردا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند
اخلاق شاہزادہ بود دلنشین خلق   بوئے ز آں شگفتہ گل نورسیدہ ماند

آں سرو سایہ دار کہ بارش نبود کو
واں نو گل شگفتہ کہ خارش نبود کو

وقتیست اے سپہر ز اور ستمگرے   بارے برم ز جور تو پیش کہ داورے؟
نیرنگ ساز چرخ کہ بید اد خوئے اوست   با گل کند سمومی و با شاخ صرصرے
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد   از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہرے

زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ حیف
آں نونہال سرو قد کجکلاہ حیف

شہزادہ سے خطاب کرتے ہیں

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ   ما بے تو در نہیم تو بے ما چگونۂ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی   با حوریانِ آئنہ سیما چگونۂ
ما بجزو اں بحلقہ ماتم نشستہ ایم   از خویشتن مگوے کہ تنہا چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامان خردسال   بے باغ و قلعہ و لب دریا چگونۂ

اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمے
پروانۂ چراغ مزار تو عالمے

امام حسین علیہ السلام کے مرثیہ میں جو سینہ کوبی و اشک ریزی کی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں تکلف ہے۔ دیکھئے۔

اے فلک شرم از ستم بر خاندانِ مصطفےٰ   داشتی زین پیش سر بر آستانِ مصطفےٰ
اے بمہر و ماہ نازاں ہیچ میدانی چہ رفت   از تو بر چشم و چراغ دودمانِ مصطفےٰ
سایہ از سرو روانِ مصطفےٰ افتد بخاک   ہاں چہ بر خاک افگنی سرورانِ مصطفےٰ
گرمیٔ بازار امکان خود طفیل مصطفےٰ ست   ہیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ
کینہ خواہی ہیں کہ با اولاد امجادش کنی   آنچہ بامہ کردہ اعجاز بنانِ مصطفےٰ
یا تو دانی مصطفےٰ را فارغ از رنج حسین   یا تو خواہی زیں مصیبت امتحانِ مصطفےٰ
یا مگر گاہے ندیدی مصطفےٰ را با حسین   یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفےٰ
آں حسین ست ایں کہ سودے مصطفےٰ خش بر رخ   بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفےٰ
آں حسین ست اینکہ گفتی مصطفےٰ روحی فداک   چوں گذشتے نام پاکش بر زبانِ مصطفےٰ

اے کج اندیشہ فلک حرمتِ دیں بایستے   علم شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے
تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند   عزتِ شاہ شہیداں بہ ازیں بایستے
حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن برخاک   آنکہ جولانگہ او عرش بریں بایستے
حیف باشد کہ زاعدا دم آبے طلبد   آنکہ سائل بدرش روح امیں بایستے
سخن انیست کہ در راہِ حسینؑ ابن علیؑ   پویہ از روئے عقیدت بجبیں بایستے
چشم بد دور بہنگام تماشائے رخش   رونما سلطنتِ روئے زمیں بایستے
با اسیرانِ ستم دیدہ پس از قتلِ حسین   دلِ نرم و تپشِ مہر گزیں بایستے

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالب
علم شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے

مناظر فطرت: انیچرل شاعری کی ایجاد کا سہرا عموماً شعرائے مغرب کے سر سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارا نیچرل شاعر اس اسٹیج پر بھی پوری قدرت و قوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے بہت سے قصائد کی تشبیبیں بہار کی تصویر کشی سے آراستہ کی گئی ہیں بعض قطعات و قصائد میں روشنانِ فلک کا نظارہ پیش کیا ہے۔

اس منزل میں مرزا ایک ماہر فلکیات سے کم نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ قصیدہ نمبر ۲۵ کی تشبیب میں کلکتے کو خطاب کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

"سیر گاہیست در اطراف تو گوئی کشمیر   روستائیست ز اقصائے تو گوئی شیراز"

قصیدہ نمبر ۱۴ طوطیانِ زمرد رنگ کی توصیف سے شروع ہوتا ہے۔

خیز تا بنگری بشاخ نہال   طوطیانِ زمردیں تمثال
گاہ مرجاں دمانده از منقار   گہ زبر جد فشاندہ از پر و بال

قصیدہ پنجم کی تمہید میں مرزا کی ایجاد طبیعت نے جو کچھ لکھا ہے جہاں تک میرا مطالعہ ہے کسی پیشرو کا شرمندہ تقلید نہیں۔ صبح کا وقت ہے برہمن کے ہاتھ میں کلیدِ میکدہ متحرک ہے۔

خیزند دستہ دستہ مغانِ نہ شستہ روئے   در اہتمام چیدنِ برسمِ زنار و ن
از شور دبر یاں بگمانِ خروش صور   اموات را ز رقص بہ تن بر درد کفن
رخشد ستارہ از رخِ ناشستۂ صنم   بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ شمن
خواہد چراغ کشتہ چو شخص بریدہ سر   خیزد گل شگفتہ چو رنجور خستہ تن

مثنوی "چراغ دیر" میں بنارس کا نقشہ دکھایا ہے:۔

بیا اے غافل از کیفیتِ ناز   نگاہ بر پری زادانش انداز

میاں ہا نازک و دلہا توانا   ز نادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست   دہنہا رشک گلہائے ربیعی ست
بہ لطف از موج گوہر نرم رو تر   بناز از خون عاشق گرم رو تر

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش   بہار بستر و نوروز آغوش
بسامانِ دو عالم گلستاں رنگ   ز تاب رخ چراغانِ لب گنگ

قیامت قامتاں مژگاں درازاں   ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں
مگر گوئی بنارس شاہدے ہست   ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

ہجو: ہجو سے اگرچہ پرہیز کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں زبان سے کچھ نکل جاتا ہے پھول گرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کسی سخت دشمن کے متعلق لکھتے ہیں۔

کردہ جہدے کہ در ویرانیٔ کاشانہ ام   چرخ در آرائش ہنگامۂ عالم نکرد
گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا بر خود مپیچ   زانکہ حرفے زانچہ گفتم خاطرم خرم نکرد
بیتے از استاد دیدم ذوقکے بخشید لیک   ہیچ در تسکین غیظ دوزخ دشتم کم نکرد
ہیچو تو نا قابلے در صلب آدم دیدہ بود   زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ بر آدم نکرد

حاش للہ بود نت در صلب آدم تہمت ست
پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نکرد

میرے خیال میں تو اس سے آگے ہجو کا کوئی اور درجہ نہیں اور لطف یہ ہے کہ شفائی و سوزنی کی طرح عریاں الفاظ کا شائبہ تک نہیں۔

ایک بے ہنر شیطان سیرت دشمن کی تواضع ہو رہی ہے۔

ایا بے ہنر دشمن دیوسار — چہ نازی بہنگامۂ زور و زر
زما باش فارغ کہ ما فارغیم — نداریم پروائے ایں شور و شر
ترا شیوہ دزدی و ما بے نوا
تو بد روئے و بدگوئے و ما کور و کر

عورت کی رفاقت سے عمر بھر دل برداشتہ رہے۔ نثر و نظم کے اکثر اجزا اس پر شاہد ہیں۔

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت — سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

مزاح مرزا کی ہر بات سے ایک سنجیدہ ظرافت اور فلسفیانہ مزاح ٹپکتا ہے۔ اس میں بھی عجیب و غریب نکتے پیدا کئے ہیں۔ مشہور ہے کہ ازدواج و خانہ داری موجب مصائب و آلام ہے۔ اس قید سے آزادی و بے فکری مفید صحت و قوت ہے اس خیال سے کیا نادر نتیجہ نکالتے ہیں۔

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا، چرا توانا نبود

اور سنئے کسی تند خرام حاجی کا قیافہ لگا رہے ہیں

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری — نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تند مے خرامی دانم — در خانہ زن ستیزہ خوے داری

بہشت اور زہاد کا تصور کرتے ہیں۔

گر و بدن زاہداں بجنت گستاخ — ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ — ماند بہ بہایم و علف زار فراخ

شراب چاہتے ہیں مگر مفت، اعلیٰ اور بکثرت۔

غالب بہ سخن گرچہ [illegible]ت ہمسر نیست — از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار — ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

افلاس کے سبب صوم و صلوۃ کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ شرع میں ترمیم چاہتے ہیں۔

در عالم بے زری کہ تلخ ست حیات — طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ — بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰت

جہالت کے بھی مختلف درجے ہیں۔

ہر چند زمانہ مجمع جہال ست — در جہل نہ حال شاں بیک منوال ست
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے — فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

احترام اساتذہ اکثر غزلوں کے مقطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا دل اساتذہ کے احترام سے معمور تھا۔ بالخصوص ظہوری سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب — رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

غالب از صہبائے اخلاق ظہوری سرخوشیم
پارہ بیش ست از گفتار ما کردار ما

غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جاں در تن ساز بیانش کردہ ام

نظیری، اور صائب کی غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور برابری کا دعوے نہیں کرتے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب — خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم
ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است — در نمود نقشہائے اختیار افتادہ ام

عرفی کے تتبع پر بھی نازاں ہیں۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب — جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

اپنے متعلق خوب رائے رکھتے ہیں۔

جوہر طبعم درخشاں ست لیک — روزم اندر ابر پنہاں میرود
تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی — مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست
غالب ز ہند نیست نوائے کہ میکشم — گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما
بیا و بید گرایں جا بود زباں دانے — غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد
از تازگی بدہر مکرر نمی شود — نقشے کہ کلک غالب خونیں رقم کشد

نظم و نثر شورش انگیزی کرمی باید بخواہ
اے کہ می پرسی کہ غالب در سخن یکتاست ہست

عرشی

حُسن کے دو پہلو

مکرمی۔ تسلیم:۔

عنایت نامہ پہنچا تھا۔ مگر میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ اس کے علاوہ کوئی تازہ نظم وغیرہ بھی سالنامے کے قابل تیار نہ تھی اس لئے جلد جواب نہ دے سکا۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو نظم کے لئے موضوع کی تلاش ہوئی۔ کئی روز سوچنے کے بعد یاد آیا کہ میں نے ۱۹۳۲ء میں ایک نظم بطور ترجیع لکھی تھی جس کی ٹیپ کا مصرع تھا "بھاگ بلائے حسن سے بھاگ" اس پر اکثر حسن پرست اصحاب کو مجھ سے میری حُسن کے خلاف اس جسارتِ بے جا کا شکوہ تھا۔ یہ یاد آنا تھا کہ دل نے مشورہ دیا کہ وقت آگیا ہے کہ اب اپنی اُس جسارت بے جا کے ارتکاب کی تلافی کر دی جائے۔ چنانچہ اسی بحر اور قریب قریب اُسی زمین میں خامہ فرسائی شروع کر دی۔ مگر مشکل یہ آپڑی وہ موضوع بالکل نیا اور اچھوتا تھا اور بہت جلد میں اس میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر میں نے جس موضوع پر اب قلم اٹھایا تھا وہ بہت کٹھن ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس موضوع پر ہمارے شعرا ہزارہا سال پہلے سے خامہ فرسائی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اس موضوع میں کوئی نئی بات پیدا کرنی ذرا کار دارد۔ لیکن میں مشکلات سے گھبرایا نہیں اور میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ خدا نے میری کوششوں کو مشکور فرمایا۔ اب کہ دس گیارہ دن کے بعد میں اس نظم کو تیار کرسکا ہوں۔ آپ کے ارشاد کے موافق "ادبی دنیا" کے سالنامے کے لئے ارسال خدمت کر رہا ہوں اندازِ بیان نیا ہے، موضوع نیا نہیں تو نہی۔ امید ہے کہ آپ بھی پسند فرمائیں گے۔

ہاں خوب یاد آیا میں نے ۱۹۳۲ء میں جو نظم لکھی تھی۔ اُس میں حسن کا تاریک پہلو دکھایا گیا تھا اور اب جو نظم میں ارسال خدمت کر رہا ہوں وہ حسن کا روشن پہلو ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ میں وہ سابقہ نظم بھی آپ کی خدمت میں بھیج دوں تاکہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو دونوں کو بالمقابل شائع فرما سکیں۔ بہرحال پہلی نظم "حسن غارت گر" کے عنوان سے اور تازہ نظم "حسنِ دل نواز" کی سرخی سے ارسالِ خدمت ہے۔ ہرچند کہ "حسن غارت گر" نظم پہلے شائع ہو چکی ہے مگر "حسن دل نواز" کے ہمراہ اگر یہ دوبارہ شائع ہو تو زیادہ لطف انگیز صورت ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ حسن کے تاریک اور روشن رُخ دونوں یک جا اور بہ یک وقت پیش نظر آجائیں گے۔ مگر یہ امر آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔

ہاں گذشتہ زمانے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ سخت علیل ہوگئے ہیں۔ مگر اُس زمانے میں میں بھی بہت پریشان تھا مگر دعا گو تھا کہ خداوند عالم جلد آپ کو صحت عطا فرمائے۔ الحمدللہ کہ اس نے میری دعا قبول فرمائی صحت یابی پر ہدیہ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نیازمند آزاد انصاری۔۔

"حُسن غارتگر"

حسن کا تاریک پہلو

حسن تباہی لاتا ہے　　حسن کے گن کیا گاتا ہے　　عشق نہیں ہے آگ ہے آگ　　عشق میں اپنا جی نہ تیاگ

بھاگ بلائے حسن سے بھاگ　　حسن گلے کٹواتا ہے　　بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ　　کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ

حسن کے ارماں ٹھیک نہیں   جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں، ہاں ٹھیک نہیں   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دل کو لگا کر کیا لے گا   جان کھپا کر کیا لے گا
زیست گنوا کر کیا لے گا   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن پہ جی کیوں کھوتا ہے   تخمِ غم کیوں بوتا ہے
حسن کسی کا ہوتا ہے؟   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

لعلِ جادو فن کو نہ چاہ   جعدِ کمند افگن کو نہ چاہ
دشمنِ جاں! دشمن کو نہ چاہ   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کا دم کیوں بھرتا ہے   خونِ دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

چشم نہیں ہے، ڈائن ہے   زلف نہیں ہے، ناگن ہے
عشوہ نہیں ہے، رہزن ہے   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن سے دھوکا کھائے گا   رنج و اذیت پائے گا
دیکھ۔ بہت پچتائے گا   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

عالم روئے حسن نہ دیکھ   جلوہ سوئے حسن نہ دیکھ
بھول کے سوئے حسن نہ دیکھ   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کو پہلے زر دے گا   بعد ازاں کل گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسنِ بتاں سے بات نہ کر   دشمنِ جاں سے بات نہ کر
خصمِ جہاں سے بات نہ کر   بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اہلِ ادا سے بچ کر چل　　چشمِ قضا سے بچ کر چل
راہِ خطا سے بچ کر چل　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

جتنے حسیں کہلاتے ہیں　　دشمنِ دیں کہلاتے ہیں
دوست نہیں کہلاتے ہیں　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حُسن کی چاہت پر بھی نہ جا　　چشمِ عنایت پر بھی نہ جا
لطفِ نہایت پر بھی نہ جا　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دل کو وفا کا اذن نہ دے　　ذوقِ جفا کا اذن نہ دے
ایسی خطا کا اذن نہ دے　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

اس کی ملاحت پر بھی نہ ریجھ　　اس کی صباحت پر بھی نہ ریجھ
نازو نزاکت پر بھی نہ ریجھ　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

دولتِ دین و دل نہ گنوا　　بے جا. لاحاصل نہ گنوا
ہوش میں آ. غافل! نہ گنوا　　بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

ہجر کا غم بھی قاتل ہے　　وصل کا سم بھی قاتل ہے
کم سے کم بھی قاتل ہے　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کا ہو کر کیا لے گا　　سر سے پا تک کھا لے گا
بھاگ نہیں تو آ لے گا　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

شوق وفا بھی مہلک ہے　　ذوقِ جفا بھی مہلک ہے
کم بھی سوا بھی مہلک ہے　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

آزاد! اپنی جان بچا　　دین بچا۔ ایمان بچا
ناداں! کہنا مان۔ بچا　　بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حکیم آزاد انصاری

حُسنِ دل نواز

حُسن کا روشن پہلو

حُسن سے اپنا عہد نباہ
حُسن سفید و حُسن سیاہ
ایک ہیں پیشِ اہلِ نگاہ
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن سے قربت حاصل کر
عشق سے لذت حاصل کر
چاہ میں شہرت حاصل کر
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن حیاتِ عالم ہے
جوہرِ ذاتِ عالم ہے
وجہ ثباتِ عالم ہے
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسن کے ارماں پیدا کر
پیدا پنہاں پیدا کر
پیدا کر، ہاں پیدا کر
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسن خدائے الفت ہے
عقدہ کشائے الفت ہے
یعنی برائے الفت ہے
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن سے اپنی چاہ بڑھا
چاہ کے رسم و راہ بڑھا
چاہ کی عزّ و جاہ بڑھا
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسنِ بتاں سے ربط بڑھا
جسم کا جاں سے ربط بڑھا
روحِ جہاں سے ربط بڑھا
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن سے نفرت کفر ہے کفر
ردِّ نعمت کفر ہے کفر
ایسی حرکت کفر ہے کفر
چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن کی چاہت فرض سمجھ تا حدِ طاقت فرض سمجھ
فرض ہے طاعت فرض سمجھ چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حسن جہاں ہاتھ آئے، پہنچ عشق جہاں لیجائے، پہنچ
چاہ جہاں پہنچائے، پہنچ چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

جو بھی حسیں کہلاتا ہو زہرہ جبیں کہلاتا ہو
خواہ کہیں کہلاتا ہو چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

حسن پہ مائل ہوکر جی عشق میں کامل ہوکر جی
زیست کے قابل ہوکر جی چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

اہل ادا ہو، کوئی ہو ماہ لقا ہو، کوئی ہو
بُت ہو، خدا ہو، کوئی ہو چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

حسن سے چاہ بڑھائے جا چاہ کے چرکے کھائے جا
چاہ کی دادیں پائے جا چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

حُسن کا باغی احمق ہے حسن کہیں ہو برحق ہے
مظہرِ حسنِ مطلق ہے چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

شکر خدا کر، شکر خدا جس نے جہاں کو حسن دیا
اور تجھے صاحب عشق کیا چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

حُسن سے آنکھیں روشن کر حسن سے سینہ گلشن کر
حسن جہاں ہو درشن کر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

اے دلِ بیزار! اب بھی سمجھ چاہ کا سراب اب بھی سمجھ
اب بھی سمجھ یار! اب بھی سمجھ چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

عقل جہاں تک کھوج لگائے عشق جہاں تک شمع دکھائے
حسن جہاں تک پایا جائے چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

الغرض اے آزاد نہ بھول حسن کی دم بھر یاد نہ بھول
عشق کا ارشاد نہ بھول چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

حکیم آزاد انصاری

مہارانی کا تحفہ

(۱)

اودے پور کو راجہ شو سے ست نے فتح کر لیا تھا، مگر اصل فتح اس کی رانی رمتا کی تھی۔ جس نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ وہ رعایا کے کسی ایک فرد کی خاطر اپنی جان تک سے گذر جانا جانتی تھی۔ پہاڑی لوگ جن کے دل میں بغاوت کی خفیف سی جنبش کے وقت اُن کی جنم بھومی ـــــ پہاڑوں کی ناقابل گذر نشیب و فراز، جنگل اور غار ماں کی گود کی مانند کھلے رہتے تھے۔ اب بغاوت کا خیال ہی دل میں کیوں لاتے کہ ان کے لئے ایک اور ماں کی گود کھلی تھی ـــــ رمتا اُن کی مصیبت و تنگ حالی کو خود دیکھا اور سنا کرتی۔

شام کے وقت سورج کی آخری شعاعیں قلعہ کے محرابوں سے چھن کر مشرق کی طرف یوں پڑ رہی تھیں جیسے پہاڑ کی چوٹی سے سنہری پانی چوکور سی دھاروں میں گر رہا ہو۔ برپے کے اونچے پہاڑی درخت چٹانوں کے پیچھے سے ایڑیاں اٹھا کر قلعہ سے بلندی کا گلہ کرتے ہوئے سورج کی موت کے راگ کو مکمل خاموشی سے سُن رہے تھے۔ مہارانی رمتا نے جھروکے کے پیچھے سے سر اٹھا کر محرابوں کو دیکھا۔ سنہری پانی کے آخری قطرے نظر آ رہے تھے اور چشمے سے اڈتی ہوئی سنہری دھاریں بھی اب مختصر ہوتی جاتی تھیں۔ مگر راج پروہت کا جلوس ابھی تک قلعہ کے جھروکے کے نیچے نہیں پہنچا تھا۔

. . . بالآخر جلوس پہنچ ہی گیا۔ طلب و مسرت سے دیوانے لوگ گھنٹیوں کو یوں کوٹ رہے تھے جیسے کوئی نحیف بوڑھا تقاضائے عمر کی وجہ سے کسی ذاتی دشمن سے بدلہ لینے کے تخیل میں ہاتھ کی ہتھیلی پر دانت پیستے ہوئے زور زور سے مکے مارتا ہے یا جس طرح سمندر کی غضبناک لہریں چٹانوں سے سر پھوڑ کر ایک دل کو بٹھا دینے والی آواز نکالتی ہیں ـــــ گاؤں کی مالن کی چاندی تھی۔ لوگ پیسے دے کر بھی پھول بھکاریوں کی مانند مانگ رہے تھے ـــــ راج پروہت سے انہیں دلی عقیدت تھی۔ راج پروہت کے والدین نے اُسے روحانی تعلیم دلانے کے لئے بچپن ہی سے ہمالیہ کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگلوں میں بھیج دیا تھا ـــــ اُسی جگہ پر جہاں برسوں سے اب تک رشی پرانا یام کے ذریعہ سانس چڑھائے پڑے ہیں۔ صرف اُن کے بدن کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں ایک نہایت باریک چمڑے کے نیچے دل کی ایک خفیف سی حرکت اس بات کا یقین دلا رہی ہے کہ ان پنجروں میں کسی مخصوص موقع پر روح اپنے پاک احساس کے ساتھ عود کر آئے گی۔

راج پروہت بیس برس کی کڑی تپسیا کے بعد تیس برس کی عمر میں واپس لوٹ رہے تھے۔ اُن کے بشرہ پر روحانی تجلی عیاں تھی۔ آنکھیں شباب کی آمد آمد کی وجہ سے سُرخ تھیں ـــــ مہارانی رمتا نے نہایت غور سے راج پروہت کو دیکھا۔ مہاراجہ اور مہارانی دونوں نے پروہت جی کو نمسکار کی اور جلوس آہستہ آہستہ گذر گیا۔

رمتا جھروکے سے اٹھی اور حسبِ معمول چاند کی چاندنی میں شہر کا نظارہ کرنے کے لئے قلعے کے محرابوں کے نیچے کی طرف بڑھی۔ چاند نے رات کی سیاہ چادر پر اپنی چاندنی پگھلا کر بچھا دی تھی۔ جس جگہ رانی رمتا کھڑی تھی۔ وہاں پاس ہی ایک دیوان خانہ ہونے کی وجہ سے چاند کی روشنی نہ پہنچی تھی اور اسی لئے اندھیرے میں جاتی ہوئی رمتا کی توجہ دیوانخانے کی روشن قندیلوں نے اپنی طرف کھینچ لی۔ رمتا اس طرف بڑھی۔ باندیاں مورچھل لینے کے لئے دوڑیں ـــــ رانی کو دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہوا اتفاق سے درباری گوّیا بھی دیوان خانے میں بیٹھا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ کر مہارانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چندیر! گاؤ گے نہیں کیا؟"

"گاؤں گا ـــ مہارانی جی! کیا گاؤں؟"

"یہ نہیں معلوم ہو۔ کچھ سمے کے متعلق گاؤ۔"

چندیر نے جھک کر دیکھا۔ پاس کھڑی رمتا کی آنکھوں میں اُسے کچھ بے چینی کی لہر سی معلوم ہوئی۔ اس نے چاہا کہ ان ہی بے چینی کی لہروں کو اٹھا کر وہ اپنا راگ اپنے ہنر کے مطابق شروع کرے اور اُسی بے چینی کو بے چین تڑپاتا ہوا سکوت کی مملکت میں داخل ہو کر مہارانی سے ایسا خراج وصول کرے کہ دولت جس کے پاؤں میں لوٹتی ہو اور اُس نے سمے کے مطابق گانا شروع کیا۔ اُس کے راگ نے پہلے آہستہ آہستہ

دل کو ہزاروں خیالوں کی طرف سے ہٹا کر یک سو راغب کر دیا۔ پہلے اُس نے گایا ـــ چاند چمک رہا ہے بادشاہ کے محل پر، غریب کی جھونپڑی پر، شیر کے غار پر ـــ وادیوں پر جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں میں ـــ اور مہارانی کا دل اس تصور سے زیادہ بے چین ہو گیا۔ چندیر نے ستار کی آواز کو قدرے بلند کرتے ہوئے کہا . . . اور کھوپری کے ایک ٹکڑے پر جو زمین کی اونچ نیچ یا بارش کی ریزش سے زمین سے باہر آ گئی ہے اور ـــ مہارانی کا دل پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہو گیا۔

چندیر نے اس بات کو دیکھا۔ اچھی طرح دیکھا اور زیادہ سنجیدگی سے گایا ـــ

دھرم گڑھ کا مہارانا ـــ ظالم اور عیاش رانا جس کی جلتے وقت شمشان میں کھوپری چٹخی نہ تھی۔ بلکہ ثابت رہ گئی تھی اور کسی کے توجہ نہ دینے کی وجہ سے زمین پر پڑی رہ گئی۔ شاید کسی نے دیکھ کر زمین میں دبا دی۔ اُس کے اوپر کی زمین پر گھاس اُگ آئی۔ جسے گائیں اور بھینسیں چرنے لگیں ـــ ایک دن آیا۔ جبکہ اسی طرح چاند اپنی چاندی کو یکساں طور پر بانٹ رہا تھا کہ کسان کے ہل کی نوک نے کھوپری کو باہر نکال دیا اور کسان نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھوپری ایک طرف پھینک دی!

چندیر نے ستار کی آواز کو قدرے اونچا کرتے ہوئے کہا۔ اے انسان! تیرا آغاز کیا ہے اور انجام کیا۔ زندگی کی اصلیت کیا ہے اور ہل کی نوک جس نے کھوپری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اپنی خاموشی کی بولی میں گانے لگی "جیو پیا بن ساجن کس کام" ـــ اور مہارانی رمنا کی آنکھوں سے چندیر کو آنسو ٹپکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ چندیر نے ایک تڑپ اور جلن کے ساتھ اپنی ناچتی ہوئی انگلیوں کو ستار پر سے اٹھا لیا آہ۔ گانے کے تخیل بھرا شور کے بعد کی خاموشی کا لطف بھی کم دل افروز نہیں ہوتا۔

مہارانی نے گلے سے ایک قیمتی ہار اتارا اور کہا ـــ چندیر! تمہارے راگ کی ایک بہت کم قیمت ادا کر رہی ہوں اور چندیر نے زائد سنجیدگی سے کہا:۔

"ہاں۔ پوجیہ مہارانی جی ـــ ہار کی میرے راگ کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں۔ لیکن سچ پوچھو۔ مہارانی! میں ہار اور دولت نہیں چاہتا۔ میرے راگ کی سب سے بڑی قیمت وہ آپ کے دو آنسو ہیں جو آپ کے خیال میں بے قیمت ہو کر فرش پر گر گئے ہیں ـــ!"

مہارانی نے سنجیدہ مسکراہٹ سے کہا: "کل پورنیما کا دن ہے

چندیر! بیل دیو کے ماتھے پر سیندور لگ جانے کے بعد اور راج پروہت کو کھانا کھلا کر کل پھر اسی جگہ آنا۔ چاندنی رات ہو گی۔

(۲)

سورج دیوتا مندر کے گرداگرد ننگے پاؤں چکر کاٹنے کی وجہ سے راج پروہت جی کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے وہ جنگل کی خاموشیوں سے آئے تھے۔ اُن کے کان صرف گنگا کے دلکش راگ جو ہمیشہ گائے جانے کے باوجود ویسی ہی مٹھاس اور دلکشی رکھتا ہے سننے کے عادی تھے۔ مندر میں آئے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کا شور، ڈھولک اور باجے کی آوازیں ان کے مادی شور سے ناآشنا کانوں کو پریشان کرنے لگیں۔ پربھو راج پروہت ماتھے پر ایک خفیف سا تیور ڈالتے ہوئے اپنی بھاری بھرکم کھڑاؤں کو ایک کونے میں رکھ کر بیل دیو کے پاس آ بیٹھے اُن کے ہاتھوں میں سیندور تھا۔ پجاری کے اشارے پر انھوں نے شیوجی مہاراج کے بت کے پاس دھرے ہوئے سنگ مرمر کے بیل کے ماتھے پر ٹیکا لگایا اور تمام طرف سے مونگ برسنے لگا۔

"ٹھہریئے ٹھہریئے۔ مہارانی جی آتی ہیں۔ انہیں بھی مونگ ڈالنا ہے۔" چندیر جی نے جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ آہستہ سے کہا دور سے مہارانی رمنا سفید اور سادہ کپڑوں میں ملبوس، آنکھوں کے لئے چندن کی سی ٹھنڈک لئے موسم سرما کے بادل کی طرح آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ دُور سے اس کے گلابی پاؤں زمین پر یوں پڑتے تھے جس طرح رحمت ایزدی گنہگاروں پر نازل ہوتی ہے۔ چندیر کے من مندر کے دروازے کھل گئے۔ اس کے دل کی دیوی آہستہ آہستہ بڑھی آ رہی تھی۔

تیتری کے پروں کی بھنبھناہٹ کی سی آواز آنے لگی جو بعد میں جھانجروں کی موسیقی میں گم ہو گئی۔ چندیر نے اپنی ستار سے چھیڑ چھاڑ شروع کی جھانجروں کی موسیقی چندیر کے ستار پر اُس کی انگلیوں کے ناچ کے ساتھ ساتھ رقص کر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ موسیقی اور رقص کے اس وصال کی مثال آئندہ دنیا میں پھر کبھی نہ مل سکے گی۔

جس طرح تالاب کے پرسکون پانی میں کنکر پھینک دیئے جانے پر پانی اپنے عظیم سکون کو کھو دیتا ہے۔ اسی طرح اس نئی قسم کی موسیقی نے راج پروہت کے پرسکون دماغ میں پریشانی سی پیدا کر دی۔ مونگ ڈالتے ڈالتے ہاتھ رک گیا۔ جھکتے وقت کمر اور گردن کے گرد لپٹا ہوا کپڑا گر پڑا۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے کو گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ چندیر نے

دیکھا کہ راج پروہت کا منہ کان تک سرخ ہو گیا۔ تھالی میں موتیا، کرنے، اور گلاب کے پھولوں کے ساتھ دھوپ اور دیپک رکھ دیا) بڑے ننھے جھانجروں کی موسیقی میں کھو کر راج پروہت نے کچھ کرنے کے پھول بیل دیو کی پیٹھ پر مسل دیئے اور چندیر نے محسوس کیا۔۔۔ کہ اس حرکت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

۔۔۔ اور جھانجروں کی آواز خاموشی کے پرلطف راگ میں ختم ہو گئی۔ راج پروہت جی نے محسوس کیا کہ وہ اپنے فرض سے اچھی طرح سبکدوش نہیں ہو رہے۔ انہوں نے دل میں کہا۔ "صرف روحانی تعلیم سے انسان کی ازلی بھوک نہیں مٹ سکتی۔ دنیا میں رہ کر اُس سے سیر ہو کر روحانی بلندیوں کو طے کرنا صحیح معنوں میں اپنے فرائض کا انجام دینا ہے"۔

دیپک کی چاندنی کو شوجی مہاراج کے بت کے پاس سے آرتی کے طور پر گھمانے کے بعد پروہت جی نے تھالی رکھ دی۔ مونگ سب طرف سے برسنے لگا۔ پردے کے پیچھے سے مونگ کی خفیف سی بارش ہوئی۔ جس کو پروہت نے سہواً راستہ میں آ کر روک لیا اور ذرا پیچھے کو ہٹتے ہوئے بولے۔۔۔

"بھارت سپتری ۔۔۔ اپنی پرجا کے لئے جان تک نچھاور کر دینے والی مہالکشمی ۔۔۔ نمسکار کرتا ہوں۔ آگے آیئے اور ماتھے میں سیندور لیجئے"۔

حسن اور حیا کا ایک مرمریں بت پردے کے پیچھے سے نکلا۔ دو بڑی بڑی مست، شرابی، نیم وا آنکھوں نے پروہت جی کے چہرے کی طرف دیکھا گلاب کا غنچہ چٹخا اور مہارانی جی نے کچھ کہا۔۔۔ آہستگی سے یقین سے اور بھروسے سے ۔۔۔ مگر پروہت جی نے کچھ نہ سمجھا۔ ایک لحہ بعد مہارانی جی نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

مادیت کی اس زبردست قوت سے انہوں نے ابھی زور نہ آزمایا تھا کہ مہارانی جی پروہت جی کے قریب تر آ گئیں۔ جھانجروں کا راگ اِک دفعہ پھر چھڑ گیا۔

راج پروہت نے دل میں یہی اندازہ لگایا۔۔۔ کہ رمتا ایک عورت ہے۔ گلابی پاؤں والی، جس کے حسین پاؤں سے جھانجروں کا راگ بادل کی مانند آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اُس کی دو آنکھیں ۔۔۔ شرابی، مست، نیم وا . . . جن سے ہر طرف پریم کی پھوار پڑ رہی ہو۔

یہ اندازہ غلط تھا۔ راج پروہت کے خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ دیوی تھی، اور وہ کسی ایک فرد کی خاطر اپنی جان سے بھی گذر جانا جانتی تھی۔ وہ محض ایک عورت نہ تھی۔

مہارانی نے عقیدت کے طور پر پروہت جی کے قدموں میں پڑے ہوئے سیندور کا ٹیکا ماتھے پر لگا لیا اور پھول بیل دیو کے بدن پر گرائے۔ ایک دفعہ پھر چاروں طرف سے مونگ برسنے لگا۔ لوگوں نے کہا۔ "ماتا رمتا کی جے"

یہ سچ تھا کہ وہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان عورت ہونے کے علاوہ ۔۔۔ ماتا . . . بھی تھی!

مہارانی جی نے اپنی نیم وا آنکھوں کو ایک دفعہ پھر اوپر اٹھایا ۔۔۔ ان میں سے دو آنسو ۔۔۔ ڈھلی ہوئی عقیدت، پگھلائے ہوئے پریم کے دو قطرے نیچے آ گرے۔

چندیر نے نہایت آہستہ سے گایا۔

"وہ خاموشی کا سماں ۔۔۔ جس پر تکلم ہزار جان سے فدا ہو!
وہ آنکھیں جن میں پریم کے پیازی آنسو گلاب کے رنگ کو شرمائیں!
وہ حیا جو سو ناز و ادا کو پالے ۔۔۔!
وہ موسیقی جو ویرانۂ دل میں کھو جائے ۔۔۔
سب مل کر ہاں سب مل کر مونگے کا دن مناتے ہیں . . ." ایک دفعہ پھر ایک جلن کے ساتھ چندیر نے اپنی انگلیوں کو ستار سے علیحدہ کیا۔ پر پھر راج پروہت نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا ۔۔۔ ذرا دائیں طرف منہ پھیر کر پروہت جی نے پجاری جی کو سنکھ بجانے کا اشارہ کیا ۔۔۔ سنکھ پورنے کے بعد سب رخصت ہوئے۔

(۳)

صبح کے وقت پر پھر راج پروہت شاہی باغ میں گھوم رہے تھے ۔۔۔ اُن کے چہرے سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔ اُن کے چہرے کی افسردگی کو دیکھ کر فضا میں بھی افسردگی پیدا ہو گئی تھی۔ ہمیشہ شرابِ مسرت میں مدہوش چہرے نے اپنے خط و خال کو ایک شاہانہ رعب دا[illegible] صورت دینی مناسب سمجھی۔ انہوں نے اپنے جسم کے تمام عناصر کو ایک عمیق نظر سے دیکھا اور اُن کے دماغ نے فیصلہ کیا کہ وہ خوب صورت ہیں اور اُن کے اعضا سانچے میں ڈھلے ہیں۔

مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں وہ گھبرا گئے۔ خلافِ عادت افسردگی کو جھنجوڑ کر دور کر دینے کی کوشش میں انہوں نے اپنے دل سے کہا۔

"آج باغ کی کلی کلی کیوں خاموش ہو گئی ہے۔ غنچے صبح کی راجکماری کے استقبال کے لئے خندہ پیشانی سے پیش کیوں نہیں آ رہے۔ پانی کی اڑتی ہوئی

پھوار میں دھنک پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ کیا پپیہا کو پی مل گیا ہے کہ اب وہ پی کہاں کی رٹ نہیں لگاتا؟"

چندیر نے آہستہ اور سلجھے ہوئے الفاظ میں پوچھا۔

"پربھو — آپ خاموش کیوں ہیں؟"

"کیونکہ — سب سرشٹی خاموش ہے۔"

"سرشٹی آپ کی خاموشی کی وجہ سے خاموش ہے۔ ورنہ پھول بھی مسکرا رہے ہیں اور دھنک . . . "

"نہیں چندیری بھیا ایسا نہیں ہے"

"نہیں پربھو۔ اسی نظر سے دیکھئے — کہ آپ کا پیا کہاں بستا ہے جہاں وہ بسے گا۔ وہاں . . . وہ جگہ . . . "

راج پروہت جی نے بات کاٹ دی اور گیان کے اس اشارے کو سمجھتے ہوئے بولے —

"ہاں سچ ہے — چندیر! میری خاموشی کی وجہ اور ہے —!"

"کیا ہے پھر؟" چندیر نے پھولوں کی تھالی سنبھالتے ہوئے کہا۔

راج پروہت نے کچھ تامل کے بعد کہا۔

"چندیر — تم یہ کسی کو بتاؤ گے نہیں نا — وعدہ کرو"

"وعدہ کیا — پتا! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا — اگر آپ کی یہی اچھا ہے"

راج پروہت جی نے چاروں طرف دیکھا اور جس طرح ہوا کے زور سے چلنے سے چھوٹے چھوٹے پودے لہراتے ہیں اور ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اسی طرح لرزتے ہوئے انہوں نے چندیر سے کہہ دیا —

"چندیر — میرا تپ ادھورا رہ گیا۔"

چندیر جی دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ جس طرح گلتے ہوئے اس کا قلب یک سوئی اختیار کر جاتا تھا اسی طرح کی یک سوئی سے آنکھوں کو پروہت جی کے چہرے پر گاڑتے ہوئے چندیر نے پوچھا۔

"ادھورا — تپ ادھورا — وہ کیسے؟"

پروہت جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "وہ تخیل — وہ پوجا جس نے مجھ کو — جسے اپنی شانتی پر ناز تھا اس طرح اشانت کر دیا جس طرح بادِ خزاں سوکھے ہوئے پتوں کو دور تک بکھیرنے کے لئے لے جاتی ہے . . . اور پھر بتاؤ — چندیری بھیا! میں کیسے بتاؤں!"

تو اس کے پیچھے سے پجاری جی آ نکلے — اور کہنے لگے "پربھو چلئے مندر میں — لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سب آپ کے درشنوں کو بے تاب ہیں —"

راج پروہت جی آہستہ سے مندر کی طرف چلنے لگے۔ پھولوں کی تھالی کے ساتھ چندیری بھی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ چندیر کو افسوس ہوا کہ راج پروہت جی افسردہ خاطر ہیں۔ اس سے زیادہ وہ اس بات کو جاننے کے لئے بے چین تھا کہ راج پروہت جی کا تپ کیسے ادھورا رہ گیا ہے۔ کندن کی طرح دمکنے والا چہرہ کیا اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ اُن کا تپ مکمل ہے۔ باقی آدمیوں سے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے راج پروہت جی نے چندیر سے کہا۔

"کاش دنیا کو چھوڑنے سے پہلے میں دنیا سے سیر ہو لیتا تا کہ اچھا کبھی پیدا ہی نہ ہوتی۔"

"کیسی اچھا۔؟" چندیر نے آہستگی سے پوچھا۔

پروہت جی چندیر کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے بولے "یہ تو تم جانتے ہو۔ چندیری — مہارانی رمتا۔ ہر ایک فرد کی خاطر اپنی جان تک سے بھی گذر جانا جانتی ہیں۔"

"جی ہاں — اس میں ذرا بھی شک نہیں۔"

"— اور کسی کو بھی اپنے دروازے سے خالی نہیں لوٹاتیں۔"

"نہیں — بالکل نہیں — وہ ہر ایک کی منوکامنا پوری کرتی ہیں۔"

پروہت جی چپ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی رفتار ذرا دھیمی کر دی پجاری جی بہت آگے نکل چکے تھے۔ نہایت چپکے سے پروہت جی نے چندیر کے کان میں کہا — "آہ چندیر! مونگے کے دن کو رمتا کی دو بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے موہت کر لیا ہے۔ میں اُس کے دروازے پر پریم کی بھینٹ . . . "

چندیر کے ہاتھ سے تھالی گر پڑی۔ پھول بکھر گئے۔ پجاری اور اس کے ساتھی بھاگے بھاگے آئے اور پھول زمین پر سے اٹھانے لگے۔ کیونکہ وہ عقیدت کے پھول مہارانی نے اپنے ہاتھ سے پروس کر بھیجے تھے۔ مہارانی نے — جو اُن کی ماتا بھی تھی —!

پھر راج پروہت کے دو آنسو زمین پر گرے۔ جن پر کسی کی نظر نہ پڑی

(۴)

ویسی ہی چاندنی رات تھی۔پکھیرو درختوں پر اپنے گھونسلوں میں اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو لئے سو رہے تھے۔بہار کی ہوا آہستہ آہستہ چل کر آم کی خوشبو کوئل کے دماغ میں پہنچا رہی تھی اور وہ اپنی نیند سے بیدار ہو کر کبھی کبھار کُوکُو کی ایک آواز لگا کر پھر سو جاتی ـــ

چندیر جی مہارانی جی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔رمتا کو معلوم نہ تھا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور متحیر ہو کر کہا۔

"چندیر ـــ تم ہو؟"

"ہاں ـــ ماتا جی"

"آج کی چاندنی رات پرسوں کی چاندنی رات سے بھی زیادہ خوبصورت ہے ـــ آج قدرت گا رہی ہے"

"ہاں ـــ مہارانی جی!"

"سدا بہاری کوئل ـــ تم نہ گاؤ گے کیا ـــ تمہاری ستار کہاں ہے۔دیکھو تمہیں کوئل اُکسا رہی ہے"

"ماتا میں گانے نہیں آیا ـــ میں گناہ کرنے آیا ہوں"

رانی رمتا ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چندیر کی طرف دیکھنے لگیں۔

"حیران کیوں ہو گئی ہو ماتا ـــ مجھے راج پروہت جی نے بھیجا ہے ـــ سندیسا دے کر"

"راج پروہت جی نے ـــ سندیسا دے کر؟"

"جی ہاں"

"کیا سندیسا ہے؟"

"وہ کہتے تھے۔مہارانی۔تم کسی کے بھلے کی خاطر اپنی جان تک بھی قربان کرنا جانتی ہو؟"

"مجھ میں یہ طاقت کہاں ـــ"

"پھر بھی ـــ"

"اچھا تو پھر"

"پھر ماتا ـــ انہوں نے کہا تھا کہ سونگے کے دن تمہاری دو بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے موہت کر لیا ہے ـــ" اور چندیر کے آنسو زمین پر ٹپکنے لگے۔مہارانی نے کچھ افسردہ اور کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"چندیری بھائی ـــ اس میں تمہارا گناہ کیا ہے"

یہی تصور رہے نا ماتا ـــ کہ اپنے بچن کے بس ہو کر اپنی ماتا کو ایک ایسا سندیسا دے رہا ہوں . . . اپراہدی ہوں"

"چندیری ـــ گھبراؤ نہیں ـــ ایشور نے پروہت جی کو آزمائش میں ڈالا ہے۔اگر میں ان کے پریم کا جواب پریم میں نہ دے سکی تو اُن کا تپ نامکمل رہ جائے گا۔وہ سب منزلیں طے کر چکے ہیں۔صرف ایک ہی سبق کی ضرورت ہے ـــ میں اُن کے بھلے کے لئے سب کچھ کروں گی ـــ!"

"ماتا ـــ آپ کا پتی برت دھرم نشٹ ہو جائے گا"

"میں ہندی استری ہوں"

چندیر کے آنسو واپس آنکھوں میں گم ہو گئے۔کسی امید اور آس میں گھر چکنے کے بعد جوش کو دباتے ہوئے چندیر نے کہا۔

"ماتا ـــ تیری سدا ہی جے!"

(۵)

یہ اگلی شب کا ذکر ہے۔راج پروہت مسہری پر لیٹے تھے۔چاند کی چاندنی دریچے سے گذر کر راج پروہت جی کی مسہری پر پڑ رہی تھی۔ زرد رنگ کی جھالر سنہری دکھائی دیتی تھی ـــ اور معلوم ہوتا تھا جیسے پربھو راج پروہت ـــ گزشتہ واقعات پر غور کر رہے ہوں۔

راج پروہت نرم نرم گدگدی مسہری پر بہایت اضطراب کی حالت میں کروٹ پر کروٹ لے رہے تھے۔مسہری کے پاس بڑی کھڑاؤں کے نزدیک بیٹھے ہوئے چندیر نے کہا

"تو پربھو ـــ آپ کا تپ مکمل ہو جائے گا"

"کیا سچ مچ"

ـــ اور راج پروہت مسہری پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔زیادہ توجہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اور کچھ بتاؤ ـــ میرے چندیر ـــ میرے جلے دل پر چندن کا پانی چھڑک دو ـــ"

"ہاں تو ـــ انہوں نے کہا تھا ـــ اپنے منہ سے کہ میں پریم کا جواب پریم میں دوں گی ـــ اور کہا تھا کہ اُن کا تپ ادھورا نہیں رہنا چاہئے"

"یعنی ـــ یعنی ـــ وہ بھی مجھ سے پریم کرتی ہیں . . . مجھے بہشت کی رسائی سے زیادہ سکھ ملا۔چندیر ـــ آخر!"

چندیر کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔گھبراہٹ سے اس نے کہا "اور میں نے دیکھا کہ اُن کی ساڑھی تربتر ہو رہی تھی۔جیسے کسی نے گھڑوں پانی

انڈیل دیا ہو!"

"آنسوؤں سے ــــ میرے لئے وہ . . ."

". . . . "

"کیا یہ سچ ہے یا ایک خواب ہے؟" اور پربھو راج پروہت دریچے میں جا کھڑے ہوئے۔ چاند کی چاندنی نے ہر ایک چیز کو اپنی روپہری اور آرام دینے والی گود میں لے لیا تھا اور ہوا پنکھا کر کے خاموشی کی لوریاں دے رہی تھی۔

"ــــ اور پربھو ــــ انہوں نے بھی پریم سندیسا دیا ہے ــــ وہ کہتی تھیں کہ یہ ایک ناچیز شے ہے جو آپ کے متبرک قدموں کی بھینٹ کی جا رہی ہے" اور چندیر نے تھال راج پروہت جی کے آگے کر دی ــــ تھال پر ایک ڈھکنا تھا جو شاید کسی رکابی کو ڈھک رہا تھا اور اس کے گرد پھول بکھر رہے تھے اور دھوپ مدھم مدھم جل رہا تھا اور اپنی خوشبو کو چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔

"تم نے دیکھا ــــ یہ کیا ہے چندیری ــــ؟" راج پروہت نے حریصانہ انداز سے تھال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں پربھو ــــ مجھے ایسا کرنے سے منع کیا گیا تھا"

اور جس طرح ایک چاندنی رات کو چندیر نے ستار پر سے ایک جلن کے ساتھ اپنی انگلیوں کو اٹھا لیا تھا اور مہارانی کی بے چین آنکھوں سے دو قیمتی موتی ــــ آنسو تحفہ میں چندیر کو دے تھے۔ اسی طرح ایک جلن اور تڑپ کے ساتھ راج پروہت جی نے دریچے کو چھوڑا تاکہ کوئی موتی ــــ کوئی نایاب تحفہ مہارانی رمتا کی طرف سے بھیجا ہوا پا کر اس کا پوجن کیا کریں ــــ

ــــ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے راج پروہت جی نے ڈھکنا اٹھایا اور تھال کو ایک قندیل کے نیچے لے گئے ــــ ایک چیخ سنائی دی۔ چندیر کے ہاتھ سے پھر ایک دفعہ تھال گر پڑا۔ راج پروہت نے زور سے کہا۔

"آہ! آج برسوں کی تپسیا مکمل ہوئی ہے"۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل گئے۔ چندیری ــــ ماتا رمتا کے پجاری ــــ بے ہوش ہو گئے۔

چمکتے ہوئے بلوریں فرش پر بہت سے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ جن پر قندیل کی روشنی اور چاند کی چاندنی مل کر پڑ رہی تھیں اور ان پھولوں کے درمیان پڑی تھیں ــــ دو موٹی موٹی ــــ بے رونق آنکھیں!!!

راجندر سنگھ بیدی

غزل

کیا زندگی ہے فخرِ زمانہ ــ دل عاشقانہ، جی والہانہ
پوچھو نہ ربطِ حسن و محبت! ــ کچھ سب پہ ظاہر، کچھ غائبانہ
یاد آ رہے ہیں اِک ایک کر کے ــ پچھلی محبّت، اگلا زمانہ
دیکھو تو دو ہیں، سمجھو تو یکساں ــ اُن کی کہانی، اپنا فسانہ
دل کو مٹا دے یا حسرتوں کو ــ سمجھوں گا تو نے بخشا خزانہ
آنکھوں سے دل تک آتا ہے کوئی ــ گہ خاص ہو کر، گہ عامیانہ
پھر سن رہا ہوں سونی فضا میں ــ دلچسپ نغمے، دلکش ترانہ
دل ہے کہ مثلِ سیماب لرزاں ــ اُن کی نظر تھی، یا تازیانہ

کیا بات حرماںؔ تیرے سخن کی[1]
جو بات لکھّی، سو شاعرانہ

حرماںؔ خیرآبادی

[1] ذرا تعلّی ہو گئی ہے، ورنہ اصلیت سے بعید بھی نہیں ہے۔

نغمۂ خاموش

وہ نغمہ جو فروزاں ہے سحر کے روئے تاباں میں   وہ نغمہ سو رہا ہے جو شبِ ظلمت کے داماں میں
وہ نغمہ جو گلوں سے پھوٹ نکلا رنگ و بو ہو کر   وہ نغمہ جو رگِ ہستی میں رقصاں ہے لہو ہو کر
وہ نغمہ جس کی خاموشی ہے صحرا و بیاباں میں   وہ نغمہ جس کی رنگینی ہے دامانِ گلستاں میں
وہ نغمہ جس کی لے پر رقص میں خورشید و انجم ہیں   وہ نغمہ جس کی سرمستی سے موجوں میں تلاطم ہیں
وہ نغمہ جو تبسم بن گیا ہے لالہ زاروں میں   وہ نغمہ جو سکوں بن کر چھپا ہے کوہساروں میں
وہ نغمہ جو صبا کی مست رفتاری میں رقصاں ہے   وہ نغمہ جو مہِ پرنور کی کرنوں میں لرزاں ہے
وہ نغمہ جس کو جنگل کی ہوائیں گنگناتی ہیں   وہ نغمہ چاندنی شب کی فضائیں جس کو گاتی ہیں
وہ نغمہ جھولتا رہتا ہے جو خوشبو کے جھولوں میں   وہ نغمہ لے رہا ہے سانس جو مدہوش پھولوں میں
وہ نغمہ جو شفق بن کر عیاں ہے بامِ گردوں پر   وہ نغمہ تیرتا پھرتا ہے جو دریائے میگوں پر
وہ نغمہ گردشِ شام و سحر ہے زیر و بم جس کا   وہ نغمہ سازِ عالم میں ہے سوزِ دمبدم جس کا
وہ نغمہ جو مرے محبوب کی آنکھوں میں خنداں ہے   وہ نغمہ جو مرے محبوب کے چہرے پہ رقصاں ہے
وہ نغمہ وہ سراپا لذت و شیرینی و مستی   وہ نغمہ، آہ وہ روح و روانِ پیکرِ ہستی
وہ روحِ عشق کی سرمستیوں کا جاوداں نغمہ   بہارِ حسن کی رنگینیوں کا گلفشاں نغمہ
وہ نغمہ وہ زمین و آسماں کا دلربا نغمہ   وہ نغمہ بربطِ کون و مکاں کا بے صدا نغمہ
مری ہستی پہ بھی چھایا ہوا ہے آرزو بن کر   سمایا ہے وہ میری روح میں بھی ہائے و ہو بن کر
پلٹ جاتا ہے لیکن آہ! آ آ کر مرے لب تک   رہے گا غرقِ خاموشی یہ نغمہ اے خدا کب تک

مرے لب پر پہنچتے ہی بس اک فریاد ہوتا ہے
یہ نغمہ آ کے میرے شعر میں برباد ہوتا ہے

آثر صہبائی

کمار

(تمثیل کرنے کی اجازت مصنف سے لینی ضروری ہے)

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

ڈرامے کے افراد:

مہیش ـــــ وملا
راج ـــــ کمار

منظر:-

[وملا کمرے کی سجاوٹ میں مشغول ہے۔ سامان کا ایک انبار لگ رہا ہے۔ کوچ، ایک دو کرسیاں، کرسیوں کی گدیاں، کتابیں تصویریں وغیرہ۔ وملا کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چیز کو کمرے میں رکھے اور کس چیز کو باہر نکالے۔ داہنی طرف کی دیوار کا دروازہ سیڑھیوں میں کھلتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دو دروازے اندرونی کمرے میں کھلتے ہیں، بائیں دیوار میں دو الماریاں۔ دروازوں کے شیشوں پر سفیدی کے نشان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کمرے میں سفیدی گویا حال ہی میں ہوئی ہے۔ ایک میز پر ریڈیو کاسیٹ داہنی طرف کے دروازے کے بائیں طرف]

وملا۔ [گھڑی دیکھ کر] اُف صرف بیس منٹ اور ـــ اور یہ سامان!

[سیڑھیوں کی طرف جاتی ہے۔ آواز دیتی ہے] مہیش آتے کیوں نہیں؟ [ٹھہر کر] کیا کر رہے ہو؟

[واپس آتی ہے چند کتابوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ گدیوں کو کرسیوں پر رکھتی ہے۔ مہیش شور مچاتا داخل ہوتا ہے وملا ایک گدی اٹھاتی ہے]

وملا۔ [مہیش کی طرف گدی پھینک کر] یہ رہی تمہاری گدی۔ بڑے چل کر آئے تھے کلکتے سے کام کرنے کے لئے۔

مہیش [ہنستا ہے۔ گدی اٹھا کر ایک کرسی پر رکھتا ہے] کلکتے سے کمرہ تو سجانے آیا ہی تھا۔

وملا۔ [کتابوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے] یوں نہیں کہ جھاڑن لے کر کرسیاں صاف کر دے۔

مہیش۔ اور تم۔ صبح سے تم نے کیا ہی کیا ہے؟

وملا۔ [چند کتابیں اٹھا کر الماری میں رکھتی ہے] کچھ نہیں جناب۔ گھڑی دیکھی آپ نے!

مہیش۔ بہت وقت ہے ابھی۔

وملا۔ [نقل اتار کر] بہت وقت ہے ابھی۔ اٹھارہ منٹ۔ سنا اور اس کمرے کا سامان!

مہیش۔ پھر سے بناؤ تو ویسا مُنہ۔ بھئی سچ جانو تم منہ بنا کر بڑی اچھی لگتی ہو۔

[وملا خاموش رہتی ہے]

یہ کتابیں [ہنستا ہے] دو ٹھا بھی تمہاری داد دے گا۔ کوئی الٹی سیدھی۔ خیال ہی نہیں کہ کیا کر رہی ہو۔

وملا۔ [کتابیں نیچے پھینک کر] خود ہی رکھ لو۔

مہیش۔ چلو جی۔ چھٹی ہوئی اور پھر کہتی ہو کہ اٹھارہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

وملا۔ تم نکل جاؤ اس کمرے سے۔ بکو اس کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں۔

مہیش۔ [کرسی پر بیٹھ کر] میں چلا جاؤں گا۔

وملا۔ تو چلے جاؤ دھمکاتے کسے ہو [اس کے بالوں کو پکڑ کر] کام کرو گے کہ جاؤ گے۔ جلدی بولو جلدی۔

مہیش۔ اوہ۔ چھوڑو بھی۔ میں کروں گا۔

وملا۔ کیا؟

مہیش۔ یہی کام۔

وملا۔ کیا کام؟

مہیش۔ ارے بابا کہہ تو دیا کام۔ یہی نہ کتابیں میز پر رکھ دوں گا۔ تصویریں لگا دوں گا۔

وِملا۔ اور؟

مہیش۔ اور جو کہو گی۔

وِملا۔ [بال چھوڑ کر] ہاں تو اب آئے سیدھے راستے پر۔ اٹھاؤ ان تصویروں کو

مہیش۔ [بال ٹھیک کرتے ہوئے] ایک ہی دیوار میں لگا دوں سب؟

وِملا۔ پھر وہی شرارت۔ تصویریں لگانے کا وقت نہیں رہا۔

مہیش۔ تو دولھا کیا دیکھے گا آکر۔ دیواریں تصویروں سے خالی۔ دری میلی سی کوچ کرائے کے۔ کتابیں پرانی شیشیوں پر سفیدی کے نشان۔ لاؤ جھاڑن صاف کر دوں۔

[شیشے صاف کرتا ہے]

وِملا۔ کوچ کرائے کے۔ شرم تو نہ آئی ہو گی یہ کہتے۔

مہیش۔ شرم کی ایک ہی کہی۔

وِملا۔ بے شرم جو ٹھہرے۔ تم ہی بازار سے لائے نہ ان کو۔ اس سے تو ہمارے کوچ اچھے ہیں۔

مہیش۔ کام کرنے دو مجھے [منہ سے سیٹی بجاتا ہے]

وِملا۔ [میز پر کتابیں رکھتے ہوئے] یہ باجا بند کرو جی!

مہیش۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ گرامر کی کتابیں کیوں رکھ رہی ہو۔ آخر ان کو یہاں رکھنے سے کیا حاصل ہو گا۔

وِملا۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ گرامر کی کتابیں ہیں یا ناول ہیں۔

مہیش۔ ناول [ہنستا ہے] اگر کہو تو منٹوں میں ایسی کتابوں کا ڈھیر لگا دوں۔ ساری کباڑی کی دکان یہاں لے آؤں۔

وِملا۔ آج معلوم ہوتا ہے تم پٹو گے۔

مہیش کلکتے میں آؤ تمہیں وہ وہ کتابیں دکھاؤں کہ بس۔

وِملا۔ بہت دیکھیں تمہاری کتابیں۔ nudism-sex بکواس بکواس سارا دن بکواس۔

مہیش۔ کام کرنے دو گی کہ یوں ہی شور مچاتی رہو گی۔

وِملا۔ تمہارا کلکتے میں رہنا فضول ہے۔ یہاں کے کالج بند نہیں ہو گئے۔ تین سو ڈیڈی کو ملتا ہے۔ سکول کا معاملہ ہے کسی دن جواب مل جائے۔ سو تمہیں چلا جاتا ہے۔ گویا یہ سو ضائع کیا جاتا ہے۔ سنا تم نے بالکل فضول۔ بالکل۔ ڈیڈی کو آنے دو [اور کتابیں اٹھاتی ہے]

مہیش۔ اور تم۔ بہت خوب۔ تمہارا پڑھنا لکھنا بند۔ تھرڈ ایر کافی ہے۔ بی اے بن کر کیا کرو گی۔ ڈیڈی نے تو ایک شہزادہ ڈھونڈھ ہی لیا۔ تم بھی . . .

وِملا۔ [مہیش کی طرف کتاب پھینکتی ہے] بدزبان!

مہیش۔ یہ کتابوں کی قدر ہو رہی ہے۔ ڈیڈی کو آنے دو۔

وِملا۔ پھر کیا ہو گا!

مہیش۔ اب ہم ریڈیو بجاتے ہیں۔

وِملا۔ خبردار!

مہیش۔ آج کا پروگرام . . .

وِملا۔ ہاتھ تو لگاؤ ذرا۔

مہیش۔ مانا کہ تمہیں اسٹریٹیڈ ویکلی نے انعام میں دیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ۔۔ کہ . . .

وِملا۔ میں مطلب وطلب کچھ نہیں جانتی۔

مہیش۔ آج دولھا کو ریڈیو سنائیں گے۔

وِملا۔ وہ پرنس ہے پرنس جناب! اس کے ہاں سینکڑوں ایسی چیزیں ہو نگی

مہیش۔ ہو گا پرنس [وِملا کی طرف جاتے ہوئے] آخر ڈیڈی کو کیا سوجھی وِملا!

وِملا۔ میں کیا جانوں۔

مہیش۔ [وِملا کے ہاتھ سے کتاب چھین کر] یعنی میرا مطلب ہے یہ کارروائی شروع کس طرح ہوئی؟

وِملا۔ [ناراضگی سے] مجھے نہیں معلوم [کوچ پر بیٹھ جاتی ہے]

مہیش۔ بس ختم ہو گیا کام۔

وِملا۔ [جل کر] جی ہاں۔

مہیش۔ میں تو کتابیں دیکھنے آیا تھا

وِملا۔ رکھ لو پھر۔

مہیش۔ اور تم کیا کرو گی۔ ڈیڈی اور ۔۔ اور ہمارے . . . وِملا سچ یہ تو بتاؤ ہم ان کو ملا یا کیا کریں گے؟

وِملا۔ تم تو کلکتے جا کر زیادہ بے وقوف ہو گئے۔

مہیش۔ میرا مطلب ہے جیجا جی یا سرکار۔ آخر شہزادہ جو ٹھہرا۔

وِملا۔ [ہنس کر] سرکار۔

مہیش۔ ہاں میری ننھی اچھی سی بہن اب تو جو ہنس پڑی تو اس کا یہ مطلب ہو کہ تمہاری ناراضگی دور ہو گئی۔ کیوں ہو گئی کہ نہیں؟

وملا۔ نہیں۔

مہیش۔ بڑی ضدی ہو۔

وملا۔ کتابیں رکھو کتابیں ابھی وہ آئے کہ آئے۔

مہیش۔ دیدی سٹیشن پر آدھ گھنٹہ پہلے ہی کیوں چلی گئیں۔

وملا۔ انہی سے پوچھ لینا۔

مہیش۔ ہاں تو دیدی کو بمبئی سے خط آیا کہ ہم تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں ہم ولی عہد ہیں اور بمبئی میں اپنے محل میں رہتے ہیں پھر کیا ہوا؟

وملا۔ تمہیں معلوم تو ہے۔

مہیش۔ بہت کم۔ یہی کہ ہم پی ایچ ڈی ہیں۔ ایم اے ہیں۔ بی اے ہیں۔ یہی کچھ۔

وملا۔ ہاں۔

مہیش۔ پھر دیدی کی طرف سے خط گیا اور یوں کارسس پانڈنس شروع ہو گئی اور پھر جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ اور اگر کوئی ایسا ویسا نکل آیا تو؟

وملا۔ خاموش رہو۔ زبان درازی کی بھی حد ہوتی ہے۔

مہیش۔ لو اور سنو۔ اچھا وملا کمرہ تو یہ سجنے سے رہا اب . . .

وملا۔ [کوچ سے یک دم اٹھ کر] اوہ۔ میں آخر کیا کروں۔ تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔

[پھر کمرے کی سجاوٹ میں مشغول ہو جاتی ہے]

مہیش۔ دیکھو میں تمہیں منٹوں میں کمرہ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔

وملا۔ کر چکے ٹھیک۔

مہیش۔ یہ ریڈیو کہاں رکھا جائے گا؟ [سوچ کر] نہیں پہلے کتابوں کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

[سیٹی بجاتا ہے]

[چند کتابیں ایک طرف کر دیتا ہے۔ جھاڑن لے کر الماری صاف کرتا ہے اور پھر زور سے وملا کی طرف جھاڑن کی گرد اڑاتا ہے۔

وملا ناک پر رومال رکھ لیتی ہے]

وملا۔ بے شرم!

مہیش۔ دیکھا۔ یوں کام ہوا کرتا ہے!

[وملا ایک اور جھاڑن لے کر ریڈیو صاف کرتی ہے]

مہیش۔ [الماری میں کتابیں رکھتے ہوئے] وملا میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارے جیجا جی کی شکل کیسی ہوگی۔

وملا۔ تم سے اچھی ہی ہوگی

مہیش۔ ہاں مجھے اس سے کب انکار ہے مگر ہوگی کیسی؟

وملا۔ ابھی دیکھ لینا۔

مہیش۔ اوہو۔ تم تو سمجھتی ہی نہیں۔

وملا۔ [جیسے کہ سخت ناراض ہے] اچھی طرح سمجھاؤ نا۔

مہیش۔ قیاس لگانے میں کیا ہرج ہے؟

وملا۔ نجومی جو ٹھہرے۔

مہیش۔ ناک تو ضرور چپٹی ہوگی۔

وملا۔ اور قد؟

مہیش۔ چھوٹا۔

وملا۔ اور . . .

مہیش۔ قد کی تو یہ بات ہے کہ دیدی کا قد اور سرکار کا قد ایک برابر ہوگا۔

وملا۔ دیدی اگر یہ باتیں سُن لے!

مہیش۔ پھر کیا ہوگا؟

وملا۔ مرمت!

مہیش۔ مجھے فوراً کلکتے بھیج دیا جائے گا۔ وہ دیکھنا اس اخبار میں ریڈیو کا پروگرام ہے؟

[وملا فرش پر گرے ہوئے اخبار کو اٹھا کر پروگرام دیکھتی ہے]

مہیش۔ اور رنگ وملا؟

وملا۔ دہلی اور بمبئی دونوں کا پروگرام اچھا ہے۔ دہلی سے اُس KP۹۷ کا دوسرا حصہ براڈکاسٹ ہو رہا ہے۔

مہیش۔ سچ! کتنے بجے؟

وملا۔ تم نے ابھی کیا پوچھا تھا۔

مہیش۔ سرکار کا رنگ۔

وملا۔ کام کی بات کرو گے کہ یونہی بکواس کرتے جاؤ گے۔ ہو گیا نداق بلا بلا...

مہیش۔ سُن لیا جناب۔ سُن لیا۔

وملا۔ فوٹو کیوں نہیں دیکھ لیتے۔

مہیش۔ فوٹو! جلدی دکھاؤ۔ کہاں ہے؟

وملا۔ دیدی کے پاس۔

مہیش۔ بکس میں ہوگا!

وملا۔ اور اس میں تالا لگا ہوا ہے۔

مہیش۔ تو تم خوش قسمت رہیں۔

وملا۔ وہ کیونکر؟

مہیش۔ فوٹو جو دیکھ لیا۔

وملا۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔

[مہیش کے ہاتھ سے ایک کتاب نیچے گر جاتی ہے کتاب میں سے ایک لفافہ نکل کر باہر آ جاتا ہے]

مہیش۔ [لفافہ اٹھا کر] یہ خط۔

وملا۔ دیدی کا ہوگا۔ غلطی سے کتاب میں پڑا رہ گیا ہوگا۔

مہیش [مہر دیکھ کر] بمبئی — خوب!

وملا۔ خبردار جو پڑھا۔

مہیش اتنا ہی پرائیویٹ خط تھا تو یوں کیوں پھینکا۔

وملا۔ بھئی خیال نہیں رہا ہوگا۔

مہیش اس خیال کے نہ رہنے کا معاوضہ۔

وملا یعنی؟

مہیش۔ یعنی یہ کہ — کہ . . .

وملا [خط چھیننے کی کوشش کرتی ہے] تمہارا کیا حق ہے کہ اس خط کو پڑھو

مہیش میں پڑھنے کب لگا تھا؟

وملا۔ کوشش تو یہی کر رہے تھے۔

مہیش۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ سرکار نے اخبار کا اخبار ہی لکھ مارا۔ [لفافہ میں سے خط نکالتا ہے۔ ایک چھوٹا سا فوٹو نیچے گر پڑتا ہے]

مہیش [خوش ہو کر] فوٹو [وملا آگے بڑھ کر جلدی سے فوٹو اٹھا لیتی ہے]

وملا۔ کیوں جی اب بولو!

مہیش۔ ذرا دکھاؤ نا۔

[دونوں کوچ پر بیٹھ جاتے ہیں]

وملا۔ ناک چپٹی!

مہیش۔ دیکھا میرا نجوم!

وملا اور رنگ کالا!

مہیش۔ تم تو ٹھہریں بے وقوف!

وملا [اٹھتے ہوئے] اور جناب . . .

مہیش کبھی فوٹو سے بھی رنگ کا پتہ لگا ہے۔

وملا۔ یہ میرا نجوم ہے۔

مہیش۔ ہاں تو یوں کہو نا۔

[ایک تانگہ کے گزرنے کی آواز آتی ہے۔ وملا اور مہیش دونوں چونک اٹھتے ہیں]

وملا۔ آ گئے!

مہیش۔ وملا جلدی کرو۔

[کمرے میں گویا ایک سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ چند تصویروں اور کتابوں کو کوچ کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ دری کو ٹھیک کیا جاتا ہے مہیش دیوار میں تصویر لٹکانے کی کوشش کرتا ہے کیل اتر جاتی ہے اور تصویر نیچے گر جاتی ہے شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے]

وملا۔ [غصے میں] توڑ دیا نا بے وقوف!

مہیش۔ تانگہ شاید آگے نکل گیا [شیشے کے ٹکڑے اٹھاتا ہے]

وملا۔ کمرہ تو ٹھیک ہو گیا۔

مہیش۔ خاک ٹھیک ہوا۔ جان ہی تو نکل گئی تھی۔

وملا۔ کہتی نہ تھی ان تصویروں کو رہنے دو۔

مہیش۔ خیر [ٹکڑے اٹھا کر] انہیں رکھوں؟

وملا۔ [کوچ پر بیٹھ کر] رکھ دو کوچ کے نیچے۔

مہیش۔ [میز پر رکھ کر] ہاں وہ فوٹو [کتاب میں لفافہ رکھتا ہے اور کتاب الماری میں رکھ دیتا ہے]

وملا۔ [جمائی لے کر] تھک گئے!

مہیش۔ جی ہاں بہت کام کیا جو تھک گئے۔

وملا۔ صفائی کس نے کی؟

[ایک تانگہ کے رکنے کی آواز آتی ہے]

وملا۔ [کوچ سے اچھل کر شیشے کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتی ہے] ان کو تو اٹھاؤ۔

مہیش۔ میز کی طرف بڑھتے ہوئے] رکھوں کہاں؟

وملا۔ [چلا کر] رکھوں کہاں رکھوں کہاں۔ یہ بھی رکھنے کی چیز ہے!

[وملا جلدی سے ٹکڑے اٹھا کر الماری میں رکھ دیتی ہے۔ مہیش دروازے کی طرف بڑھتا ہوا پھر واپس لوٹ آتا ہے]

مہیش۔ اب تو واقعی آ گئے۔

وملا۔ [دروازے کے ایک شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر بال ٹھیک کرتی

ہوئی] ڈیڈی اکیلی ہی آئیں یا . . .

[راج اور کمار داخل ہوتے ہیں۔ راج کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ کوئی بہت مغموم اور پریشان ہو مگر ظاہر نہ ہونے دے نقش اچھے۔ آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے۔ جب کمرے میں داخل ہوتی ہے تو چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ۔ جیسے کوئی زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کمار کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس۔ رنگ کالا سا، ناک چپٹی۔ لب ذرا موٹے۔ ماتھا چوڑا۔ قد درمیانہ۔ کپڑے بہت اچھے نہیں مگر باوجود ان باتوں کے کچھ عجیب کیریکٹر کا انسان معلوم ہوتا ہے دوران گفتگو میں اپنا ہاتھ سر پر پھیرتا رہتا ہے۔ پھر وہی ہاتھ ٹائی کی ناٹ [KNOT] پر جا پڑتا ہے۔ ہیش اور وملا کمار کو دیکھ کر کچھ حیران کچھ مایوس گویا عجیب حالت میں نظر آتے ہیں]

راج۔ وملا!

وملا۔ اوہ ڈیڈی۔ آگئیں [کمار کو دیکھ کر ہیش کی طرف دیکھتی ہے]

کمار۔ ہوں۔ [کمرے کے چاروں طرف دیکھ کر] یہ مکان جلد بدلنا ہوگا [سوٹ کیس نیچے رکھ کر] دیواریں [پھر وملا کی طرف بڑھتا ہے] آپ۔ خوب [ہنستا ہے]

راج۔ وملا میری چھوٹی بہن؛ اور ہیش میرا چھوٹا بھائی!

کمار۔ بہت خوب بہت خوب [ہاتھ ٹائی کی KNOT پر جاتا ہے] تم ہیش اور تم [وملا کا بازو پکڑ کر] وملا اور آپ۔ ہاں مگر یہ مکان بدلنا ہوگا

ہیش [بے رخی سے] اور آپ [راج ہیش کی طرف گھور کر دیکھتی ہے]

راج۔ ان دونوں میں کوئی ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ دن بھر لڑتے رہتے ہیں

ہیش۔ ہم تو نہیں لڑتے ڈیڈی۔ سرکار دیکھئے . . . .

کمار۔ سرکار! ہم ہی State میں نہیں اس وقت [راج سے] آپ نے شاید . . .

راج۔ [مسکرا کر] انہیں معلوم ہے۔

وملا۔ [بازو چھڑا کر] آپ بیٹھئے تو سہی۔

کمار [اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر] تم بہت اچھی ہو کس کلاس میں پڑھتی ہو؛ ہم تمہیں ولایت بھیج دیں گے۔ کیوں راج جی آخر حرج ہی کیا ہے؟

راج۔ [مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے] کیا حرج ہے۔

ہیش۔ [کمار کے لباس کی طرف دیکھ کر] آپ لباس تبدیل کیجئے گا۔ سفر کی . . .

کمار۔ ہاں۔ لباس۔ ضرور۔ ہاں راج جی میں راستے میں کیا کہہ رہا تھا یہی نا لباس کے متعلق۔ کچھ لایا ہی نہیں ساتھ۔ آخر لاتا بھی کس طرح!

ہیش۔ تو۔ تو آپ . . .

کمار۔ تم جانو Uncle اس بات سے ناراض ہیں کہ میری شادی ایک ایسی لڑکی سے ہونے والی ہے جو Princess نہیں۔ چپکے سے چلا آیا اور Uncle کی جائیداد کا مالک میں تھا راج سے تو میرا تعلق ہی نہیں۔ بالکل۔ مجھے ریاست کی ضرورت نہیں۔ سنا۔

ہیش [دبی زبان میں] جی!

کمار۔ کیا کہا تم نے؟ ہاں تم کیا کرتے ہو؟

راج۔ کلکتے میں پڑھتا ہے۔

وملا۔ بی اے کا امتحان دے گا۔

کمار۔ مگر کلکتہ کیوں؟

ہیش۔ Scholarship جو ملتا ہے۔

کمار۔ جب میں نے لندن میں ایم اے کا امتحان دیا تو فرسٹ نکلا۔ مجھے پچاس پونڈ کا انعام ملا۔ مگر مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ آخر اتنا روپیہ لے کر کیا کروں۔ یہ پچاس پونڈ تو ہسپتال میں دے دئیے۔

ہیش۔ بہت اچھا کیا آپ نے۔

کمار۔ تم تو بی اے کے بعد جرمنی جا سکتے ہو۔ بھیج دوں گا کیوں راج جی!

[راج خاموش رہتی ہے]

ہیش۔ جرمنی!

کمار۔ جرمنی اور کیا Hitler کو میں جانتا ہوں۔ سنا Hitler کو۔ Papermaustry تمہارے لئے بہت موزوں رہے گی۔

راج۔ [ہنس کر] آپ نے تو ابھی سے ساری سکیم سوچ لی۔

کمار۔ Uncle سے یہی تو جھگڑا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں سکیم سوچنے سے پہلے ان سے ذکر ہو جایا کرے۔ مجھ سے یہ ہو نہیں سکتا اور ہو بھی کیونکر Uncle پرانے خیالات کے آدمی ٹھہرے۔ میں دنیا کا ہر گوشہ دیکھ چکا ہوں۔

ہیش۔ [شرارتاً] افغانستان گئے آپ؟ [راج پھر ہیش کی طرف گھور کر دیکھتی ہے]

کمار۔ (ہنس کر) دو دفعہ۔ اور میرا مان اللہ کے پاس ہی ٹھہرا۔

راج آپ تھکے ہوئے ہیں، باقی باتیں پھر کر لیجئے گا۔ کچھ . . .

کمار۔ (مہیش کی طرف بڑھتے ہوئے) وہاں سے ایک ہتھیار لایا جو آج سے سو سال پہلے کسی لڑائی میں استعمال کیا گیا تھا۔

وملا۔ گرم پانی بھی تیار ہے دیدی!

مہیش ہتھیار کا نام؟

کمار۔ یہی ہتھیار (سر پہ ہاتھ پھیر کر) یہی — آخر کچھ نام ہو گا ہی نا۔ ہمیں نام سے کیا مطلب۔ دیکھ ہی لو گے۔ میرے محل میں وہ وہ چیزیں ہیں جنہیں انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

مہیش۔ (جیسے کہ کمار کی باتیں بہت شوق سے سن رہا ہے) مثلاً؟

کمار۔ ایک ایک تصویر دس دس بیس بیس ہزار کی اور یہ دیواریں (راج سے) آپ کو تصویروں کا شوق نہیں۔ ہو جائے گا (مہیش سے) اور تمہیں؟ (پھر وملا سے) اور تمہیں؟ اوہ . s Oriental Painting!

مہیش مجھے تو ہے۔

وملا (راج کی طرف دیکھ کر۔ کمار سے) غسل کیجئے گا۔

کمار۔ غسل (ہنستا ہے) راج جی آپ خاموش کیوں ہیں۔ میری باتیں شاید پسند نہیں۔

راج۔ (زبردستی ہنسنے کی کوشش کرتی ہوئی) پسند کیوں نہیں۔ مگر آپ پہلے غسل کیجئے۔ منہ ہاتھ ہی دھو لیجئے۔ کچھ کھائیے۔ پھر باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔

کمار ٹھیک کہتی ہیں آپ (ریڈیو دیکھ کر) آہا ریڈیو!

مہیش آج کا پروگرام بڑا اچھا ہے۔ سنئے گا؟

کمار۔ میرے ہاں چار ریڈیو سیٹ ہوں گے۔

راج آئیے (دروازے کی طرف جاتی ہے)

کمار۔ تو آپ سب موسیقی کا شوق رکھتے ہیں (راج اور کمار دونوں اندرونی کمرے کے دروازے سے جاتے ہیں)

(مہیش دروازے کی طرف جاتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ برابر کے کمرے میں نہیں، وملا کے قریب آ جاتا ہے)

مہیش۔ وملا!

وملا۔ (آہستہ سے) مہیش!

مہیش یہ دیدی نے کیا کیا!

وملا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟

مہیش۔ ہو گا معمولی سی ریاست کا پرنس مگر شکل . . .

وملا۔ شکل سے تو نظر نہیں آتا۔

مہیش۔ دیدی نے کسی سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔

وملا۔ ہمارا ہے ہی کون کس سے پوچھتیں!

مہیش۔ خود بمبئی چلی جاتیں۔ مجھے ہی بھیج دیتیں۔

وملا۔ آخر دیدی نے کچھ سوچا ہی ہو گا۔

مہیش۔ فضول باتیں نہ کیا کرو۔ اس میں سوچنے کی بات ہی کیا تھی!

وملا۔ اچھا ذرا آہستہ بولو۔ دیدی نے سن لیا تو خیر نہیں۔

مہیش۔ سن لیں پھر۔

وملا۔ اوہو۔ آج تو بڑے دلیر بن بیٹھے۔

مہیش۔ خیر ان باتوں کو جانے دو۔ باتیں تو خوب کرتا ہے۔

وملا۔ تمہیں جرمنی جو بھیجے گا۔

مہیش۔ اور تم انگلینڈ جو جاؤ گی۔ مگر کرو گی کیا؟

وملا۔ کپڑے تک نہیں لایا۔

مہیش۔ ہاں دیکھو نہ کپڑے تک نہیں لایا۔

وملا۔ مگر اس نے بتا تو دیا کہ چپکے سے چلا آیا۔

مہیش۔ اس سے نہ آتا اچھا۔

وملا۔ اب جب تک اور کپڑے نہ ہیں وہ باہر جا بھی نہیں سکتے۔

مہیش۔ اور پھر شادی۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ دیدی نے کیا کیا اور اب کیا کرے گی۔

وملا۔ کپڑے جو پہن رکھے ہیں وہ بھی تو کچھ عجیب ہی سے ہیں۔

مہیش۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا۔ مگر اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟

وملا۔ چھوٹا سا تو ہے۔ کپڑے تو ہوں گے نہیں اس میں۔

مہیش۔ کپڑے کہاں سے آئیں گے۔ کھول کر دیکھیں!

وملا۔ اور اگر کمار آ گیا؟

مہیش۔ آ جانے دو۔ ہم کہیں گے اٹھانے لگے تھے کھل گیا۔

وملا۔ اور اگر دیدی آ گئیں؟

مہیش۔ تو تم اس کمرے سے چلی جاؤ۔ میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

وملا۔ اور اگر اس میں تالا لگا ہو پھر؟

مہیش۔ پھر کوئی اور چابی لگا کر دیکھیں گے۔

ولا۔ تو کھولو۔ میں دروازے کے پاس کھڑی رہتی ہوں۔ آواز سن کر تمہیں اشارہ کر دوں گی۔

[ولا دروازے کے قریب کھڑی ہو جاتی ہے۔ سوٹ کیس میں شاید تالا نہیں لگا تھا جو دبانے سے ہی کھل گیا]

مہیش۔ ولا ذرا آنا۔ یہاں کی بھی چیزیں دیکھ لو۔

[ولا اب سوٹ کیس کے قریب بیٹھ جاتی ہے]

مہیش۔ [ایک تولیا نکال کر] ایک تو رہا یہ تولیا۔

ولا۔ مہیش اسے بند ہی کر دو۔ شاید انہیں تولئے کی ضرورت ہو۔ مگر یہ کتابیں کیسی ہیں!

مہیش۔ سب کچھ دکھا دیتا ہوں۔

[مہیش کتابیں نکال رہا ہے کہ راج داخل ہوتی ہے۔ ولا سہم سی جاتی ہے۔ مہیش کتابیں رکھ دیتا ہے]

راج۔ مہیش یہ کیا کر رہے ہو؟

مہیش۔ [سوٹ کیس بند کرتے ہوئے] کچھ نہیں۔ ایسے ہی [خاموش ہو جاتا ہے]

راج۔ ایسے ہی کیا! شرم تو نہ آئی ہو گی یہ کہتے۔ ولا!

ولا۔ [راج سے لپٹ کر] دیدی!

مہیش۔ دیدی، آپ اتنی اداس کیوں ہیں؟

راج۔ اداس! میں کیوں اداس ہوں گی؟

مہیش۔ آپ چھپاتی کیوں ہیں دیدی۔ آپ نے کیا۔ آپ نے کیا سوچا، دیدی

[راج خاموش سر نیچا کئے سوٹ کیس لے کر جاتی ہے۔ مہیش ریڈیو کی طرف جاتا ہے۔ ولا الماری کھول کر کتاب دیکھتی ہے۔ مہیش ریڈیو ٹیون (TUNE) کرتا ہے۔ گھوں گھوں اور اس قسم کی مختلف آوازیں آتی ہیں]

ولا۔ [مہیش کی طرف مڑ کر] مہیش!

مہیش [ریڈیو بند کر کے] دیکھا تم نے۔ دیدی کتنی اداس ہیں!

ولا۔ رنگ ہی بدل گیا ہے۔

مہیش اب کیا کریں گی!

ولا۔ شادی۔

مہیش۔ Civil marriage

ولا۔ مگر کب!

مہیش۔ یہ تو دیدی ہی بتا سکیں گی۔

ولا۔ دیکھا جب تم نے سرکار کہا تو انہیں غصہ آ گیا۔

مہیش۔ اونہہ [ریڈیو ٹیون (TUNE) کرتا ہے] غصہ آ گیا۔ بالکل

[ریڈیو سے گانے کی آواز آتی ہے۔ پھر گھوں گھوں]

ولا۔ بند کر دو!

مہیش۔ کیوں؟

[کمار داخل ہوتا ہے۔ چہرے میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ شاید منہ دھونے یا نہانے کا اثر ہو]

مہیش۔ آپ بڑی جلدی نہا لیتے ہیں۔

کمار [ہنس کر۔ سر پر ہاتھ پھیرتا ہے] نہایا کہاں۔ اس طرح نہانے کی عادت ہی نہیں۔ میرا غسل خانہ دیکھو تو تمہیں معلوم ہو۔

مہیش۔ کہئے تو کل سے کچھ اور انتظام کر دیں۔

کمار۔ ہاں ہاں ہو جائے گا۔ یہ مکان تو بدلنا ہی ہو گا [میز سے اخبار اٹھاتے ہوئے] اگر یہ معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں بیسیوں لوگ ملنے آ جائیں گے اور میں ملنے سے کتراتا ہوں۔ سنا۔ کسی سے کہہ نہ دینا۔

مہیش۔ جی نہیں۔

ولا۔ [ریڈیو کی طرف جاتے ہوئے] مگر کبھی نہ کبھی تو معلوم ہو ہی جائے گا۔

کمار۔ [بے پروائی سے] ہونے دو۔ ہاں تو آج کا پروگرام۔

مہیش۔ جی ہاں بہت اچھا ہے۔

[راج داخل ہوتی ہے]

راج۔ [مسکرا کر] ریڈیو

ولا۔ دیدی وہ جو چند دن ہوئے ایک ڈراما Broadcast ہوا تھا نا۔ اس کا دوسرا حصہ آج ہو گا۔

راج۔ وہ تو بڑی اچھی چیز تھی۔ مگر میں کچھ بھول سا گئی ہوں۔

مہیش۔ [ریڈیو ٹیون (Tune) کرتے ہوئے] واہ اتنی جلدی بھول بھی گئیں!

ولا۔ دیدی میں بتاؤں کیا تھا!

راج۔ [کمار سے] آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟

کمار۔ پروگرام ہی دیکھ رہا تھا [توقف] ہاں ابھی میں مہیش سے کہہ رہا تھا اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں سینکڑوں لوگ مجھ سے ملنے آ جائیں گے۔

راج۔ [مہیش کی طرف دیکھ کر] نہیں جی مہیش کیوں کہے گا۔ مگر

کمار۔ [اخبار میز پر رکھ کر اور راج کی طرف عجیب طرح دیکھ کر] کیا!

راج ۔ [کچھ سہم کر] سٹیشن پر بھی دو آدمی . . .

کمار۔ [جلدی سے] دو آدمی کیا؟

راج ۔ آپ سے شاید ملنا چاہتے تھے ۔ آپ نے دیکھا نہیں؟

کمار۔ میں نہیں جانتا کون تھے ۔

راج ۔ آپ کو یاد نہیں ایک تانگہ ہمارے پیچھے آرہا تھا ۔ وہ مکان کے آگے سے نکل گیا ۔

کمار۔ [گھبرا کر ۔ مگر گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے] مجھے نہیں معلوم ۔ مجھے کچھ یاد نہیں ۔ کیسے دو آدمی؟ کون تھے وہ؟ کیا پہن رکھا تھا انہوں نے؟ شکلیں کیسی تھیں؟

[کمرے میں چکر لگاتا ہے ۔ پھر ٹھہر کر اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر]

اب لوگ چاہتے ہیں ۔ میں برقع پہن کر نکلا کروں ۔ واہیات ۔ بالکل واہیات ۔ سمجھتے نہیں میں کتنا مصروف آدمی ہوں ۔

راج ۔ [اس افسوس میں کہ اس نے یہ بات شروع ہی کیوں کی ۔ بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے] ہاں وملا وہ ڈراما! کیا تھا؟

کمار۔ ڈراما! کیسا ڈراما! مجھے اس وقت ریڈیو کی ضرورت نہیں ۔

راج ۔ اس سے شاید آپ کی گھبراہٹ . . .

کمار۔ گھبراہٹ! آپ کے خیال میں میں گھبرا گیا تھا [ہنس کر] بمبئی میں سینکڑوں آدمی مجھ سے ملنے کے لئے گھنٹوں میرا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔ میں پھر بھی نہیں گھبراتا ۔ سمجھیں آپ [مہیش سے] ہاں جی ریڈیو!

[مہیش پھر ریڈیو tune کرتا ہے]

مہیش ۔ وملا اخبار دیکھنا ۔ کتنا وقت باقی ہے؟

وملا ۔ [اخبار اٹھاتے ہوئے] ڈرامے کا وقت ۔

کمار۔ ڈراما ہے کیا! لکھا کس نے؟

وملا ۔ کوئی پراشر ہے ۔ مہیش ابھی دو منٹ باقی ہیں ۔

[اس وقت ریڈیو سے کچھ گلنے کی آواز آتی ہے]

کمار۔ [گھبرا کر] پراشر! پراشر میرا . . .

راج ۔ آپ کا دوست ہے ۔

کمار۔ دوست ہاں ۔ نہیں جی میرا نوکر تھا ۔ سو روپے لیا کرتا تھا ۔ نکال دیا اس کو ۔ ممکن ہے یہ کوئی اور ہو مگر [پھر سوچ کر] اس نے لکھا کیا ہوگا ۔

وملا ۔ پہلا حصہ تو یوں تھا کہ ایک آدمی جو خود کو بہت امیر ظاہر کرتا ہے ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرتا ہے ۔ وہ لڑکی اس خیال سے شادی کر لیتی ہے کہ وہ یوں اپنے غریب والدین کا سہارا ہو جائے گی مگر بعد میں . . .

کمار۔ مگر بعد میں یہ معلوم ہوا کہ وہ آدمی غریب تھا اور شاید بدمعاش بھی ۔

وملا ۔ جی ۔

کمار۔ [زور سے قہقہہ لگا کر] کبھی ایسا بھی ہوا ۔ ناممکن ۔ خیر ۔

وملا ۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی وہ تین شادیاں پہلے بھی کر چکا ہے اور پولیس اس کے پیچھے ہو جاتی ہے ۔

کمار۔ [پھر قہقہہ لگا کر] پولیس! بھلا پولیس اس بات میں کیوں دخل دیگی ۔ وہ تین شادیاں تو کیا دس شادیاں کر سکتا تھا ۔ یہ پراشر کوئی اور ہوگا ۔ میرا نوکر تو . . .

راج ۔ جی ہاں کوئی اور ہوگا ۔

[ریڈیو سے Delhi calling کی آواز آتی ہے پھر گھوں گھوں اور پھر ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے بادل گرج رہے ہوں]

مہیش ۔ وملا لیمپ بجھا دو ۔

راج ۔ وہ کیوں؟

مہیش ۔ دیدی ریڈیو سننے کا مزا ہی یوں آتا ہے ۔ بتی بجھی ہو اور گانا ہو رہا ہو ۔

راج ۔ کوئی ضرورت نہیں لیمپ بجھانے کی ۔

مہیش ۔ [التجا آمیز لہجے میں] دیدی!

کمار۔ کیا ہرج ہے ۔

[وملا یہ اشارہ پا کر لیمپ بجھا دیتی ہے ۔ چند لمحے کمرے میں خاموشی ۔ مگر ریڈیو سے ویسی ہی آوازیں آتی ہیں اور پھر پستول چلنے کی آواز اور دو تین چیخیں]

کمار۔ اوہ!

راج ۔ یہ کیا ہوا؟

وملا ۔ اوہ دیدی!

مہیش ۔ خاموش رہیئے ۔ سنئے ۔

ایک لڑکی کی آواز [ریڈیو سے] بد معاش تم سمجھتے تھے مجھے مار کر میرا زیور لے بھاگو گے اور پھر میری بہن . . .

آدمی کی آواز۔ تو تم سمجھتی ہو تمہاری چھوٹی بہن نے تمہیں بچا دیا۔ تم بچ کر نکل جاؤ گی۔ اونہہ میں کچی گولیاں نہیں کھیلا۔

پہلی آواز۔ میں شور مچا دوں گی اور تم پکڑے جاؤ گے۔

دوسری آواز۔ شور مچا دو گی۔ میں گلا نہ گھونٹ دوں گا۔ پہلے بھی تو شور مچانے لگی تھیں۔

کمار۔ اوہ میرا دل!

راج۔ آپ۔ ہیش بند کرو۔ وملا! [ریڈیو بند کر دیا جاتا ہے]

کمار۔ میرا دل!

راج۔ وملا۔ لیمپ کیوں نہیں جلاتی۔ جلدی کر۔

ہیش۔ کیا ہو جی؟

کمار۔ آہ میرا دل!

[وملا لیمپ جلاتی ہے۔ کمار اپنا سر کرسی کے پیچھے لٹکائے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے دبائے نظر آتا ہے۔ راج۔ کمار کی طرف دوڑتی ہے۔ ہیش اور وملا قریب آ جاتے ہیں]

راج۔ [کمار کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر] ہیش ڈاکٹر۔

کمار۔ نہیں۔ ضرورت نہیں۔

وملا۔ آخر ہوا کیا؟

کمار۔ [کچھ سنبھل کر] کچھ نہیں ایسے ہی کبھی کبھی دل میں درد سا شروع ہو جاتا ہے۔

راج۔ [فکرمندی سے] کبھی پہلے بھی ہوا؟

کمار۔ ہو جایا کرتا ہے۔ مگر آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔

ہیش۔ اب کیا حال ہے؟

کمار۔ [اٹھ کر] اچھا ہوں [سر پہ ہاتھ پھیر کر] اندھیرے میں ذرا گھبرا جاتا ہوں۔

راج۔ کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔

کمار۔ ایک ڈاکٹر۔ بیسیوں ڈاکٹروں سے پوچھ چکا ہوں۔ انگلینڈ گیا تو وہاں پوچھا۔ جرمنی، فرانس، دنیا کا کوئی جگہ چھوڑی ہی نہیں۔

راج۔ اور کوئی علاج نہیں کر سکا؟

کمار۔ مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں یہ درد صرف چند لمحے ہی رہتا ہے۔

اب بالکل ٹھیک ہوں۔

ہیش۔ [ریڈیو کی طرف جاتے ہوئے] شروع کروں!

کمار۔ کیا واہیات سی چیز لے بیٹھے ہو۔

وملا۔ آپ کو شاید پسند نہیں؟

کمار۔ گانا ہو تو بات بھی ہے۔

وملا۔ [کچھ مایوس ہو کر] آپ کو شاید گانے سننے کا زیادہ شوق ہے۔

کمار۔ [ہنس کر] میں خود بھی گا سکتا ہوں یعنی میرا مطلب ہے گانا اور پھر لفظوں کا مطلب اشاروں سے ادا کرنا۔

راج۔ پھر تو ہم ضرور سنیں گے۔

وملا۔ اور ہم بھی۔

کمار۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

[ہیش ریڈیو کے قریب ہی کھڑا رہتا ہے کمار فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور گاتا ہے:۔

بلما لال چنریا رنگائے دے

اور پھر زور سے:۔ بلما لال چنریا رنگائے دے

اور اب آہستہ۔ التجا آمیز لہجے میں:۔ لال چنریا رنگائے دے بلما دمنہ بنگلی
بلما رنگائے دے]

راج۔ بہت اچھا [خوش ہو کر] آپ تو کمال کرتے ہیں۔

وملا۔ تعجب ہے آپ یہ سیکھ کس طرح گئے۔

کمار۔ [اٹھ کر] اسی لئے تو کہتا ہوں۔ سینکڑوں آدمی ملنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کوئی سائنس پر بحث کرنا چاہتا ہے۔ کوئی موسیقی پر کوئی کچھ کوئی کچھ۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔

ہیش۔ بھئے اب میں ریڈیو شروع کرنے لگا ہوں۔

راج۔ کیا فایدہ۔ نہ معلوم اب کیا سین ہو گا

ہیش۔ دیکھیں تو سہی کیا ہو رہا ہے۔

راج۔ بڑے ضدی ہو۔

ہیش۔ دیدی!

[ہیش ریڈیو ٹم ٹا کرتا ہے اور وملا پھر لیمپ بجھا دیتی ہے]

راج۔ [زور سے] یہ کیوں بجھا دیا وملا؟

وملا۔ ابھی ابھی جلا دوں گی۔ صرف ایک منٹ۔

راج۔ جلدی جلاؤ۔

وملا۔ ڈیڈی چپ

(ریڈیو سے)

دوسری آواز۔ تین شرطیں تین۔ صرف تین

پہلی آواز۔ میں کوئی شرط سننے کے لئے تیار نہیں ہیں کافی ذلیل ہو چکی ہوں۔ والدین کے سامنے۔ دوستوں کے سامنے۔

دوسری آواز۔ ذلیل ہو چکی ہوں! ابھی ذلیل ہو گی۔ تم لڑکیاں امیر آدمی چاہتی ہو۔ امیری۔ [illegible] ولایت ہو آیا ہو۔ انسان نہیں دیکھتیں۔

پہلی آواز۔ شیلا تو اس کمرے سے چلی جا۔ میں دیکھوں گی . . .

دوسری آواز۔ آخر جائے گی کہاں۔ ابھی نہیں۔ پہلے میری تین شرطیں پہلی یہ کہ تمہارے سب زیور۔ دوسری تمہاری بہن شیلا۔ اور تیسری تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط کہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ سنا۔ تین شرطیں۔ صرف تین اور پھر . .

پہلی آواز۔ ایک بھی . . .

کمار۔ لیمپ جلاؤ۔ لیمپ۔ میرا دل! آہ میرا دل!! [ریڈیو پھر بند کر دیا جاتا ہے]

راج۔ [گھبرا کر] وملا!

[وملا لیمپ جلاتی ہے۔ کمار ایک کونے میں سر جھکائے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے دبائے کھڑا ہے]

راج۔ [کمار کو پکڑ کر] پھر وہی درد؟

کمار۔ [غصے میں] توڑ دو اس ریڈیو کو۔ لیمپ کیوں بجھایا تھا؟

راج۔ وملا کیوں لیمپ بجھایا تھا؟ بولتی کیوں نہیں؟ مہیش!

[کمار کمرے میں ٹہلتا ہے۔ دروازے پر کھٹکھٹاہٹ]

مہیش۔ کوئی آیا ہے۔

[وملا باہر جاتی ہے]

کمار۔ [ٹھہر کر] کون!

راج۔ کوئی ہو گا۔

کمار۔ [کچھ گھبرایا ہوا نظر آتا ہے] اس وقت کون آسکتا ہے؟

[پھر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے]

راج۔ مہیش تم جاؤ۔ دیکھو کون ہے۔

[وملا گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے]

راج۔ وملا!

وملا۔ ڈیڈی پولیس!

کمار۔ [ٹھہر کر] کیا؟

وملا۔ آپ کو پوچھتے ہیں۔

راج۔ وملا؟

کمار۔ [گھبرا کر] مجھے؟

وملا۔ جی!

کمار۔ کیوں بتایا تم نے [illegible]

[جوش [illegible]

میر [illegible]

غزل

منصور بھائی کو سلام

چھ ماہ علالت اور حادثات کی نذر ہوئے، داہنے ہاتھ کا انگوٹھا بیکار ہوگیا۔ اعصاب خراب ہو گئے ہیں عشق تو فراموش ہو چکا ہے۔ عبرت کا جوش باقی ہے۔ آپکے سالنامے کے لئے کیا عرض کروں۔ نادم ہوں۔ شعر و شاعری دل ٹھکانے ہو تو ہو سکے۔ گزشتہ مئی میں ریاست ٹونک کے علم پرور سخن سنج فرمانروا کے محل میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت بھی شہریار ٹونک نے خود ہی فرمائی۔ مجھے بھی شریک ہونے کا شرف بخشا گیا تھا۔ ملک کے ... اساتذہ بھی موجود تھے۔ ڈرتے ڈرتے ...ل میں نے بھی پڑھی تھی وہ حاضر ہے۔ ابھی تک رسائل کی دست برد سے محفوظ ہے۔ پسند ہو تو چھاپ لیجئے۔

حفیظ

ا...ا کے شائع کرنے میں ہمارے لئے مسرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس پر حضرت حفیظ کو دربار ٹونک سے ملک الشعراء حسان الملک بہادر کا خطاب

صور احمد

ن کو سخن کی تاب نہیں سخن ہے نالۂ دل نغمۂ رباب نہیں

ت شباب نہیں تو حشر میرے لئے وجہِ اضطراب نہیں

گا میری یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

اسے یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

پردہ وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

ئے میں کامیاب نہیں ہاں میں کامیاب نہیں

خدا کا شکر ہے نیّت مری خراب نہیں

تو کیوں کہوں کہ میں ذرّہ ہوں آفتاب نہیں

ہئے جناب حفیظ

ِ خطاب نہیں

حفیظ جالندھری

کیفِ امروز

(ساحل راس کماری کی ایک موج کے نام)

وہ جانِ آرزو مرا مہماں ہے آج کل
فردوسِ حُسن کلبۂ احزاں ہے آج کل

قشقہ کی جوت طُور بداماں ہے آج کل
جو ذرہ ہے وہ مہرِ درخشاں ہے آج کل

ہنستا ہوا شباب غزل خواں ہے آج کل
باہیں گلے میں ڈال کے رقصاں ہے آج کل

ہاتھوں میں اُن کا دستِ گل افشاں ہے آج کل
مٹھی میں میرے عالمِ امکاں ہے آج کل

سرشارِ ذوق و جذبۂ عصیاں ہے آج کل
ایماں سے کفر دست و گریباں ہے آج کل

دامانِ یار ہے مرے ہاتھوں میں ان دنوں
اور دستِ یار میں مرا داماں ہے آج کل

کوکب فشاں ہیں موجِ تبسم کی بجلیاں
ہر ذرہ ایک شمعِ فروزاں ہے آج کل

صد التفات ساقیِ رنگیں ہے ان دنوں
دورِ پیالہ گردشِ دوراں ہے آج کل

وہ اپسرا ہے جنتِ فردوسِ آرزو
قدرت بھی جس کو دیکھ کے حیراں ہے آج کل

قامت میں بجلیوں کا تشکل لئے ہوئے
اک مستِ حسن سروِ چراغاں ہے آج کل

ماتھے پہ آفتاب نگاہوں میں ماہتاب
گیتی پہ اک سپہرِ درخشاں ہے آج کل

جس پہ نثار کوکب و انجم کی کائنات
آغوش میں وہ روحِ شبستاں ہے آج کل

ساماں دورِ ساغر و مے دوش پر لئے
گلشن میں ایک ابرِ خراماں ہے آج کل

رادھا کے روپ میں ہے کنہیا نظر فروز
جمنا بہ شکل کاکلِ پیچاں ہے آج کل

یہ مصحفِ ملیح، یہ لب ہائے نغمہ ریز
گیتا لبوں پہ آنکھ میں قرآں ہے آج کل

ہر صبح ایک شامِ محبت ہے ان دنوں
ہر رات ایک صبحِ بہاراں ہے آج کل

بربط بغیر لمسِ ترنم سے مست ہے
مطرب بغیر عزم غزل خواں ہے آج کل

سرشاریٔ شباب و محبت ہے ان دنوں
جو شے ہے میرے سامنے رقصاں ہے آج کل

مُردہ پڑی ہوئی ہیں تجسّس کی ناگنیں
شانوں پہ زلفِ عیش پریشاں ہے آج کل

ہے مفت دل گرفتگیٔ حُسن ان دنوں
اور حسنِ دل گرفتگی ارزاں ہے آج کل

پائی تھی جس نے دل کے حجابوں میں پرورش
وہ راز اک حقیقتِ عریاں ہے آج کل

دل کا رقیب میں ہوں تو میرا رقیب دل
اللہ رے کیا کشاکشِ پنہاں ہے آج کل

تاریک لامکاں کی فضا ہو تو ہو، مگر
حدِّ نظر تلک تو چراغاں ہے آج کل

سادہ مزاجِ عشق کا عالم نہ پوچھئے
دل التفاتِ حُسن پہ نازاں ہے آج کل

فردا کی بے کسی کے لئے کچھ تو بچ رہے
وہ جنسِ التفات کہ ارزاں ہے آج کل

ساغر نظامی

مسلمان اور ہندی زبان

جب سے مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے ہیں، تب ہی سے ان کا ہندی زبان سے خاصہ پریم رہا ہے۔ بادشاہ بھی اور رعیت بھی، غریب بھی اور امیر بھی، مرد بھی اور عورت بھی سبھی کو ہندوستان کی اس زبان سے اُنس رہا ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں ان سب کا ذکر یا اشارہ بھی کرنا ناممکن امر ہے، پھر بھی کوشش یہی کی گئی ہے کہ جہاں تک ہوسکے کوئی نامور شاعر یا مصنف رہ نہ جائے اور اُن کی موٹی موٹی باتوں سے ناظرین واقف ہو جائیں۔

ہندی اور مسلمان بادشاہ

پرانی تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے ہندوستانی دفتروں میں سب کام ہندی ہی میں ہوتا تھا۔ حسن گنگو براہمنی نے اپنا سب دفتری کام گانگو براہمن کے حوالے کر رکھا تھا اور وہ ہندی ہی میں ہوتا تھا۔

بادشاہ اکبر ہندی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے دربار میں ہندی کے کئی مشہور پنڈت شاعر اور موسیقی کے ماہر رہتے تھے۔ بادشاہ خود بھی ہندی میں شعر کہا کرتے تھے۔ ہم ان کا کہا ہوا ایک دوہا نیچے درج کرتے ہیں جس یا شہرت کے بارے میں کہا ہے:۔

جا کو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہ
تا کو جیون سپھل ہے کہت اکبر ساہ

معنی :۔ "اکبر بادشاہ کہتے ہیں کہ جو دنیا میں باعزت زندگی بسر کرتا ہے اور لوگ جس کی تعریف کرتے ہیں اُسی کی زندگی کامیاب کہی جاسکتی ہے۔"

بادشاہ جہانگیر نے بھی ہندی پڑھی تھی۔ خسرو ابھی چھ ہی برس کا تھا کہ جب اس کے دادا بادشاہ اکبر نے اسے پنڈت بھووت بھٹاچاریہ کے حوالے کیا تاکہ وہ ہندی کی تعلیم بخوبی حاصل کرسکے۔ بادشاہ شاہجہاں تو ہندی اتنی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اُس میں اپنی مادری زبان کے مانند ہی گفتگو کرسکتے تھے۔ اُن کا بیٹا دارا شکوہ تو ان سے بھی بڑھا چڑھا نکلا۔ وہ ہندی اور سنسکرت کا اتنا عالم ہو گیا کہ اُس نے اُپنشدوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان مغلیہ بادشاہوں کے درباروں میں کئی شعرا رہتے تھے اور ان کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی۔ بادشاہ اورنگ زیب کا رجحان اگرچہ ہندوؤں کی طرف بہت زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی ہندی سے اُسے کچھ کم الفت نہ تھی۔

ایک دفعہ شہزادہ محمد اعظم نے اورنگ زیب کے پاس دو آم اس غرض سے بھیجے کہ بادشاہ اُن کا مناسب نام تجویز کریں۔ چنانچہ اورنگ زیب نے انہیں "سدھارس" اور "رسنا دلاس" ناموں سے موسوم کیا۔ سولھویں صدی میں بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ تھے۔ وہ "نورس" نامی ہندی کی کتاب کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ گولکنڈا کا حکمران بھی ہندی شاعری میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔

مسلم شعرا

یوں تو مسلمان آٹھویں صدی ہی سے سندھ پر قابض تھے۔ مگر شمالی ہندوستان میں اُن کا قبضہ بارھویں صدی سے ہونا شروع ہوا اور جائے تعجب ہے کہ انہیں دنوں میں اُن کو ہندی سے اُنس ہو گیا بارھویں صدی کے شروع میں ہی مسعود، قطب علی اور اکرم فیض نام کے تین شاعروں نے ہندی میں شاعری کی۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل اُن کا کلام نایاب ہے۔

امیر خسرو کے نام سے سبھی اردو خوانندہ لوگ بخوبی واقف ہیں۔ یہ عربی فارسی، ترکی اور ہندی کے پورے پنڈت تھے۔ سنسکرت بھاشا سے بھی ان کی اچھی آشنائی تھی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے نظم میں ننانویں کتابیں لکھی ہیں جو کئی لاکھ شعروں پر مشتمل ہیں۔ یہ ۱۲۵۵ء سے ۱۳۲۵ء تک زندہ رہے۔ انہوں نے خالق باری، نام کی ایک لغات لکھی جس میں عربی فارسی ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ اُس پر طرہ یہ ہے کہ ساری کتاب نظم میں ہے۔ یقیناً ان کی کتاب سے ہم مسلمانوں کو ایک

دوسرے کی زبان کو سمجھنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔ آپ کی دلچسپی کے لئے ہم دو ایک شعر خالقِ باری سے اخذ کرتے ہیں:۔

مشک کافور است کستوری کپور
ہندوی آنند شادی و سرور
موش چوہا گربہ بلی مار ناگ۔ سوزن و رشتہ بہندی سوئی تاگ

اس کے علاوہ خسرو نے ہندی میں بہت سی پہیلیاں مکرنیاں، دوسخنے، ڈھکوسلے، گیت اور دوہے وغیرہ لکھے، نمونے کے لئے چند ایک درج کئے جاتے ہیں:۔

بالا تھا جب سب کو بھایا۔ بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں۔ ارتھ کرو نہیں چھوڑو گاؤں (چراغ)

اس پہیلی کا حل دیا ہے جو پہیلی میں ہی بتا دیا گیا ہے۔ لیکن ایسی بھی پہیلیاں انہوں نے کہی ہیں جن کا حل بیچ میں نہیں بتایا گیا۔ ہاتھوں کی چوڑیوں پر کیا مزیدار پہیلی بنائی ہے:۔

چٹاخ پٹاخ کب سے۔ ہاتھ پکڑا جب سے
آہ آوے کب سے۔ آدھا گیا جب سے
چپ چاپ کب سے۔ سارا گیا جب سے

اُن کی مکرنیاں بھی بہت مزیدار ہیں۔ ذرا دیکھئے ڈھول پر کیا دلپسند مکرنی کہی ہے:۔

وہ آوے تب شادی ہوئے۔ اُس بن دوجا ہور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول۔ اے سکھی ساجن؟ نہ سکھی ڈھول

دوسخنے بھی اِن کے بہت دلپذیر ہوتے ہیں فرماتے ہیں:۔

پنڈت کیوں پیاسا؟ گدھا کیوں اُداسا؟ — لوٹا نہ تھا
سوداگر را چہ مے باید۔ بوچے کو کیا چاہیئے؟ دوکان

خسرو بہت حاضر جواب شاعر تھے۔ ایک بار پیاس سے ستائے ہوئے ایک کنوئیں پر پہنچے جہاں چار کہارنیں پانی بھر رہی تھیں۔ اتفاق سے وہ انہیں پہچانتی تھیں۔ انہوں نے باری باری سے کہا کہ ہمیں کھیر، کتا، چرخا اور ڈھول ان چاروں پر شعر سناؤ تب پانی پلائیں گی۔ خسرو نے فی البدیہہ ایک ہی شعر میں سب کی خواہش پوری کر دی بولے:۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا

ان کے بعد پندرھویں صدی کے خاتمے پر ایک صوفی شاعر ہوئے جن کا نام قطبن تھا۔ آپ شیخ برہان کے شاگرد تھے اور شیر شاہ کے والد حسین شاہ کے یہاں رہتے تھے۔ انہوں نے نظم میں ایک پریم کہانی لکھی جس کا نام "مرگاوتی" ہے۔ اس میں چند نگر کے راجکمار اور کانچن نگر کی راجکماری مرگاوتی کی محبت کا نہایت نفیس نقشہ اتارا ہے۔ کئی جگہ تو پڑھتے پڑھتے آدمی کا دل مالک کی محبت میں مگن ہو جاتا ہے۔ ان کے بعد منجھن نے مدھو مالتی، نام کی ایک اعلیٰ پریم کتھا لکھی۔

محبت کے قصے لکھنے والوں میں ملک محمد جائسی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ بریلی ضلع کے جائس نام کے قصبے میں آکر رہنے لگے تھے۔ انہوں نے سادھو سنتوں کا کافی سنگ کیا تھا اور ویدانت اور یوگ سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے دو کتابیں لکھی "پدماوت" اور "اکھراوٹ"۔ "پدماوت" میں چتوڑ کے رانا کا پدماوتی سے بیاہ اور پھر علاؤالدین کے حملے وغیرہ کا ذکر ہے۔ "اکھراوٹ" میں ہندی کے حرفوں میں سے ایک ایک کو لے کر خدا کی تعریف اور دنیا کی بے ثباتی پر بہت عمدہ شاعری کی ہے۔ مسلمان ہونے کے باوجود جگہ جگہ پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی مناسب تعریف کر کے انہوں نے اپنی کشادہ دلی کا بیّن ثبوت دیا ہے۔

"پدماوت" میں راجپوتوں کے جنگ میں چلے جانے پر اور راجپوتنیوں کے جوہر سے جل مرنے پر کہتے ہیں:۔

جوہر بھئی سب اِستری۔ پرش بھئے سنگرام
بادشاہ گڑھ چو دیا۔ چتوڑ بھا اسلام

اِن کے خیال میں وہی زبان اعلیٰ ہے جو پریم کا مارگ بتاتی ہے فرماتے ہیں۔

ترکی عربی ہندوی بھاشا جیتی آہے۔
جا میں مارگ پریم کا سبے سراہے تاہے

"اکھراوٹ" میں ایشور کی مہما کا بیان ویدانت کی طرز پر اس طرح سے کیا ہے:۔

ٹھا، ٹھاکر بڑ آپ گوسائیں۔ جیہی سرجا جگ اپنی نائیں
سبے جگت درپن کے لیکھا۔ آپ ہی درپن آپ ہی دیکھا

معنی: وہ ایشور خود سب سے بڑا ہے جس نے جہان کو اپنے ہی جیسا بنایا۔ ساری کائنات آئینہ کی مانند ہے وہ خود ہی آئینہ ہے اور خود ہی اس میں دیکھنے والا۔

اِسی زمانے میں شاہ محمد اور ان کی زوجہ چھپانے اور عالم نام کے

شاعر نے بھی ہندی میں شاعری کی۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جسے ہندی ادب کے اتہاس کا سنہری یگ کہتے ہیں جس میں تلسی داس، سور داس وغیرہ کئی نامور شاعر ہوئے۔ اسی زمانے میں کئی مسلمان شعرا نے ہندی میں اعلیٰ پائے کا کلام کہا ان میں چند مشہور ہستیاں یہ ہیں۔ رس خاں، رحیم، قادر بخش، مبارک، عثمان، طاہر اور شیخ نبی۔

رس خاں دہلی کے پٹھان تھے اور شری کرشن کے شیدائی۔ پہلے ان کے اطوار اچھے نہ تھے۔ یہ ایک بنئے کے لڑکے پر بے طرح لٹو تھے۔ ایک بار انہوں نے کچھ اجنبیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انسان کو اللہ سے ایسا پیار ہونا چاہئے جیسا رس خاں کا بنئے کے بیٹے سے ہے۔ یہ بات ان کے دل کو لگ گئی اور یہ بالکل بدل گئے۔ بعد میں یہ سری کرشن کے نہایت عقیدتمند بھگت بن گئے۔ ان کی بنائی ہوئی دو کتابیں پریم واٹکا، اور "سجان رس خان" بہت مشہور ہیں۔ پریم واٹکا میں محبت کے متعلق فرماتے ہیں:-

اتی سوچھم کومل اتی ۔ اتی پتروا تی دور
پریم کٹھن سب تے سدا ۔ نت اک رس بھرپور

معنی۔ جو محبت بہت ہی باریک۔ ملائم، پتلی دور کی اور ہمیشہ ایک سی بھرپور رہتی ہے وہ بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔

سری کرشن میں ان کی کتنی عقیدت تھی وہ مندرجہ ذیل چھند سے ظاہر ہوتا ہے:-

یا لکٹی اور کامریا پر راج تہوں پر کا تج ڈاروں۔
آٹھ ہوں سدھی نو ون ندھی کو سکھ نند کی گائے چرائے بساروں۔
رس خاں کیوں ان آنکھن سون برج کے بن باغ تڑاگ نہاروں۔
کوٹن ہو کل ڈھوت کے دھام کریر کے کنجن اوپر واروں۔

معنی۔ میں سری کرشن کی چھڑی اور کمبل پر تینوں جہانوں کی حکومت تیاگ دوں۔ نند کی گائیں (کرشن کے ساتھ) چراتے ہوئے آٹھ سیدھی اور نو ندھی کا سکھ بھول جاؤں۔ اے رس خاں! اگر میں ان آنکھوں سے برج بھومی کے جنگل، باغ اور تالاب دیکھ پاؤں تو کریر کے کنجوں پر سونے کے بنے ہوئے لاکھوں محل قربان کر دوں۔

رحیم، جن کا پورا نام عبدالرحیم خان خاناں ہے بادشاہ اکبر کے سپہ سالار اعظم تھے، وزیر تھے اور نورتنوں میں سے ایک تھے۔ یہ عربی۔ فارسی، سنسکرت اور ہندی کے اچھے عالم تھے۔ سری کرشن کی بھگتی اور سخاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفیں مشہور ہیں:-

رحیم ست سئی، بروے نایکا بھید، داس پنچادھیائی، سنگار سورٹھا، مدن اشٹک، دیوان فارسی اور واقعات بابری کا فارسی ترجمہ اور کھیٹ کوتک جاتک۔

دیکھئے۔ سری کرشن چندر کی بھگتی میں کیسے مست ہیں:-

جہی رحیم چت آپنو ۔ کینو چتر چکور
نشی واسر لاگو رہے ۔ کرشن چندر کی اور

معنی۔ رحیم نے اپنے چت کو چکور کی طرح عقیدتمند بنا دیا ہے جو دن رات کرشن چندر کو چاند کی طرح دیکھتا رہتا ہے۔

یہ بہت تجربہ کار شخص تھے۔ دنیا انہوں نے خوب اچھی طرح دیکھی بھالی تھی۔ اپنے تجربوں کو انہوں نے شاعری میں نہایت کمال سے بیان کیا ہے۔ مصیبت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:-

رحمن وپدا تو بھلی ۔ جو تھورے دن ہوئے
ہت ان ہت یا جگت میں ۔ جان پرت سب کوئے

معنی۔ اے مصیبت! اگر تو تھوڑی دیر کے لئے آئے تو یقیناً اچھی ہے۔ اس سے دنیا میں ہمارا دوست کون ہے اور دشمن کون اس بات کا پتہ بخوبی لگ جاتا ہے۔

کون جانے، کس کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھ کر یہ غضب کا دوہا کہا ہے:-

امی ہلاہل مد بھرے ۔ سویت شیام رتنار
جیئت مرت جھک جھک پڑت ۔ جہی چتوت اک بار

معنی۔ یہ سفید سیاہ اور سرخ آنکھیں، امرت زہر اور شراب سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ جس کو ہی دیکھ لیتی ہیں وہ جی جاتا ہے، مر جاتا ہے اور مدہوشوں کی مانند جھک جھک کر چلنے لگتا ہے۔

آنکھوں کی سفیدی، سیاہی اور سرخی کی امرت زہر اور نشے سے تشبیہہ دینے میں اور پھر ان چیزوں کے تاثر سے لوگوں کی جو کیفیت ہوتی ہے اُسے کیا خوبی سے کہا ہے!

اکبر کے اس عالم سے اٹھ جانے کے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ جہانگیر نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ بڑی مشکل سے کسی طرح باہر آئے۔ دھن دولت پہلے ہی ضبط کر لی گئی تھی۔ غریبی و ناداری کی حالت

میں چیتر کوٹ ریاست میں چلے گئے۔ یہ سختی تو پرے درجے کے تھے ہی غریبوں اور مفلسوں نے یہاں بھی پنڈ نہ چھوڑا۔ انہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ رحیم کی حالت پہلے کی سی نہیں ہے لیکن وہ کب ماننے والے تھے تنگ آکر رحیم نے مندرجہ ذیل دوہا لکھ کر چیتر کوٹ کے راجہ کے پاس پہنچا دیا۔

چیتر کوٹ میں رم رہے - رحمن اودھ نریش
جا پر ویدا پرت ہے - سو آوت یہی دیش

معنی۔ رحیم کہتے ہیں کہ شری رام چندر بھی چیتر کوٹ میں بن باس کے دنوں میں آئے تھے۔ ٹھیک ہے جس پر بلا نازل ہوتی ہے وہ اسی میں پناہ لیتا ہے۔

راجا نے یہ دوہا پڑھ کر سب معاملہ بھانپ لیا۔ انہوں نے رحیم کی مدد کے لئے ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ لیکن رحیم نے سب رقم انہیں بھک منگوں کو دے دی۔ اپنے لئے ایک ادھیلا بھی نہیں رکھا۔

عثمان، غازی پور کے باشندے تھے۔ انہوں نے چیتراولی نام کا عشقیہ قصہ دوہا اور چوپائی میں لکھا ہے۔ اس میں چیتراولی کے بلغیچے کا اُس کے عضو عضو کا، ہجر کا، چھ موسموں کا اور بارہ مہینوں کا بیان پڑھنے کے لائق ہے۔ اس فانی جسم کے متعلق کہتے ہیں۔

کون بھروسہ دیہہ کا چھاڈ جتن اپائے - کاگد کی جس پوتری پانی پڑے گھل جائے

معنی - بہت تدبیریں اور طریقے رہنے دو۔ اس تن کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ تو کاغذ کی پتلی کی مانند ناپائدار ہے جو کہ پانی پڑنے سے گل جاتی ہے۔ بنگالیوں کی خوراک کے بارے میں بڑے مزے کی بات کہی ہے:۔

سب کے امرت پانچ ہیں۔ بنگالی کے سات
کیلا۔ کانجی، پان، رس، ساگ، ماچھری، بھات

مبارک کا سن ولادت ۱۵۸۳ء ہے انہیں عربی، فارسی اور سنسکرت سے اچھی واقفیت تھی۔ ان کی دو تصنیفیں "الک شتک" اور "تل شتک" بہت عمدہ ہیں۔ اول الذکر میں زلف پر ایک سو دوہے کہے ہیں اور دوسرے میں تل یا خال پر ایک صد دوہے ہیں۔ زلف کے بارے میں ایک دوہا دیکھئے:۔

الک مبارک رتیہ و دن - لٹک پری یوں صاف
خوشنویس منشی مدن - لکھیو کانچ پر قاف

معنی۔ عورت کے چہرے پر زلف اس صفائی سے لٹک رہی ہے مانو خوشنویس۔ منشی کام دیو (محبت کا دیوتا) نے کانچ پر ق لکھ دیا ہو

ان کا تل پر لکھا ہوا مندرجہ ذیل دوہا پڑھ کر دل پھڑک اٹھتا ہے:۔

سب جگ پیرت تلن کو - تھکیو چیت یہ ہیر
تو کپول کو ایک تل - سب جگ ڈاریو پیر

معنی۔ دل یہ دیکھ دیکھ کر تنگ پڑ گیا ہے کہ ساری دنیا تلوں کو پیلتی رہتی ہے لیکن تیرے گال کے اس ایک تل نے سب سنسار کو پیل ڈالا ہے۔

اسی زمانے میں قادر بخش، طاہر اور شیخ نبی نے ہندی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ قادر بخش کا کلام کافی اچھا ہے۔ ان کا ایک شعر تو کہاوت ہی بن گیا ہے:۔ "گن نہ ہرانو گن گاہک ہرانو ہے" یعنی ہنر یا خوبیاں تا حال موجود ہیں لیکن اُن کے قدر دان مفقود ہو گئے ہیں۔ طاہر نے "کوک سار" نام کی ایک کتاب لکھی۔ انہیں دنوں میں کچھ اور بھی مسلم اصحاب ایسے تھے جنہوں نے ہندی میں شعر کہے لیکن وہ بہت باکمال نہ تھے درمیانی درجے کے تھے۔

سترھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں تاج نام کی ایک مسلم خاتون کا ہندی سے بہت پریم تھا۔ ان کی سری کرشن چندر سے بہت شردھا اور عقیدت تھی۔ کہتی ہیں۔

سنو دل جانی! میرے دل کی کہانی تم دست ہی بکانی بدنامی ہی سہوں گی میں دیو پوجا ٹھانی، میں نواز ہوں بھلانی تجے کلمہ قرآن سارے گنن گہوں گی میں سیالا سلونا سرتاج سر کلے دئے تیرے نیہ داگ میں نداگ ہو دہوں گی میں نند کے کمار! قربان تانڈی صورت پہ تانڈ نال پیارے ہندوانی ہو رہوں گی میں۔

معنی۔ اے میرے دل و جاں! میرے دل کا حال یہ ہے کہ میں تمہارے ہاتھ بک چکی ہوں۔ ہر بدنامی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ میں کلمہ و نماز بھلا کر تمہارے گنوں کو اپناؤں گی اور تمہاری پوجا کروں گی۔ اے مکٹ دھاری خوب صورت شیام! تمہاری محبت کے داغ کے سوا اپنے سب داغ دھو ڈالوں گی۔ اے نند کے دلارے سری کرشن! میں تیری صورت پر قربان ہوں میں تو تمہارے لئے ہندو ہونے کو تیار ہوں۔

سچ مچ اُن دنوں کرشن بھگتی کا وہ دور دورہ تھا کہ ایک مسلمان دیوی بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

اورنگ زیب کے زمانے میں مسلمانوں کا رجحان اردو کی طرف زیادہ ہو گیا اور وہ فارسی شاعری کے ڈھنگ پر لکھنے لگے۔ خود

بادشاہ کو بھی شاعری کا خاص شوق نہ تھا۔ تاہم ان کے ماتحت افسروں میں سے دانش مند اور رحمت اللہ نے ہندی میں کچھ شعر کہے۔ ان کے علاوہ زین دین محمد اور میر رستم بھی ہندی کے شاعر تھے۔

عالم جنم کے برہمن تھے۔ لیکن بعد میں مسلمان ہو گئے اور اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ معظم کے یہاں رہنے لگے۔ ان کے تبدیلیٔ مذہب کی داستان بھی حد درجے کی دلچسپ ہے۔ انہوں نے ایک بار آدھا دوہا بنا کر کاغذ کے پرزے پر لکھ کر پگڑی میں باندھ لیا کہ کبھی اسے مکمل کر لیں گے۔ اتفاق سے وہ اس بات کو بھول گئے اور پگڑی رنگنے کے لئے شیخ نام کی رنگریزن کے پاس پہنچ گئی۔ شیخ نے کھول کر پڑھا تو آدھا دوہا لکھا تھا۔ شیخ نے پورا کر کے پھر باندھ دیا۔

وہ دوہا یہ ہے:

کنک چھری سی کامنی ۔ کاہے کو کٹی چھین (عالم)
کٹی کو کانچن کاٹ ودھی ۔ کچن مدھ دھر دین (شیخ)

معنی۔ باقی تو یہ عورت سونے کی چھڑی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی کمر پتلی کیوں ہے؟ ٹھیک ہے کمر پر کا سونا کاٹ کر پرہمانے چھاتیوں میں دھر دیا ہے۔

شیخ کے تخیل کے پرواز کو دیکھ کر عالم دنگ رہ گئے۔ انہوں نے ایک آنہ رنگائی، ایک ہزار روپیہ انعام شیخ کے حوالے کر دیا۔ دونوں میں محبت موجزن ہوئی اور انہوں نے آپس میں شادی کر لی۔ ان دونوں کا کلام محبت سے سرشار ہے۔ شیخ کو بھی سری کرشن چندر سے بہت عقیدت تھی۔ "عالم کیلی" اور "مادھوانل۔ کام کندلا" نام کی دو کتابیں انہیں کی تصنیف کردہ کہی جاتی ہیں۔ عالم نے سری کرشن کے سانولے پن پر کیا خوب کہا ہے!

کارو کا ہنہ کہت گنواری ایسی لاگت ہے
موہی واکی سیام تائی لاگتی اُجیاری ہے

معنی۔ کرشن کو کالا کہنے والی مجھے تو گنواری سی لگتی ہے۔ مجھے تو اُس کا سانولا پن بھی اجالا نظر آتا ہے۔

رس لین اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہوئے۔ یہ ضلع ہردوئی کے بلگرام گاؤں کے رہنے والے تھے۔ عربی۔ فارسی اور ہندی کے فاضل تھے۔ "انگ درپن" اور "رس پر بودھ" نامی کتابیں انہیں نے لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ پاؤں کے تلووں کی نزاکت کا بیان بڑا با کمال کیا ہے۔

نو یگ تل مر دتل چنئے ۔ کوئی برنت سکچا ہیں
من ہیں آوت جیبھ لوں ۔ مت چھالے پر جاہیں

معنی۔ تیرے پاؤں کے تلووں کی نزاکت شعرا دل میں تو سمجھ سکتے ہیں لیکن زبان سے بیان کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔ دل میں یہی آتا ہے کہ زبان جیسی سخت چیز کے ساتھ لگنے سے اُن پر آبلے نہ پڑ جائیں۔

کسی نازنین کی پتلی کمر کو دیکھ کر آنکھ میں بال پڑ جانا شاید ان کے سوا آج تک کسی کو نہیں سوجھا۔ فرماتے ہیں:۔

سو چھم کٹی وا بال کی ۔ کہوں کون پر کار
جاکے اور چتوت ہی ۔ پرت درگن میں بار

معنی۔ اس نازنین کی پتلی کمر کو میں کیسے کہوں؟ جس کی طرف دیکھتے ہی آنکھوں میں بال پڑ جاتا ہے۔

رس رنگ پہلے مسلمان تھے بعد میں ویشنو بن گئے۔ انہوں نے "بانی" نام کی کتاب برج بھاشا اور کھڑی بولی میں لکھی۔ عبد الرحمان ہندی کے اچھے عالم تھے ان کی ہندی مشکل تو ضرور ہوتی تھی لیکن اُس میں چمتکار خوب ہوتا تھا۔ ان کی دو کتابیں ملتی ہیں۔ "یمک شتک" اور "نکھ شکھ"۔ محبوب کا کلام بھی بڑا دلپذیر ہوتا تھا۔ وہ ایک ہی حرف کا کئی بار بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے تھے۔

دکش، پریتم اور یعقوب خاں کے نام بھی قابل یادداشت ہیں دکش تخلص تھا۔ اصلی نام احمد اللہ تھا۔ ان کا تصنیف شدہ "دکش ولاس" نامی گرنتھ ملتا ہے جس میں مختلف رسوں کا بیان وضاحت سے کیا ہے۔ پریتم جن کا حقیقی نام علی محب خاں تھا بڑی مذاقیہ طبیعت کے مالک تھے انہوں نے کھٹملوں کے بارے میں برج بھاشا میں ایک چھوٹی سی کتاب "کھٹمل بائیسی" لکھی ہے۔ اُسے پڑھتے پڑھتے انسان مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتب "پرانوں" کے مطابق شو جی دیوتا کیلاش پربت پر، وشنو دیوتا دودھ کے سمندر میں اور برہما دیوتا کمل میں آرام کرتے ہیں۔ لیکن "پریتم" کہتے ہیں کہ یہ سبھی کھٹملوں سے ستائے ہوئے ہی کھاٹ پر نہیں سوتے کیا خوب کہا ہے:۔

ودھی ہری ہر اور ان تے نہ کوو تے اُو
کھاٹ پہ نہ سو دیں کھٹمل کو ڈر کے

یعقوب خاں نے ہندی کے مشہور شاعر کیشو داس کی "رسک پریا" کتاب کی تفسیر لکھی اور "انکا" کے مضمون پر "رس بھوشن" نام کی کتاب بنائی۔

دہلی کے ایک شاعر اعظم خاں ہوئے ہیں۔ انہوں نے "نثر نگار درپن" لکھا۔ نور محمد نے دوہا اور چوپائی چھندوں میں "اندراوتی" نام کی کتاب لکھی۔ یہ کتاب اودھی زبان میں ہے لیکن گاہے بگاہے فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ گرنتھ بہت اچھا بنا ہے اور اس کا مقابلہ جائسی "پدماوت" سے ہو سکتا ہے۔

یوسف خاں ایک مفسر ہوئے ہیں۔ طالب شاہ کی زبان میں کھڑی بولی بھی ملی ہوئی ہے۔

انیسویں صدی میں ایک مفسر عیسوی خاں ہوئے جنہوں نے کہ "بہاری ست سئی" پر ایک تفسیر لکھی۔ قاسم شاہ اس زمانے کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا دوہا اور چوپائی میں لکھا ہوا "ہنس جواہر" نام کا گرنتھ بہت مشہور رہے۔ یہ بھی ایک لمبی پریم کی کہانی ہے۔ ہندی ادب میں ایسی بڑی بڑی اور اچھی پریم کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

سید امیر علی میر زمانۂ حال کے مشہور ہیں زبان سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کو ہندوستان سے، سودیشی اشیا سے اور گائے سے بہت پریم ہے۔ ہندی شاعری میں کافی دسترس رکھنے کے سبب یہ کئی ڈگریاں اور تمغے حاصل کر چکے ہیں۔ بحرِ ہند کے بارے میں کہتے ہیں:۔

ہند ساگر تم ہمارے گار دھتے ۔ ہائے ای تم نے مگر کیسی دغا ؟
جب گھسا تھا شترو چھاتی چیر کر ۔ ناگ دھر پاتال کو دیتے بھگا ۔

اپنی غلامی کے بارے میں ایشور سے یوں پرارتھنا کرتے ہیں:۔

(دنیا کے محافظ) وشو رکشک ایکا نہیں ہم وشو ہیں ؟ کیوں نہیں دیتے ہمیں ہو تم سوراج ؟
غیر ہیں آزاد گھر میں ہم غلام ۔ کیا یہی انصاف ہے بندہ نواز ؟

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ گزشتہ آٹھ صدیوں میں مسلمانوں نے ہندی بھاشا کی ترقی میں کئی طرح سے کافی مدد دی ہے۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ رشتہ محبت بدستور قائم رہے گا یا پہلے سے بھی زیادہ پکا ہو جائے گا۔

رام سروپ شاستری

اس مضمون کے لکھنے میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔ راقم ان سے استفادہ کا تہ دل سے ممنون ہے:۔

(۱) ہندی کویتا کومدی (۲) ہندی ساہتیہ کا سنکشپت اتہاس (۳) ہندی ساہتیہ کا ودھمن آتمک اتہاس۔

اگر ۔ ۔ ۔ ؟

اگر سبز پتیاں اور نازک ڈالیاں ہی جانِ بہار ہیں تو مجھے پھوٹتی ہوئی کونپلیں اور نکلتے ہوئے شگوفے کیوں زیادہ مرغوب ہیں ؟

زمانۂ شباب میں ہر مرد، عہدِ جوانی میں بھی عورتیں ——— حسن و خواب کا مجموعہ بن جاتی ہیں تو مجھے ایک بھولا اور معصوم بچہ ان سب سے کیوں زیادہ پیارا اور محبت آفریں معلوم ہوتا ہے ؟

قدرت کے رنگین مناظر اور مصور کے حسین شاہکار روزِ روشن میں ہی دلکش اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں تو پھر انہیں صبح کے دھندلکوں اور مہتاب کی چھاؤں میں دیکھنے کا شوق کیوں چرائے رہتا ہے ؟

کھلے ہوئے پھولوں کی دلفریبی قابلِ سوال نہیں تو آخر بند کلیاں میرے جذبات میں کیوں ہلچل ڈال دیتی ہیں ؟

——— مقررین کی خطابت سحر اثر ہوتی ہے تو ایک بے کس اور نادار کے منہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے فقرات جب گونگے کے اشارات و کنایات مطلب برآری کرتے ہیں، مجھے کیوں زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

——— وہ ادبی جواہر پارے، جن میں ہر خیال کامل، ہر بات جامع، ہر مسئلہ واضح اور روشن ہو، زیادہ بلند اور ارفع سمجھے جاتے ہیں تو مجھے وہ پارہ ہائے ادب جن میں کچھ سمجھایا، کچھ سُجھایا گیا ہو۔ کچھ کہا، کچھ حذف کیا گیا ہو۔ کیوں، کیوں بے خود اور مجبور رکھتے ہیں ؟

——— بدرِ منیر کی نورانی ٹکیہ اپنی نقرئی چاندنی کی بدولت، لاجوردی آسمان کا گہنا اور خوبصورتی تصور کی جاتی ہے تو مجھے ہلالِ نو سے کیوں زیادہ عقیدت ہے ؟ مجھے اُس کی آمد کیوں انتظار رہے ؟

شاید یہ اس لئے

کہ میں خود نامکمل ہوں اور مجھے ہر نامکمل شے سے اُنس ہے ۔

خورشید بی ایس سی

صدائے درویش

اِس رنج کی دنیا میں جامِ طرب افزا دے — اس میکدۂ کلا میں اِک ساغر اِلّا دے
اے فضل و کرم والے! محتاج کو دِلوا دے — امید کے بندے کو محروم نہ پلٹا دے

دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

اِس اپنے بھکاری پر، اے شاہ کرم فرما — آیا ہے ترے در پر گمراہ، کرم فرما
مایوسی کی حالت میں ناگاہ، کرم فرما — اللہ! کرم فرما لِلّٰہ، کرم فرما

دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

دُوری سے تری تھک کر، جی اپنا نہ ہاروں گا — افلاک کی چوٹی سے تاروں کو اُتاروں گا
بگڑی ہوئی قسمت کو رو رو کے سنواروں گا — سَو مرتبہ چیخوں گا، سَو بار پکاروں گا

دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

اِس جسم کے جوہر کو عُریانی سے زینت دے — دستِ دلِ سائل میں، دامانِ محبت دے
کچھ غم کی مسرت دے، کچھ درد کی لذت دے — ایمان کی عزت دے، توحید کی دولت دے

دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

کب تک تری صُورت کو یہ دیدۂ تر، ترسے — دیکھیں مری کھیتی میں کب ابرِ کرم برسے
امید بہت کچھ ہے امجد کو ترے در سے — دامانِ ہوس بھر دے مقصود کے گوہر سے

دے اے مرے مولا دے، دے اے مرے داتا دے

احمد حسین امجد

پھر مانگ پھر مانگ

اے سائل آ آ پھر مانگ پھر مانگ
جو چاہے لے جا، پھر مانگ، پھر مانگ
ہر دم ہمارے فضل و کرم کا
جاری ہے دریا، پھر مانگ پھر مانگ

خوش ہوتے ہیں ہم تیری صدا سے
ہاں پھر صدا دے، دلکش ادا سے
کیوں رُوٹھتا ہے اپنے خدا سے
آ آ آ آ پھر مانگ پھر مانگ

ہم اپنی شانِ رحمت دکھائیں
سب آرزوئیں تیری بر آئیں
تو مانگتا جا، ہم دیتے جائیں
ہاں چپ نہ ہو جا، پھر مانگ پھر مانگ

وجہ سکوں ہے یہ بے قراری
زور اور زر سے بہتر ہے زاری
چھائی ہے تجھ پر رحمت ہماری
لے چاہے جتنا، پھر مانگ پھر مانگ

تو ہے بھکاری، اور ہم ہیں داتا
لے بھر لے امجد! کاسہ ہوس کا
ہم بھی تو دیکھیں ہے ظرف کتنا
لے ہاتھ پھیلا، پھر مانگ پھر مانگ

احمد حسین امجد

نینا

اُس پر نقب زنی کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ عدالت میں اس شخص کے طرزِ عمل اور ان حالات کی وجہ سے جو مقدمے کی سماعت کے دوران میں ظاہر ہوئے مجھے اس شخص سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے قیدی سے ملنے کے لئے اجازت حاصل کر لی۔ پہلے تو اس نے میرے ساتھ گفتگو تک کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن آخر کار اپنی داستانِ حیات یوں سنائی:۔

"آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ میں نے اچھے دن بھی دیکھے ہیں اور ہمیشہ ایک بدبخت آوارہ گرد کی طرح گلیوں میں گھومنا اور سڑکوں پر سونا میری قسمت میں نہیں تھا۔ میں نے اچھی تعلیم پائی ہے۔ میں ایک انجنیئر تھا۔ جوانی میں میرے پاس کچھ دولت بھی تھی اور میں اپنے ایام عیش و عشرت میں بسر کیا کرتا تھا۔ ہر رات میں رقص و سرود کے جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور شراب سے مدہوش ہو کر لوٹا کرتا تھا۔ مجھے وہ زندگی اچھی طرح یاد ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات کے گہرے نقوش میرے دل پر موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں ایک خلا ہے، اور اسے بھرنے کے لئے میں اپنی باقی ماندہ زندگی قربان کرنے کو تیار ہوں . . . سب کچھ دے ڈالنے کو تیار ہوں، صرف ان واقعات کی یاد کے لئے جن کا ذرا سا تعلق بھی نینا کی ذات سے ہے۔

"اُس کا نام نینا تھا، ہاں، نینا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ اس کا خاوند ریلوے کے محکمے میں کسی معمولی سی اسامی پر مامور تھا۔ وہ غریب تھے۔ لیکن وہ کتنی سلیقہ شعار تھی کہ اس مفلسی اور ناداری میں بھی اپنے ماحول میں لطافت اور حسن پیدا کر دیتی تھی۔ وہ کھانا خود پکاتی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے ہاتھ بدنما نہ ہوتے تھے، شاید خدا نے نہایت توجہ اور محنت سے انہیں ڈھالا تھا۔ اس کا غریبانہ لباس ایک نشاط آور خواب کی طرح ہوتا تھا اور دنیا کا وہ حصہ جس کا اس کے ساتھ تعلق ہو جاتا تھا، اس کی کایا ہی پلٹ جاتی تھی۔ خود میں اس کے ساتھ مل کر اور کا اور ہو گیا اس طرح جیسے بارش سے بھیگ کر کوئی شخص اپنے آپ کو جھنجھوڑے میں نے زندگی کی تمام کثافتیں اپنے جسم سے ٹپکا دیں۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، خدا اُس کے اِس گناہ کو معاف کرے۔ اس کا ماحول اتنا کرخت تھا کہ اس کے پاس مجھ سے محبت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ میں جوان اور خوبصورت تھا۔ شعروں کے دفتر کے دفتر مجھے ازبر تھے۔ لیکن میری اس سے واقفیت کب اور کس طرح ہوئی! . . . یہ بات مجھے اب بالکل یاد نہیں۔ اس کے تصور سے میرے دل کی اتھاہ تاریکیوں میں الگ الگ تصویریں روشن ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم تھیٹر میں ہیں۔ وہ مسرت و انبساط میں ڈوبی ہوئی (لیکن ایسے مواقع بہت شاذ ہوتے تھے) کھیل کے ہر لفظ کو ایک پیاسے آدمی کی طرح پیتی چلی جاتی ہے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے . . . مجھے اس کی مسکراہٹ ابھی تک یاد ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں کسی اور جگہ چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنا سر مجھ پر جھکا دیتی تھی اور کہتی تھی میں جانتی ہوں کہ مسرت کا یہ لمحہ بہت لمبا نہیں ہے، لیکن کچھ پروا نہیں، میں اس لمحے میں ایک زندگی گزار چکوں گی"۔ مجھے یہ لفظ یاد ہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد کیا ہوا؟ اور کیا یہ واقعی درست ہے کہ یہ سب کچھ اسی زمانے میں ہوا جب میں نینا کے ساتھ تھا، میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ قطع تعلق کے وقت میں نے ہی پہل کی اور اسے چھوڑ دیا۔ یہ بالکل قدرتی بات معلوم ہوتی تھی میرے تمام ساتھی اسی طرح کرتے تھے۔ کسی شادی شدہ عورت کے ساتھ کچھ روز معاشقہ کرتے اور پھر اسے دھتکار دیتے تھے۔ میں نے بھی دوسروں کی تقلید کی اور یہ خیال میرے دل میں پیدا ہی نہیں ہوا کہ میں کوئی نازیبا حرکت کر رہا ہوں۔ کسی کا روپیہ چرانا، اپنا قرض ادا نہ کرنا، چغلخور بننا . . . یہ باتیں واقعی بری تھیں لیکن کسی عورت سے محبت کر کے اسے چھوڑ دینا تمام دنیا کا دستور تھا۔ میرے سامنے ایک درخشاں مستقبل تھا اور اس کے مقابلے میں ایک عورت کی محبت کے لئے اپنے آپ کو پابند کر لینا کتنا احمقانہ فعل تھا۔ یہ واقعہ یقیناً دردناک تھا، بہت ہی تکلیف دہ، لیکن میں نے اپنے آپ پر فتح

پالی۔

"میں نے سنا کہ اس کے بعد نینا اپنے خاوند کے ساتھ کسی جنوبی علاقے میں چلی گئی اور پھر جلد ہی مر گئی۔ لیکن اس زمانے میں نینا کی یاد مجھے اتنا دکھ پہنچاتی کہ میں اس کے متعلق کوئی خبر بھی سننے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو اور اس کا خیال تک میرے دل میں پیدا نہ ہو۔ میں نے اس کی کوئی تصویر اپنے پاس نہ رکھی تھی۔ میں نے اس کے تمام خطوط واپس کر دئے تھے، ہمارے کوئی مشترک دوست نہ تھے اور اس طرح آہستہ آہستہ میرے دل پر سے نینا کے نقوش مٹتے گئے مٹتے گئے اور مٹ گئے۔ آپ سمجھ گئے نا؟ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں نینا کو بھولتا گیا حتیٰ کہ بالکل بھول گیا۔ اس کا نام، اور اس کی تمام محبت۔ ایسے، جیسے میری زندگی میں نینا کا کوئی وجود ہی نہیں تھا . . . آہ، انسان کی اس بھول جانے کی قدرت میں ایک چیز کتنی شرمناک موجود ہے۔

"برسوں گزر گئے۔ میں آپ کو اپنی زندگی کی کامرانیوں کا حال نہ سناؤں گا اور نینا کے بغیر زندگی کی ظاہری کامیابیوں کے سوائے اور رہ ہو کیا سکتا تھا۔ ہاں، دولت اور شہرت کی فراوانیاں تھیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی حد تک پہنچ گیا۔ میں اس وقت لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ میں نے شادی کی۔ خدا نے مجھے بچوں کی نعمت سے مالا مال کیا۔ اس کے بعد قسمت نے دوسری طرف کروٹ بدلی . . . مجھے ہر چیز میں نقصان ہونے لگا، میرے کام ناپسند کئے جانے لگے، میری بیوی مر گئی، میں نے بچوں کو دوسرے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا۔ اور اب خدا مجھے معاف کرے، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے ننھے لڑکے زندہ ہیں یا مر گئے۔ ہاں آپ کا خیال صحیح ہے میں نے شراب پینا اور جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا . . . میں نے دلالی کا کاروبار شروع کیا لیکن اس میں میری رہی سہی پونجی بھی ضائع ہو گئی میں نے جوئے کے ذریعے اپنی حالت سدھارنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا اور جیل جانے سے بال بال بچ گیا . . . ہاں یہ افتاد بھی بلا وجہ نہ تھی۔ میرے دوست میرے دشمن ہو گئے اور میں انتہائی بلندی سے پستی کی طرف گرنا شروع ہو گیا۔

آہستہ آہستہ میں ذلت کے اس درجے کو پہنچا جہاں اب آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ذہنی ترقیوں کے اُس آسمان سے جہاں بہت کم لوگ پہنچتے ہیں میں اس تحت الثریٰ میں آ گرا ہوں۔ میں راستے کی کسی منزل پر رک نہ سکا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، اور میں عموماً دن رات شراب کے نشے میں چور رہتا تھا۔ گزشتہ چند سال میں میں نے مہینوں مختلف کارخانوں میں مزدوروں کا کام کیا ہے لیکن صرف اتنے دن جتنے میں شراب کے بغیر گذار سکتا تھا اور جب کبھی شراب کا بھوت آن دباتا تھا تو میں چوروں اور اچکّوں کے مسکنوں میں جا پناہ لیتا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے دلی نفرت تھی اور ہر وقت یہی خواب دیکھتا تھا کہ میری قسمت یکایک پلٹا کھائے گی اور میں پھر امیر کبیر ہو جاؤں گا۔ کسی رشتہ دار سے ورثے میں جائداد ملنے کی موہوم امید اور اسی قسم کی اور امیدیں میرے دل میں جاگزیں تھیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا کیونکہ ایسی کوئی امید ان کے پیش نظر نہ تھی۔

"ہاں، ایک دن سردی سے ٹھٹھرتا ہوا اور بھوک سے مرتا ہوا میں کسی کے صحن میں جا نکلا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ یکایک باورچن نے آواز دی "او لڑکے۔ تم قفل ساز تو نہیں ہو؟" "ہاں میں قفل ساز ہوں" میں نے جواب دیا۔ انہیں اپنی لکھنے کی میز کا قفل مرمت کرانا تھا۔ وہ مجھے ایک آراستہ کتب خانہ میں لے گئی جہاں سونا ہی سونا پڑا تھا اور تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے کام شروع کر دیا اور قفل بنا دیا۔ گھر کی مالکہ نے مجھے ایک روبل دیا۔ میں نے رقم لے لی۔ لیکن اچانک میری نظر سنگ مرمر کے ایک مجسمے پر پڑی جو ایک چھوٹی سی خوب صورت تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ مجھے معلوم نہیں کیوں میں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا:۔ نینا!

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں نینا کو بالکل بھول چکا تھا اور خاص طور پر اس وقت مجھے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا کہ میں اسے بھول چکا ہوں۔ بالکل بھلا چکا ہوں۔ یکایک اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے جھومنے لگی۔ تاثرات خیالات اور خوابوں کی ایک کائنات جو میری روح میں مدفون تھی جاگی، اٹھی اور پھر وجود میں آ گئی . . . میں نے مرمر کے مجسمہ کی طرف دیکھا۔ میرا تمام جسم لرزا اور میں نے کہا "خاتون اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ مجسمہ کس کا ہے؟" "اوہ، یہ مجسمہ؟ یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ اس کو بنے پانچ سو سال ہوئے ہیں۔ یہ پندرھویں صدی میں بنایا گیا تھا" اس نے مجھے مجسمہ ساز کا نام بھی بتایا لیکن میں نے نہ سنا اور اس نے بتایا کہ اس کا خاوند اس مجسمے کو اٹلی سے لایا تھا اور اس کی وجہ سے روس اور اٹلی کی حکومتوں کے درمیان بڑی زبردست خط و کتابت ہوئی۔ "لیکن" خاتون نے مجھ سے کہا "تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ مجسمہ تمہیں پسند آیا ہے؟ تمہارا معیار حسن پست معلوم ہوتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس کے کان اصلی جگہ پر نہیں ہیں۔ کس قدر ناہموار ہے . . ." اور یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔

"میں مکان سے باہر بھاگ آیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ یہ مشابہت نہیں تھی بلکہ حقیقت میں اسی کا مجسمہ تھا۔ نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ . . . ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس مجسمے کے ذریعہ اس نے دوسرا جنم لیا ہے۔ مجھے بتاؤ، وہ کون سی فوق العادت طاقت تھی جس کے ذریعہ پندرھویں صدی کے ایک فن کار نے وہی چھوٹے چھوٹے کان، جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں وہی آنکھیں جو ذرا سی ٹیڑھی تھیں، وہی ناہموار ناک اور وہی بلند پیشانی بنادی اور ان اعضا سے خلاف توقع کس طرح اس عورت کا حسین ترین اور ساحرانہ چہرہ بنالیا؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ دو عورتیں ایک ہی شکل وصورت کی پیدا ہوئیں . . . ایک پندرھویں صدی میں اور دوسری ہمارے زمانے میں اور وہ جس کی شبیہ مجسمہ ساز نے بنائی نہ صرف شکل وصورت میں نینا کے مشابہ تھی بلکہ مجھے یقین ہے کہ ان کے عادات واطوار اور روحیں بھی ایک سی تھیں۔

اس دن میری تمام زندگی کا رُخ بدل گیا۔ اس دن نہ صرف مجھے اپنی گزشتہ زندگی کی کمینہ حرکات کا احساس ہوا بلکہ میں اپنی موجودہ ذلت کی گہرائی کو پا گیا۔ نینا واقعی ایک فرشتہ تھی جسے قدرت نے میرے پاس بھیجا لیکن میں نے اسے نہ پہچانا۔ ماضی کو واپس لانا ناممکن بات ہے۔ لیکن میں اُس سے متعلق تمام واقعات کو یاد کرنا چاہتا تھا جیسے کوئی ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹکڑے جوڑتا ہے۔ آہ۔ یہ ٹکڑے کس قدر چھوٹے اور غیر مربوط تھے۔ لیکن مجھے کتنی مسرت ہوتی تھی جب مجھے کوئی نئی بات یاد آجاتی تھی۔ میں ان باتوں کو یاد کرنے میں گھنٹوں گزار دیا کرتا تھا، لوگ مجھ پر ہنستے تھے لیکن میں خوش تھا۔ میں اب بوڑھا ہوچکا ہوں اور اب میرا زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا وقت نہیں رہا لیکن اب بھی میں اپنی روح کو ذلیل خیالات سے پاک کرسکتا تھا اپنے دل سے ہم جنسوں کی نفرت کو دھو سکتا تھا اور اپنے خالق کے خلاف اپنے شکوہ وشکایت کو بند کرسکتا تھا۔ نینا کی یاد میں مجھے یہ تمام پاکیزہ باتیں سوجھتی تھیں۔

"میں مجسمے کو ایک دفعہ اور دیکھنے کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں شاموں کو اس گھر کے گرد منڈلاتا رہتا اور اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ کھڑکی سے بہت دور تھا۔ میں تمام تمام رات گھر کے سامنے کھڑا رہتا۔ میں گھر کے تمام آدمیوں کو پہچاننے لگ گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کون کس کمرے میں رہتا ہے۔ آخر میں نے ایک ملازم سے دوستی گانٹھ لی۔ گرمیوں کے دنوں میں مالکہ اپنی جاگیر پر چلی گئی۔ اب مجھ میں صبر کی تاب نہ رہی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں [illegible] کو ایک نظر اور دیکھ لوں گا تو مجھے تمام واقعات یاد آجائیں گے اور یہ میری انتہائی مسرت کا باعث ہوگا۔ اس طرح آخر کار میں اس بات کے لئے تیار ہوگیا جس کی پاداش میں مجھے قید کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہوئی۔ انھوں نے مجھے بڑے کمرے ہی سے گرفتار کرلیا اور مقدمے کے دوران میں یہ کہا گیا کہ میں قفل سازی کے بہانے سے مکان میں داخل ہوا تھا اور یہ کہ میں اکثر گھر کے نزدیک دیکھا گیا ہوں . . . میں ایک فقیر ہوں اور میں نے ان کے تالے توڑ ڈالے تھے . . . بہر حال اب یہ قصہ ختم ہوچکا ہے"۔

میں نے کہا "لیکن ہم تمہارے لئے اپیل دائر کریں گے اور عدالت تمہیں رہا کردے گی"۔

بڈھے قیدی نے اعتراضاً کہا "لیکن کیوں! میری گرفتاری پر افسوس کرنے والا کون ہے اور میری ضمانت کون دے گا اور کیا یہ میرے لئے یکساں بات نہیں کہ میں نینا کو کسی سرائے میں یاد کروں یا قیدخانے میں"؟

مجھے اس بات کا کوئی جواب نہ سوجھا لیکن بڈھے نے یکایک نظریں اٹھائیں اور اپنی عجیب اور دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا:۔

"صرف ایک بات مجھے دکھ دے رہی ہے۔ ممکن ہے نینا کبھی پیدا ہی نہ ہوئی ہو اور اس کی ہستی میرے کمزور اور شراب سے برباد شدہ دل کی اپنی تخلیق ہو اور محبت کا یہ تمام قصہ صرف اس مجسمہ کو دیکھ کر میرے دل نے گھڑ لیا ہو۔

"روسی"

مظفر احمد

میں پا کے اُس سے عفو کا پروانہ چھُٹ گیا
اہلِ خرد دھرے گئے دیوانہ چھُٹ گیا

نظم طبا طبائی

یادِ فراموشی

دل سے بُھلا چکا ہوں میں تیری نگاہِ ناز کو
چشمِ سیاہ مست کو، نرگسِ نیم باز کو
نائرۂ جمال کو، ولولۂ شباب کو
عارضِ نور پاش کو، زلفِ سیاہ تاب کو

دل سے بُھلا چکا ہوں میں دلبریٔ خرام کو
تیرے لب وعذار پر موجۂ ابتسام کو
تیری ادائے دلربا، تیری نگاہِ شرمگیں
حسنِ لطافت انتہا، جسمِ نزاکت آفریں

میں نے بھلا دیا ترے قلبِ وفا شعار کو
اور تری بزمِ حسن کی صحبتِ جلوہ بار کو
بیخودیٔ وصال کی بارگہِ نظارہ کو
چشمِ ستارہ ریز کو، چہرۂ ماہ پارہ کو

میرے دماغ میں نہیں تیری ادائے دلفریب
تیری نگاہِ جانستاں، غمزۂ آفتِ شکیب
جس نے پڑھا دیا مجھے درسِ حیاتِ عاشقی
جس کے اثر سے قلب میں تھے جذباتِ عاشقی

ایک مسرتِ نہاں ہے میرے دل میں موجزن
بزمِ خیال ہے مری عیشِ جہاں کی انجمن
خوش ہوں کہ میں مٹا سکا سوز و گدازِ عشق کو
خوش ہوں کہ میں بھلا سکا راز و نیازِ عشق کو

عرشی امرتسری

دُلھا دلھن کی ڈائری

(ہم اپنی ڈائری کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں لیکن اُن اصحاب سے معذرت خواہ ہیں جنھیں اپنی توقع کے خلاف اِن اندراجات میں رومانی عنصر کا فقدان نظر آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کے دیگر معاشرتی مسائل اس قدر اہم تھے کہ ان کے علاوہ، ورکسی طرف ہماری توجہ منعطف نہ ہو سکی۔ لیکن دو نوجوان روحوں کی نئی زندگی کے ابتدائی مراحل کے تجربات کا بیان شاید حیاتِ معاشقہ کے کوائف سے کم دلچسپ ثابت نہ ہو۔ دُولھا دلہن)

دُولھا

۲۹ر جنوری سنہ ۳۶ء کل شادی ہے۔ میں نے والد سے بہتیرا کہا کہ ابھی مجھے شادی کرنے کی خواہش نہیں۔ لیکن انہیں تو اِس کی کچھ ایسی دُھن سمائی ہے کہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ کبھی مذہب، کبھی رسم و رواج کبھی فرائض پدری، اور کبھی خدا جانے کیا کیا چیزیں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ میری شادی کر دیں۔ اُن کے نزدیک میرا تعلیم ختم کرنے کے بعد ملازم ہو جانا شادی کی تمثیل کو کامیاب کرنے کے لئے بہت اچھا پس منظر ہے۔ وہ یہ تو نہیں سمجھتے کہ زمانۂ حال میں تنہا نوجوان کس قدر کم خرچ پر گزارہ کر سکتا ہے اور شادی ہونے کے بعد بیوی کے اخراجات کس قدر بڑھ جاتے ہیں اور پھر بچے تو آفتِ جاں ہو جاتے ہیں۔ اب تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہم اپنی تنہائی کے خلا کو پُر کرنے کے لئے یہ کرتے ہیں کہ کبھی سینما چلے جاتے ہیں، کبھی شام کو ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ کبھی گھوڑ دوڑ اور کبھی شہر میں سرکس آ جائے تو وہاں احباب کے ساتھ حاضری ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ زندگی کچھ اتنی گراں نہیں۔ عورت کے لئے فی الحال اپنی آمدنی سے جو خراج ادا کرنا پڑتا ہے وہ صرف وہی ہے جو کبھی کبھی گانا سننے کے لئے دینا پڑتا ہے اور بس۔ لیکن شادی کے بعد تو سب کچھ شاید سنگار میز کی آرائش کے لئے بھی کافی نہ ہو سکے۔ ان بھلے لوگوں سے پوچھئے کہ ہم آپ کا کیا بگاڑ رہے ہیں جو ہماری آزادی آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

طرہ اس پر یہ ہے کہ ہم ابھی تک ہونے والی بیگم سے ہی آشنا

دُلہن

۲۹ر جنوری سنہ ۳۶ء آخر مجھے اس قدر تعلیم دلوانے اور میرے ارادوں کو بلند کرنے کا کیا مقصد تھا۔ جو نا گہاں مجھے حیوانوں کی طرح کسی مرد سے کس کر باندھ دینا تھا۔ خدا جانے ابا کو کیا ہو گیا ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ موسیقی اور مطالعہ کے سوا دنیا میں مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں لیکن پھر بھی والدہ کے اصرار پر فوراً اپنا فیصلہ دینے کے لئے تیار ہو گئے کہ میری شادی ہونی چاہئے اور ضرور ہونی چاہئے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی ہوں کہ ایک رقعے میں اپنے جذبات قلمبند کر کے ابا کی میز پر رکھ دوں۔ مگر باجی میری جان کھا گئی ہیں۔ میں نے جب سے اُن کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہے۔ وہ پند و نصائح کے دریا بہاتی رہتی ہیں اور میری ہمت کو پست کرتی رہتی ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ تو بے قاعدگی نہیں کہ لڑکی سے پوچھے بغیر اس کا بیاہ رچا دیا جائے لیکن اُن کے نزدیک یہ بے حیائی ضرور ہے کہ لڑکی شادی کرنے سے انکار کر دے۔ لڑکا لاکھ تعلیم یافتہ سہی، آزاد خیال سہی، ہر طرح سے معقول انسان سہی لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ میرے لئے موزوں خاوند کیسے بن سکتا ہے؟ ابا کو کیا معلوم کہ آج کل کے نوجوان کن کن غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اپنی دانش، اپنے علم اور اپنے تدبر کے سامنے وہ تمام حکما کی زیرکی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ دو شعر پڑھ لئے تو لقادین گئے۔ سینما میں ایک دو گانے سن لئے تو تان سین پر آوازے کسنے لگے۔ ایم اے کی ڈگری لے لی تو یہ سمجھ لیا کہ اپنے مضمون میں وہ اُستادِ زمانہ ہیں۔ ذوقِ سلیم تو فطرت نے مردوں کو ودیعت ہی

نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کالج کی ابتدائی جماعتوں تک تعلیم پا چکی ہیں۔ ہوگا! ہم نے تو انہیں شہر میں رہتے ہوئے کبھی کسی مباحثے، کسی لیکچر، یا کسی سماجی اجتماع پر آتے نہیں دیکھا۔ اگر آئی بھی ہوں گی تو نقاب اوڑھے ہوئے۔ میں تو یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ وہ میرے ساتھ عوام کے سامنے نقاب پہن کر چلیں۔ کوئی اُن کی زیبائش کو اچک کر تھوڑا لے جائے گا۔ لوگ گھورتے ہیں تو گھورنے دو۔ خود بخود گھورنا چھوڑ دیں گے۔ ہمیں تو ایک رفیقِ حیات کی ضرورت ہے اس لئے ہم تو انہیں ہر تقریب، ہر اجتماع اور زندگی کی ہر دلچسپی میں مساوی شرکت کے لئے مجبور کریں گے۔

۱۳ر جنوری سننہء۔ لو دہی ہوا نا! والد نے گھوڑے کو بیل کے ساتھ کس کر باندھ دیا ہے کہ نہ چلے اور نہ چلنے دے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شادی سے قبل بیگم کے والدین نے اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ہمیں اپنی بیگم سے ملاقات کا موقع نہیں دیا تو نہ سہی شادی ہونے پر یہ حسرت اچھی طرح سے نکال لی جائے گی۔ اُن کے ساتھ سینما پر جایا جائے گا۔ اُن کے ساتھ کھانا کھایا جائے گا۔ وہ موسیقی کی ماہر ہیں اُن سے گانا سنا جائے گا۔ کچھ شعر و سخن پر گفتگو ہوگی اور اگر ہو سکا تو شام کے لیکچروں پر بھی اُن کی معیت سے بہتر نشست حاصل کی جائے گی۔ لیکن یہ سب توقعات موہوم تھیں۔ بیگم تو ہمارے گھر آنے پر کچھ اِس قدر خاموش ہیں اور ہر ایک ہنگامے سے اس قدر بیزار ہیں کہ ہمیں بھی گوشہ گیر ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ نہ سینما جاتی ہیں نہ لیکچر سنتی ہیں نہ اور کسی موضوع پر گفتگو کرتی ہیں۔ کل شام باجہ سامنے لا کر رکھا۔ کئی ایک عزیزوں نے منت خوشامد کی کہ کچھ سنائیے مگر انہیں تو ایسی چُپ لگی ہے گویا زبان ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ تنہا کوئی کتاب لے کر بیٹھ رہتی ہیں اور اگر کوئی آ جائے تو وہ بھی ایک طرف پھینک کر کرسی پر سمٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ حیران ہوں کہ اچھے پڑھے لکھے بُت سے پالا پڑا ہے۔ میں نے تو تنگ آ کر اُن سے یہی کہہ دیا ہے کہ اگر آپ اسی طرح خاموش رہیں گی تو میری طبیعت بہت مکدر ہو جائے گی۔ مگر اُن پر نہ التجا کا اثر ہے نہ فہمائش کا۔ بس اپنا سر پیٹو اور چپکے ہو رہو۔ میں نہ کہتا تھا کہ پردہ کرنے والی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اچھی بیویاں نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ ... سستی ان کی گھٹی میں داخل ہوتی ہے اور یہ ہر موقعہ پر اپنی اِس قبیح فطرت ... پردے میں مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔

نہیں کیا۔ زندگی کے لطیف رُخ سے محظوظ ہونے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

سنتی ہوں کہ میرے ہونے والے خاوند نہایت آزاد خیال ہیں پردے کے بھی حامی نہیں۔ لیکن یہ لوگ کیا جانیں کہ مرد آزاد خیال ہونے کے باوجود کس قدر غلام پسند ہوتا ہے، وہ اپنے لئے تو ہر ایک طرح کی آزادی پسند کرتا ہے۔ اپنی خواہشات کو توبے راہ رو راہوار کی طرح پورا کرتا ہے۔ لیکن جب صنفِ نازک اور خصوصاً اپنی بیوی کے حقوق اور اُس کی آزادی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو اُس کا رویہ مایوس کن حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے۔

۱۳ر جنوری سننہء۔ خدا جانے یہ مرد اس قدر بے باک کیوں ہوتے ہیں! دو اور دو چار گھنٹے شادی کو نہیں ہوئے اور ہم سے تقاضا شروع ہو گیا کہ گانا سناؤ۔ ابھی مہمان بھی رخصت نہیں ہوئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ سینما پر چلنا چاہئے۔ نہ پہلے کی جان نہ پہچان اور یہ استفسار کر دیا جاتا ہے کہ شیلے اور کیٹس میں سے مجھے کون سا شاعر زیادہ مرغوب ہے؟ آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ ایک اجنبی اور وہ بھی مشرقی عورت سے کیسے توقع کرتے ہیں کہ ایک دن میں وہ آپ سے اس قدر کھل جائے گی کہ شیلے اور کیٹس پر بحث کرنے لگے گی۔ تمام عزیز و اقارب کے سامنے گانا گائے گی اور شام کو آپ کے ساتھ سینما پر بھی چلی جائے گی؟ ہمارا گھر مشرقی گھر ہے۔ اُس میں ساس بھی ہے، خسر بھی ہے، دیور بھی ہیں، نند بھی ہے۔ بھلا اِن سب کی موجودگی میں میں یہ رویہ کس طرح رکھوں کہ چونکہ ہم نے شادی کی ہے اس لئے اب صرف ہمیں ہی اس گھر میں رہنا ہے اور جس طرح ہمارا جی چاہے ویسے ہی رہنا ہے۔ حفظِ مراتب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں! تحصیلِ مسرت کا مفہوم یہی ہے کہ ہم اپنی لذت کے لئے حیا کو بالائے طاق رکھ دیں۔ میں ابھی نامانوس فضا سے آشنا بھی نہیں ہوئی اور اُن کی طرف سے یہ شکایت بھی شروع ہو گئی ہے کہ میں نہایت ہی اَن سوشل ر (unsocial) ہوں۔ کیا سوشل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ میں پردہ اٹھا کر ان کے ساتھ بھاگتی پھروں۔ ذرا دم لیں یہ حسرت بھی نکل جائے گی۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ ہمارے مرد اپنی عورتوں کا سوشل ہونا کس قدر پسند کرتے ہیں۔ رشیدہ کے خاوند کو ہی لو۔ شادی کا سلسلہ تو کلب کی ملاقات سے شروع ہوا اور اب شادی ہو گئی ہے تو بے چاری کو اتنی اجازت بھی نہیں کہ بے پردہ سہیلیوں کو اپنے گھر پر ہی دعوت دے سکے۔ اب اس کے شوہر کے مسلمان ہمسائے اس پر معترض ہوتے ہیں۔

۴ر فروری سنہ ء سینما پر دوستوں اور بیوی کے ساتھ جانے میں بہت فرق ہے۔ دوست ہنسی کا موقع نہ بھی ہو تو ہنستے ہیں، بیوی ہنسی کا موقع ہو تو بھی نہیں ہنستی۔ رات میں نے بہتیری کوشش کی کہ بیگم پاس بیٹھی ہوئی ہندو یا انگریز عورت کی طرح فلم سے محظوظ ہوں، لیکن خدا جانے وہ اس قدر رنجین کیوں ہیں کہ متبسم ہونے کے سوا انہوں نے کوئی ریمارک دیا اور نہ قہقہہ لگایا۔ اسی طرح تو ہماری عورتوں کی زندگی ملول ہو جاتی ہے۔

باہر نکلنے پر میں نے کہا بیگم پیدل چلو گی؛ اس طرح سیر ہو جائے گی، بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے بازو میں بازو دے کر چلنا چاہا تو بیگم نے جھنجلا کر اپنا بازو الگ کر لیا، اور کہنے لگیں۔ آپ تنہا چلیں میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گی، میں کچھ دیر تک تو چلتا رہا، پھر مجھے اپنی حرکت مضحکہ خیز نظر آنے لگی۔ مجبوراً میں نے تانگہ لے لیا اور ہم تانگے پر واپس آئے۔ راستے میں فلم پر تنقید کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے بیگم سے یہ کہا کہ وہ اپنی رائے دیں لیکن انہوں نے کہنی سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ میں نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے نہایت دھیمی آواز سے کہا۔ بھلا تانگے میں بیٹھ کر تانگے والے کے سامنے بھی کوئی بات کرتا ہے۔ اس وقت خاموش رہنا بہتر ہے، میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور راستہ بھر اس منطق اور اس فلسفۂ اخلاق پر غور کرتا رہا جس کی رو سے ہماری بیگم نے بیک جنبش زبان تانگے میں بیٹھ کر گفتگو کرنے کو حدود اخلاق سے تجاوز کرنے کے مترادف قرار دیا تھا۔

۱۵ر فروری سنہ ء بیگم کل شام گاتی رہیں۔ کچھ سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ میں تو سیر پر گیا ہوا تھا۔ واپس آنے پر والدہ نے اس کا ذکر کیا اور اس انداز میں جیسے وہ اس فعل کو نہایت برا سمجھتی ہیں۔ نہ جانے کیوں! کہہ رہی تھیں پڑوسن کہہ رہی تھی نئی بہو تو ناچنا گانا خوب جانتی ہے۔ ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ ڈھولکی کے ساتھ ہر طرح کے اچھے برے گیت گانے تو جائز ہیں لیکن ہارمونیم یا گھنگھروؤں کے ساتھ گانا مذموم ہے۔ خیر ہمیں اس سے کیا ہم تو خوش ہیں کہ بیگم نے بسم اللہ کی ہے۔ اب کبھی ہمیں بھی گانا سننے کا موقع مل جائے گا۔ مجھ سے ذکر ہوا تھا۔ ابھی وعدہ تو نہیں کرتیں لیکن شاید اصرار سے کام بن جائے۔

۲۲ر فروری سنہ ء رات شام کے کھانے کے بعد غالب کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ بیگم کو غالب کا فلسفۂ حیات نہایت ناپسند ہے۔ کہنے لگیں نہایت نامعقول شاعر تھا۔ شاعری اس کا ہی نام نہیں کہ تمہیں

۴ر فروری سنہ ء رات سینما پر ہی گئے۔ میں نے بہتیرا انکار کیا لیکن اُن کے اصرار کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔ تصویر مزاحیہ تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر سٹال میں ایک انگریز اپنی میم کو لئے بیٹھا تھا اور اُن سے پرے ایک ہندو خاتون ساری پہنے ہوئے اپنے پتی کا پہلو سنبھالے ہوئے تھیں آپ نے مجھ سے تقاضا کیا کہ میں برقع اتار دوں۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا ہاں روشنی بند ہونے پر میں نے نقاب اٹھا دیا تاکہ تصویر صاف نظر آئے کھیل کے دوران میں سب لوگ ہنستے رہے۔ لیکن میم تو اس قدر بے محابانہ قہقہے لگاتی کہ اس کی چیخیں تمام ہال میں سنائی دیتیں۔ ہندو خاتون کا بھی کوئی کوئی قہقہہ بلند ہوتا لیکن شاذونادر میں صرف متبسم ہونے پر قانع تھی۔ اس کی وجہ کچھ عادت اور کچھ مجبوری لیکن وہ اس سے مطمئن نہ تھے۔ میرے تبسم کو قہقہوں میں تبدیل کرنے کے لئے انہوں نے بارہا مجھے گدگدایا، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

وقفہ میں نیچے کے تمام مردوں نے سٹالز کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ تھرڈ کلاس میں جن لوگوں کو بیٹھے بیٹھے ہم نظر نہ آتے تھے وہ کھڑے ہو کر بلکہ ایڑیوں پر کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ میں نے تو گھبرا کر نقاب چہرے پر پھینک دیا وہ کہتے رہے کوئی کچا چبا کے تھوڑا ہی جائے گا۔ وہ دیکھو دوسری عورتیں بھی تو ننگے منہ بیٹھی ہوئی ہیں، لیکن مجھ سے تو عوام کی نگاہوں کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ خدا جانے کیوں جب ہم باہر نکلنے لگے تو ہمارے دیر سے باہر آنے کے باوجود دروازے پر دو رویہ کئی مرد کھڑے ہوئے تھے جو باہر نکلنے والی ہر عورت کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے تو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔

۱۵ر فروری سنہ ء کل شام بلقیس، اوشا، اور رشیدہ مجھے ملنے آئیں۔ کالج کے ایام کی سہیلیاں ہیں۔ گول کمرے میں بیٹھے ہوئے انہوں نے چائے کے بعد مجھے مجبور کر دیا کہ میں گانا سناؤں۔ پاؤں سے گھنگھرو بجانا میرا مرغوب ساز ہے۔ گانے اور ہارمونیم کے ساتھ گھنگھرو بھی بجتے رہے بلقیس کی داد بہت بلند آہنگ تھی۔ خورشید امن کچھ اس داد سے متاثر ہو کر اور کچھ تجسس کی خاطر ننگے پاؤں میری پشت پر آ کر کھڑی ہو گئیں سہیلیاں کچھ عرصہ تک شرارت کرنے کے خیال سے خاموش رہیں، پھر جب اُن کے قہقہے لگانے پر میں نے مڑ کر دیکھا تو خورشید امن کی پیشانی پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ میں محجوب سی ہو گئی اور گانا بند کر دیا۔

۲۲ر فروری سنہ ء

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

بھلا جو شخص اس قدر یاس انگیز شعر کہے وہ اچھا شاعر کیسے ہو سکتا ہے۔ سارا

زندگی میں مایوسی کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ اقبال کو دیکھو کس قدر عملی زندگی کی تلقین کرتا ہے اور اس کے علی الرغم غالب کو زندگی کی کشمکش سے مغلوب ہونے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ میں نے بہتیرا کہا کہ غالب شاعری کا بادشاہ ہے۔ جدت طرازی اور خیالات کی بلند پروازی اس کے ہی حصے میں آئی تھی اور زندگی کے گھناؤنے رُخ کو واضح کرنے میں اُس نے کون سا قصور کیا ہے۔ آخر زندگی ایک المیہ نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن میرے دلائل کسی کام نہ آئے۔ آخر تنگ آ کر میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ عورتیں اور بالخصوص اپنی بیویاں مردوں کا بہانت ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ زبان جب چلنے لگتی ہے تو رکتی ہی نہیں۔

۸ مارچ ـــــء دوپہر کے کھانے پر انتظار کرنا شروع کیا۔ اسی انتظار میں ایک مدت گزر گئی لیکن بیگم گول کمرے سے ہلنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ ایک دو دفعہ بلابھی بھیجا لیکن خادمہ کو ٹال دیا۔ آخر جل بھن کر تنہا کھانا کھالیا۔ لیکن دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ آج بیگم کو دو چار کھری کھری سنانی پڑیں گی اور تو سب لوگوں سے پردہ ہے لیکن حسن سے پردہ نہیں کیونکہ وہ بھائی کا دوست ہے اور بچپن میں اُن کے ساتھ کھیلا ہوا ہے۔ میں پردے کا حامی نہیں۔ لیکن یہ کیا کہ کسی سے پردہ ہو اور کسی سے نہ ہو۔ مانا حسن نہایت ہی شریف لڑکا ہے اور بیگم کی عزت بہنوں سے زیادہ کرتا ہے لیکن مجھے یہ ملاقاتیں پسند نہیں۔

آخر کار بیگم حسن کو رخصت کر کے آئیں۔ میں بھرا بیٹھا تھا۔ کھانا بھی نہ کھانے دیا اور برس پڑا کہ آج آپ کا پردہ کیا ہوا۔ خدا جانے کیا کیا کہتا رہا۔ بہرحال دل کا غبار نکال لیا۔ بیگم خاموشی سے سنتی رہیں میری کسی بات کا جواب نہ دیا اور کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئیں والدہ نے کہا روٹھ گئی ہیں بلا سے روٹھ گئی ہیں تو آپ ہی من جائیں گی۔

۱۵ مارچ ـــــء میں نے کہا نیو تھیٹرز کی نہایت عمدہ فلم 'مایا' آئی ہے۔ دیکھنے چلیں گی۔ کہنے لگیں 'نہیں۔ اول تو میں ہندوستانی تصویریں پسند ہی نہیں کرتی اور دوسرے میں نے ایک سہیلی سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم کوئین کر سنیما دیکھنے جائیں گے۔ میں نے کہا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اس پر ناراض ہو گئیں کہ میں اُن کے معاملات میں کیوں دخل دیتا ہوں جب کہ وہ مجھ سے کسی طرح کا تعرض نہیں کرتیں اس کے بعد پھر ہندوستانی تصویروں کی تنقیص شروع کر دی۔ اس سے میں چڑ گیا۔ کہنے لگیں ہندوستانی تصویریں کس کام کی ہوتی ہیں۔ نیو

دیوان دیکھو۔ نوے فی صدی اشعار اسی مضمون کے حامل ہوں گے کہ دست و بازو توڑ کر بیٹھ جاؤ۔ اس زندگی میں غم و رنج کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں کشمکش حیات کا انجام فنا ہے۔ اس لئے کوئی کوشش فضول ہے۔ یہ ہے غالب کی شاعری۔ نوجوان کے لئے میرے خیال میں اس کا مطالعہ تو عملی زندگی کے لئے زہر کا اثر رکھتا ہے۔ میں نے جو سیدھے سادے الفاظ میں اس قدر ناگوار تبصرہ غالب کی شاعری پر کیا تو مجھ پر بگڑ گئے کہنے لگے تم ناحق الجھنے لگتی ہو۔ نہ کچھ سمجھ ہے نہ عقل بس زبان تمہاری چلتی ہے اور لٹھ لے کے تم پیچھے پڑ جاتی ہو۔ یہ ایک ادبی ہنگامے کا ذکر ہے کہ اُن کی مرضی کے خلاف ذرا سی بات ہوئی تو بگڑ بیٹھے۔ کوئی کہے ایسے لوگوں سے بات کرنا اچھا ہے یا خاموش رہنا بہتر

۸ مارچ ـــــء۔ یہ آج معلوم ہوا کہ حضرت کس قدر آزاد خیال ہیں حسن بھائی آئے ہوئے تھے۔ میں اُن سے باتیں کرتی رہی۔ اُس کمبخت سے کہا بھی کہ کھانا کھالو مگر وہ اس قدر شرمیلا ہے کہ انکار ہی کرتا رہا۔ مجبوراً میں بھی اُس کے پاس ایسے ہی بیٹھی رہی اور جب اُسے رخصت کر کے کھانا کھانے گئی تو وہ بے اختیار مجھ پر برس پڑے۔ طرح طرح کے طعنے دئیے۔ کبھی پردے کو ہدف ملامت بنایا کبھی مجھے کوسا۔ وہ تو خوشدامن کا بھلا ہو جس نے انہیں خاموش کرایا ورنہ خدا جانے وہ کیا کر بیٹھتے۔ میں خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آ کر رونے لگی اس سے دل کی کچھ بھڑاس نکلی۔

میں سوچ رہی ہوں کہ یوں تو ہر روز پردے کے خلاف لکچر دیا کرتے تھے آج انہیں کیا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ منہ سے باتیں کرنا آسان ہے اور کسی کام کو صحیح معنوں میں سمجھنا دشوار ہے۔ میں پہلے دن سے ہی سمجھتی تھی کہ دوسرے لوگوں کی بیویوں کو بے پردہ دیکھ کر اپنی بیوی کو بھی بے پردہ رکھنے کی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بیوی کی اس آزادانہ روش کو پھر مرد آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ منہ سے کچھ نہ کہے جی میں ضرور کڑھتا ہے۔

۱۵ مارچ ـــــء۔ یوں تو ہر ایک بات میں رائے ظاہر کرنے کے لئے استفسار کیا کرتے تھے۔ لیکن جب ہم نے رائے ظاہر کرنی شروع کی ہے تو بگڑنے لگے ہیں۔ کل میں رقیہ کے ساتھ انگریزی فلم دیکھنے کے لئے جانا چاہتی تھی تو آپ اِس پر مصر ہوئے کہ نہیں ہندوستانی تصویر دیکھنی چاہئے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس پر آپ نے بحث شروع کر دی۔ میں نے پھر انگریزی اور ہندوستانی تمثیلوں کا مقابلہ کیا تو آپ اور چڑ گئے اور بالآخر نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق آپ نے یہ فیصلہ ... کہ ہم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ غنیمت یہ تھا کہ رقیہ ابھی تک میرے

تھیٹر والوں نے چند ایک انگریزی تصویروں کی نقل کر کے نام پیدا کر لیا ہے۔ اب جو بھی اُلٹی سیدھی تصویر وہ اپنے مخصوص ایکٹرسوں سے بناتے ہیں۔ وہ مقبول ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انگریزی فلموں کی مثالیں دے کر جو لکچر دینا شروع کیا تو تھمتے ہی میں نہ آتی تھیں۔ الٰہی پناہ!

۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء شادی سے پہلے اُن بہت سی مصیبتوں کا گمان بھی نہیں ہوتا جو شادی کے بعد پیش آنے والی ہوتی ہیں۔ ہم سمجھے تھے کہ بیوی پڑھی لکھی، باپردہ اور حیادار عورت ہوں گی جس طرح جی چاہے گا اپنی مرضی کے مطابق چلاتے رہیں گے۔ لیکن یہ سارے قیاسات غلط نکلے۔ وہ ہر فعل اور ہر بات کی توجیہہ چاہتی ہیں۔ اب سارا دن اور سارا ہفتہ منطق کی مشق کرتے ہوئے کیسے بسر ہو۔ وہ ہر وقت اپنا نیا پروگرام بنائے رکھتی ہیں۔ ہم چپکے بیٹھنا چاہیں تو وہ گانا شروع کر دیتی ہیں۔ ہم سیر کو جانا چاہیں تو وہ خط لکھنے لگتی ہیں اور اعتراض کرو تو کہتی ہیں ہمارا معمول ہی یہی تھا۔ ہم حیران ہیں کہ شادی کی یہ گاڑی اس طرح کیسے چلے گی۔ آج تین دن ہو گئے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی۔ ایسے ہی کئی تین دن پہلے گزر چکے ہیں اور نجانے آئندہ کتنے آنے والے ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۳۶ء۔ ہم دونوں ایک ہفتے سے ایک دوسرے سے بگڑے ہوئے ہیں۔ رات بڑے میاں آئے۔ ساری عمر تو فوج میں گزارا ہے لیکن کبھی کبھی پتے کی بات بھی کہہ دیتا ہے۔ باتوں باتوں میں والد نے ہماری ازدواجی زندگی کے ناگوار کوائف کا اُن سے ذکر کر دیا۔ پڑوسی ہونے کی وجہ سے ہمیں بچپن سے جانتا ہے اور ہمارے حالات سے واقف ہے۔ ہمیشہ بزرگانہ انداز میں مخاطب کرتا ہے۔ کہنے لگا رفتہ رفتہ سنبھل جائیں گے۔ دو چار مہینے شادی کو ہوئے ہیں ابھی کون سا وقت گزر رہا ہے۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہا کیوں بیٹا تم نے شادی کر کے یہ سمجھا ہو گا کہ اب زندگی سراسر شادمانی ہو گی۔ نئی روشنی کے آدمی ہو نا۔ نئی نئی تجویزیں ذہن میں آتی رہیں۔ اپنی روایات سے پہلو کترا کر نئی طرح کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے رہے اور یہ نہ دیکھا کہ ہر ایک طرح کی نئی چیز اور بالخصوص بہت سے مغربی اثرات ہماری زندگی کو راس نہیں آتے۔ اب اس کوشش میں ناکام ہوئے ہو تو مایوس ہونے لگے ہو۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ دیانتداری سے شادی کے مسئلے کو نبھانے کی کوشش کرو۔ میاں بیوی میں ایک سمجھوتے کی ضرورت ہے جو تم نہیں کر سکے۔ اس پر غور کرو۔

بڑے میاں تو یہ کہہ کر چل دیئے اور میں کافی عرصے تک اُس کی باتوں پر غور

پر نہیں پہنچی تھی۔ میں نے نوکر کو رقعہ دے کر دوڑایا اور معذرت کر دی کہ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ کہیں وہ ہمارے ہاں آ نکلتی تو اُسے پتہ چل جاتا کہ ہمارے آزاد خیال شوہر کیا گل کھلا رہے ہیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں نہ کہتی تھی کہ مرد کسی صورت میں بھی اپنی خواہشات کی پامالی برداشت نہیں کر سکتا۔ شادی سے پہلے ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمارے شوہر نہایت آزاد خیال، تعلیم یافتہ اور بردبار انسان ہیں۔ لیکن شادی کے بعد اب پتہ چلا کہ اس آزاد خیالی اور بردباری کا مفہوم کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ میاں جو کچھ کہے وہ بیوی کرتی رہے تو میاں خوش اور نہ کرے تو میاں ناراض۔ پہلے کبھی پردے کی مخالفت ہوتی تھی کبھی ہماری خاموشی کی شکایت کی جاتی تھی کبھی ہمیں اَن سوشل کہا جاتا تھا۔ اب یہ نوبت آ پہنچی ہے کہ سیر کرنے کو پسند ہی نہیں کیا جاتا۔ گانے لگیں تو آپ کا سر درد کرنے لگتا ہے۔ کسی سہیلی سے ملنے جائیں تو آپ کو کوفت ہوتی ہے۔ کسی کو اپنے ہاں بلائیں تو اس سے ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ خدا جانے عورتوں میں کوئی خوبی بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ ہمارے میاں تو سمجھتے ہیں سب عورتیں احمق ہوتی ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۳۶ء۔ زندگی دن بدن ناگوار صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ بات بات پر تنازعہ ہوتا ہے۔ اُن کی طرف سے یا میری طرف سے۔ وہ میری ہر بات کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر بار مجھے شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اُن کا کام جب دلائل سے نہیں چلتا تو احکام پر اُتر آتے ہیں۔ بیوی کے فرائض کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں۔ کل صوفیا ملنے آئی میں نے اُس سے اپنی مصیبت کا ذکر کیا۔ صوفیا کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں میری باتیں سن کر مسکرا دی۔ کہنے لگی تم نے شادی کا غلط مفہوم ذہن میں قائم کیا تھا۔ میکے کے مردوں کی اور حیثیت ہوتی ہے۔ خاوند کی اور حیثیت ہوتی ہے۔ اُن سے خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہاں عمر کی رفاقت ہوتی ہے اور رفاقت کے لئے میاں بیوی کو شادی کے بعد زندگی میں ایک نیا توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ تم دونوں آج تک اپنا محاسبہ نہیں کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے مایوس ہو رہے ہو۔

صوفیا چلی گئی ہے۔ میں یہ سطور لکھتے وقت سوچ رہی ہوں کہ ان باتوں میں کچھ صداقت بھی تھی یا نہیں۔ میرے لئے تو وہ شادی کو ایک معما بنا کر چل دی ہے۔ لیکن اس معمے پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صوفیا کا تبصرہ پُر معنی!

۲۰ رمئی سنہ ء۔ توبہ خدایا ازدواجی زندگی کے ناگوار ایام بھی کس قدر تلخ ہوتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اب یہ سلسلہ منقطع ہو کر ہی رہے گا اور نہ صرف یہ ہو گا بلکہ ہماری زندگی ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گی۔ بھلا ہو بڑے میاں کا۔ چلتے چلتے چند باتیں کہہ گیا۔ میں سوچتا رہا تو معلوم ہوا کہ اُس کی باتیں غلط نہیں تھیں۔ نہ کوئی بات ہوتی ہے نہ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور گھر میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو انسان اور انسانی کمزوریوں کا حامل سمجھنے سے بہت سے تنازعات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک دو دن میں میاں بیوی کے باہمی تعلقات پر غور کرتا رہا اور آخر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے میں بیگم کے پاس چلا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں وعظ کرنے سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ کچھ معافی، کچھ وعظ، کچھ التجائیں اور کچھ وعدے کرنے سے کدورت دُور ہو گئی اور بیگم راضی ہو گئیں۔

۳۰ رجون سنہ ء۔ زندگی کا اس قدر ہموار ہو جانا بھی کس قدر عجیب ہے کہ کئی دنوں سے ڈائری میں درج کرنے کے لئے کوئی موضوع ہی نہیں ملا۔ کل میں ناول پڑھ رہا تھا۔ بیگم نے پیچھے سے آکر میری آنکھیں موند لیں۔ اُن کے ہاتھ مجھ سے کب چھپے رہتے ہیں۔ جب میں نے پوچھ لیا تو کہنے لگیں ہم آپ کو تب جانیں جب آپ وہ راز بھی پوچھ لیں جو میں آپ سے کہنے آئی ہوں۔ میں نے کہا بیگم میں جوتشی تو ہوں نہیں۔ بیگم کچھ لجائیں اور میرے کان کے قریب جھک کر کچھ کہا . . . میں نے حیران ہو کر کہا۔ کیا یہ سچ ہے؟ بیگم کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور متبسم ہو کر سر کو اثباتی انداز میں ہلا کر کمرے سے نکل گئیں۔

۳۰ راگست سنہ ء۔ کل صبح کوٹھی کے برآمدے میں ہم دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ بیگم لاابالیانہ انداز میں کہنی کے سہارے مجھ پر جھکی ہوئی تھیں سامنے دور، گھاٹی سے پرے، پہاڑی کی چوٹی پر سفید سفید بادل گھر گھر کر جمع ہو رہے تھے۔ یکایک مجھے کچھ سوجھی میں نے بیگم کو مخاطب کر کے بادلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

'وہ دیکھا؟'

'ہاں' اور پھر اپنے جواب سے اچانک مطمئن نہ ہو کر بولیں 'کیا؟'

میں نے توضیح کرتے ہوئے دہرایا 'وہ سفید سفید بادل جو پہاڑی کی چوٹی پر جمع ہو رہے ہیں'

بولیں 'ہاں دیکھے!'

۲۰ رمئی سنہ ء۔ میں منہ پھلا کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ آئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب کوئی اور قضیہ برپا ہو گا۔ لیکن صوفیا کی باتوں پر غور کرنے کے بعد میں نے دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ میں انہیں ناراض ہونے کا موقع نہ دوں گی۔ لیکن دل میں ڈر ضرور رہی تھی۔ انہوں نے آتے ہی کچھ خجالت آمیز لہجے میں مجھے پکارا۔ میں نے جواب تو نہ دیا لیکن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آپ نے چھوٹتے ہی گِلوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اپنے احسانات میری بدسلوکیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی اور پھر گفتگو کا رُخ بدل کر صلح و آشتی کی تجاویز پیش کیں۔ میں پہلے ہی اس کے لئے تیار تھی لیکن میں نے یہ ضرور کہہ دیا کہ وہ تمام شکایات جو انہوں نے میرے خلاف کیں وہ اس لحاظ سے بے جا تھیں کہ یہ سب کچھ اُن کے ایما سے ہوا تھا۔ شادی کے ابتدائی ایام میں اُن کے جو تقاضے مجھ سے ہوتے تھے وہ پورے کرنے پر انہیں ناگوار گزرے اور وہ خواہ مخواہ بگڑنے لگے۔

بہر حال اس ملاقات میں بحث کی بجائے دونوں طرف سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش کامیاب رہی۔

۳۰ رجون سنہ ء۔ کل میں نے اُن سے ایک راز کہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ بعد میں وہ پکارتے رہے لیکن میں نہ گئی۔ پھر میرے کمرے میں آ گئے۔ خوشدامن بھی پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب مجھے لے جانے کے لئے مصر ہوئے تو میں نے کہا کہ میں اس شرط پر جا سکتی ہوں کہ آپ مجھ سے اُس راز کے متعلق کوئی بات نہ کریں جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ وہ مان گئے۔ اپنے کمرے میں لے جا کر مجھ سے پہاڑ پر جانے کے متعلق مشورہ کرتے رہے اور یہ طے پایا کہ تیسرے دن پہاڑ جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

میں نے کہا 'میری محبت بھی اسی طرح ہے جو گھر گھر کر اپنے مقصود کے گرد جمع ہوتی رہتی ہے، اور زیادہ ہونے پر اور زیادہ ہونے کی تمنا کرتی ہے!'

بیگم مسکرائیں اور پھر دفعتہً کہنے لگیں 'یہ سچ ہے لیکن اُس پہاڑی کو بھی دیکھا کہ اپنی قلیل گرانباری کے ساتھ مستقل طور پر قائم ہے۔ بادل اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں، پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ پہاڑی نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ میری محبت تو اس کی مانند ہے۔ اسے بادلوں کی طرح بکھرنا نہیں آتا'،

بیگم یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں اور میں [illegible]

(یہ اندراج دونوں ڈائریوں میں طرز بیان کے سوا ایک مفہوم درج ہے)

نسیم رضوانی

خدا اور انسان

جہاں طراز ہے تو، رونقِ جہاں ہوں میں
فسانہ ساز ہے تو، جانِ داستاں ہوں میں

یہ کائناتِ عظیم و وسیع و لامحدود
ترا سفینہ ہے، لیکن سفینہ راں ہوں میں

ترے فرشتوں میں تھا زندگی کا سوز اگر
ازل سے کس لئے پھر وقفِ امتحاں ہوں میں

تو اک کنایۂ جاں بخش و روح پرور ہے
اور اک گداز سے لبریز داستاں ہوں میں

مرے لہو سے ہے شاداب ہر پیام ترا
جگر کے خون سے سینچی ہوئی اذاں ہوں میں

یہ مانتا ہوں کہ تو نے مجھے بنایا ہے
مگر تجھے بھی نہیں علم اب کہاں ہوں میں

مرے شعور و تخیّل کی وسعتوں کے حدود
مری نظر سے بھی گم ہیں، کہ بیکراں ہوں میں

عجب جنوں مری فطرت میں شعلہ افگن ہے
کہ بے قرار مثالِ یمِ رواں ہوں میں

مثالِ سنگ ہوں مضبوط و سخت و بے پروا
مثالِ شمع ضعیف اور نرم جاں ہوں میں

کبھی خرد کے یقیں پاش دام میں ہوں اسیر
کبھی یقیں کی فضاؤں میں نغمہ خواں ہوں میں

ہزار تلخ حوادث ہیں راہ میں حائل
کہ جن کے غم سے جگر چاک و نیم جاں ہوں میں

تو میری روح کے اعماق میں اگر اُترے
تو اُس مقام پہ آئے اگر، جہاں ہوں میں

عیاں ہو تجھ پہ خدائی بھی گو کہ مشکل ہے
بہت دقیق مگر اس سے میری منزل ہے

عدم

نیپال کے دیہاتی اور اُن کے گیت

نیپال کی خوشگوار سرزمین گویا قدرت کی خوبصورتیوں کا پنگوڑا ہے جو ہمالیہ کی جنوبی ڈھلانوں پر واقع ہے۔ کسی دُور کے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو برف سے ڈھکی ہوئی اور آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹیوں کے نیچے اس کی ڈھلانیں ایک ایسے بزرگ کے چوڑے ماتھے کی مانند نظر آتی ہیں جس کے سر کے سفید بال اس کی بڑی عمر کا پتہ دے رہے ہوں اور کہیں کہیں ذرا نگاہ کو جما کر غور سے دیکھا جائے تو نیپال کے گاؤں سرسبز کھیتوں اور ہری بھری گھاٹیوں کے درمیان ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا ایک کنواری لڑکی کی سبز اوڑھنی پر خاکی رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور گمان ہوتا ہے کہ شاید مہابھارت کے زمانے کے کسی نوجوان شاعر کا رنگین خواب دیہات کی شکل میں بدل گیا ہے۔ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے ہنس مکھ بچے جب کھیتوں کے درمیان اچھلتے کودتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ وہاں اُگنے والے پودوں کے خوب صورت پھولوں میں جان پڑ گئی ہے۔ بہت سی جگہ پہاڑیوں پر سے گرنے والے پانی کی آواز اور چھوٹی بچیوں کے گیتوں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔ وہاں کے لوگ روپے پیسے کے لحاظ سے تقریباً برابر ہیں اس لئے امیر و غریب کا سوال باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان پیار اور محبت بہت زیادہ ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا ہی رشتہ دار سمجھتے ہیں۔ ان باتوں کو سوچ لینے کے بعد ان کے گیتوں کو پڑھا یا سنا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان کا ہر بول ایک سچی آواز ہے جو واقعی اُن کے دل سے نکلتی ہے۔ دن بھر کھیتی باڑی یا دوسری قسم کے کاموں سے جب وہ تھک جاتے ہیں تو سورج چھپنے کے بعد اپنے ہی بنائے ہوئے گیتوں سے اپنا دل خوش کرتے ہیں "تاکہ دوسرے روز تازہ جوش کے ساتھ دوبارہ کام کرنے کی ان میں طاقت پیدا ہو جائے۔ سب لوگ ہندو دھرم کو مانتے ہیں اور بڑے سچے دل سے پوجا پاٹ میں حصہ لیتے ہیں اس لئے ان کے گیتوں میں دیویوں اور دیوتاؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے لیکن سب سے زیادہ اچھے پریت کے گیت ہیں جن کو گا گا کر وہ کنواری لڑکیاں اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہیں جنہیں کچھ پریم کرنا آ گیا ہے

ملک کی آب و ہوا کا بھی گیتوں سے بہت تعلق ہوتا ہے اس لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نیپال میں ہر قسم کی آب و ہوا اور سال کے تمام موسم اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ برسات کا موسم بہت خوب ہوتا ہے۔ اس موقعے پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی سنگت میں ان کے گیت اور زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

ایک ہندو راجہ اُن پر حکومت کرتا ہے۔ مگر ہمیشہ سے راجہ اور پرجا کا میل جول آپس میں باپ بیٹوں کا سا ہے اس لئے تمام لوگ بڑی خوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سال میں بے شمار میلے اور تہوار منائے جاتے ہیں جو یاترا کہلاتے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت مشہور ہیں۔ مثلاً بھیراب یاترا۔ رگائی یاترا۔ اندرا یاترا۔ مچھندرا یاترا اور رتھ یاترا وغیرہ ان موقعوں پر بدھمت کی روایات اور عقیدوں کو گیتوں اور ناچوں کی شکل میں سنایا اور دکھایا جاتا ہے اور بہت خوشی منائی جاتی ہے۔ سوائے نیپالی بولی کے کوئی دوسری زبان نہیں بولی جاتی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہونے کے باوجود اس قدر مختلف ہے کہ دوسری جگہ کے لوگ اسے مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ خود نیپال ہی میں بعض دیہاتوں کی بول چال میں فرق ہے لیکن اتنا نہیں کہ وہاں کے لوگ بھی اسے نہ سمجھ سکیں۔ بڑے تہواروں کے موقعوں پر مرد عورت بچے بوڑھے دور دور سے آ کر ایسی جگہوں پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں دو ندیوں کا سنگم ہے۔ وہ کوشش کر کے ایک دوسرے کے ناچ کی نقل اتارتے ہیں اور گیت یاد کر لیتے ہیں تاکہ اپنے اپنے گاؤں میں جا کر اُن سے دوبارہ لطف حاصل کر سکیں۔ ان کے ناچنے کی جگہ کو "رودری گھر" کہتے ہیں جو چودھری کے مکان کے قریب چوپال کی طرح

ہر شخص کے لئے عام ہوتا ہے۔

ایک خاص قسم کا ناچ جسے سورتی کہتے ہیں فصل تیار ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔ اس میں رسم و رواج کے مطابق صرف نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شامل ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تاکہ اگر وہ چاہیں اور ضرورت ہو تو اپنے لئے خود ہی بر تلاش کرلیں۔ پریم کے وہ دلچسپ گیت اور ناچ انکی رگوں میں تازہ خون دوڑا دیتے ہیں۔ یہ گیت عموماً مکالمے ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکے بڑے جوش کے ساتھ اپنا پریم ظاہر کرتے ہیں اور لڑکیاں کسی قدر شرماکر لیکن دل لبھانے والے انداز سے ناچتی ہیں اور اس پریم کا جواب پریم کے الفاظ میں گا کر دیتی ہیں۔ بعض دفعہ بڑے زور کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اگر مرد پریم ظاہر کرتے ہوئے اپنے گانے سے عورت کو ہرا دے تو اس کے ساتھ شادی کرنے کا اسے حق حاصل ہو جاتا ہے اور عورت انکار نہیں کرسکتی لیکن اگر وہ خود ہار جائے تو پھر عورت کی مرضی ہے خواہ وہ اس کے ساتھ رشتہ پسند کرے یا نہ کرے۔ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر رقابت بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کا انجام بُرا رہتا ہے۔

ان کے گیتوں میں ان کے پیشوں کا حال بھی اپنی جھلک دکھا دیتا ہے۔ مثلاً کھیتی باڑی کرنے والے فصل وغیرہ کا اور گڈریئے اپنی گائے بھینس اور بھیڑ بکری کا کسی نہ کسی طرح ذکر کر دیتے ہیں۔ وہ نوجوان لڑکیاں جن کی جان کو پریم کا دکھ گھلا رہا ہو۔ ایسے ناچ گانے میں حصہ نہیں لیتیں اور اگر آئیں تو اپنے دل کے درد بھرے راگ سے سب کو رُلا جاتی ہیں۔

گیتوں کے ساتھ ساتھ جو ناچ ہوتا ہے۔ اسے وہ اپنی زبان میں "لاکھما" کہتے ہیں جو ہندوستان کے عام دیہاتی ناچوں سے ملتا جلتا ہے۔ بعض غریب دیہاتی گانے بجانے سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ کبھی اس گاؤں میں اور کبھی اُس گاؤں میں ان کا دورہ رہتا ہے۔ ایک جگہہ چند دن قیام کیا اور پھر دوسری جگہہ کی راہ لی۔ اگر وہ تنہا ہوں تو عموماً درد بھرے راگ گاتے ہیں۔ ایسے گانے والوں کو "آ آئینے" کہتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ٹولیاں بنا بنا کر نکلتے ہیں۔ عورتیں ناچتی ہیں اور مرد گاتے بجاتے ہیں۔ یہ مذہبی روایات تاریخی واقعات یا فرضی قصوں کی نقل اتارتے ہیں۔ ایسے مردوں کو "بھانڑ" اور عورتوں کو "بھان رینی" کہتے ہیں۔

ان دیہاتی گیتوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جو موضوع، وقت اور جگہہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان میں سے چودہ قسم کے گیت خاص طور پر مشہور ہیں۔

نمبر ۱۔ جھیاؤرے گیت۔ یہ زیادہ لمبے نہیں ہوتے۔ بلکہ رباعی کی طرح صرف چار مصرعے ہوتے ہیں۔ محبت سے متعلق ہر قسم کا خیال اسی کے لئے مخصوص ہے۔

نمبر ۲۔ سوائی گیت۔ ان میں مشہور کہانیاں ہوتی ہیں۔ جیسے ہمارے ہندوستان میں بھی بہت سے قصے نظم میں ہیں۔ ان کا موضوع کوئی خاص نہیں ہوتا۔

نمبر ۳۔ مالسیری گیت۔ یہ درگا پوجا کے تہوار پر گائے جاتے ہیں ماتا درگا نے برائیوں کے دیوتاؤں پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا ذکر ان گیتوں میں ہوتا ہے۔

نمبر ۴۔ بھائیلو گیت۔ یہ فقیروں کی دردناک صدائیں ہیں جو بھیک مانگتے وقت لوگوں کے دروازوں پر لگائی جاتی ہیں۔

نمبر ۵ جُھاری گیت۔ یہ بھی جھیاورے گیتوں کی طرح مختصر رباعیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان میں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ میلوں اور تہواروں کے موقعوں پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انہیں گاتے ہیں اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔ اُن کے ذریعہ ایک دوسرے پر پریم جتایا جاتا ہے۔

نمبر ۶۔ سانگینی گیت۔ ایک خاص تہوار کے موقعے پر جس کا نام "تز" ہے بہت ساری عورتیں مل کر گاتی ہیں۔ ان کا جمگھٹ کسی مندر میں یا پیپل کے درخت کے نیچے ہوتا ہے۔ باری باری ہر ایک عورت بیچ میں اور باقی گھیرا بنا کر کھڑی ہوتی ہیں۔ پہلے بیچ والی گھونگھٹ نکال کر گاتی اور ناچتی ہے۔ اور پھر باقی عورتیں مل کر اسے دوہراتی ہیں۔ ان گیتوں میں گھریلو زندگی کا حال ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو کوئی عورت اس موقعہ پر ناچ گانے میں حصہ نہ لے۔ وہ آئندہ جنم میں لنگڑی پیدا ہوتی۔

نمبر ۷۔ راسیہ گیت۔ اس کی تانیں لمبی اور تیز ہوتی ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلانے بیج بونے یا چاولوں کے پودوں کو ایک جگہہ سے دوسری جگہہ لگاتے وقت یہ گیت گائے جاتے ہیں جن میں اچھی فصل ہونے کی امید باندھی جاتی ہے۔

نمبر ۸۔ بالن گیت۔ ان میں ہندو دھرم کی مشہور روایات رامائن اور مہابھارت کے بعض بعض حصوں کا حال ہوتا ہے اسے صرف مرد گاتے ہیں اور چند مذہبی تہواروں کے لئے مخصوص ہیں۔

نمبر ۹ راتیلی گیت۔ جب دلہن اپنے گھر سے رخصت ہوکر دولھا

کے گھر جانے لگتی ہے تو اس کی سہیلیاں بڑے جوش وخروش سے یہ گیت گاتی ہیں اور بہت خوشی مناتی ہیں۔

نمبر۱۰۔ بھیلوٹی گیت۔ یہ بچوں کو سلانے کی لوریاں اور پنگوڑے میں جھلاتے وقت کے گیت ہیں۔

نمبر۱۱۔ بارہ ماسی گیت۔ ان میں وہ عورتیں اپنے دکھے ہوئے دل کا حال سناتی ہیں جو پریتم سے دور جدائی کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ یہ بہت دردناک ہوتے ہیں۔ اور گانے کی لَے بھی دل ہلا دینے والی ہوتی ہے۔ ان میں موسم کی خوشگوار کیفیات، پہاڑوں کے دلچسپ مناظر اور پرندوں کے خوش کر دینے والے چہچہوں کا ذکر کر دینے کے بعد اپنی بے بسی کی حالت بیان کی جاتی ہے کہ ایسے وقت جبکہ سب لوگ خوشی منا رہے ہیں پریم کی ماری چند ہستیاں آنسو بھی بہا رہی ہیں۔

نمبر۱۲۔ آساڑھی گیت۔ آساڑھ کے مہینے میں جب گرمی بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ مختصر ہوتے ہیں اور گاتے وقت بھی لمبی تان نہیں لی جاتی کیونکہ ان میں یہی ذکر ہوتا ہے کہ گرمی کے مارے دلچسپ کاموں تک میں دل نہیں لگتا۔

نمبر۱۳۔ ساؤنے گیت۔ یعنی ساون کے مہینے کے گیت۔ برسات کے موسم میں تھوڑے عرصے کی بیاہی ہوئی لڑکیاں ضرور اپنے اپنے میکے چلی جاتی ہیں۔ تاکہ پوری آزادی کے ساتھ موسم کی بہار سے لطف حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ گیت صرف عورتیں ہی گاتی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول ان عورتوں کے لئے جو خوش قسمتی سے اپنے میکے پہنچ چکی ہیں اور خوشی منا رہی ہیں۔ دوسری ان عورتوں کے لئے جن کو ساتھ لے جانے کے لئے ابھی میکے سے کوئی نہیں آیا اور وہ صرف انتظار کرتے ہوئے ان مسرتوں کا تصور کر رہی ہیں۔

نمبر۱۴۔ چایئتے گیت۔ یہ موسم بہار کے نغمے ہیں جو مارچ سے اپریل تک کے دنوں میں گائے جاتے ہیں۔ یہ کسی کے لئے مخصوص نہیں۔ عورت مرد بچے بوڑھے سب ہی گاتے ہیں۔

گیتوں کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اصلی زبان میں اسی ملک کے لوگوں کے منہ سے سنا جائے۔ اگر مطلب سمجھ میں نہ آئے تو نہ سہی۔ کم از کم ترنم سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت میں چند گیتوں کو اپنے الفاظ میں پیش کر دوں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ان میں کس قسم کے جذبات ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو تعلیم سے بالکل بے بہرہ اور جاہل ہیں۔ دل کی باتوں کو الفاظ میں کس طرح بیان کرتے ہیں۔ ایک گیت سنئے کسان اپنی تیار فصل دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا:۔

کتنے خوبصورت ہیں چتیلی والے میرے بیل۔
اور دیکھو میرے ہل ان سے بھی زیادہ خوب صورت ہیں۔
کتنے خوشنما ہیں میرے ہرے بھرے کھیت۔
اور دیکھو میری فصلیں ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔

ایک اور گیت میں کسان دھرتی ماتا کے ساتھ جو اسے سہارے ہوئے ہے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے:۔

یہ دھرتی میرے لئے باپ ہے اور ماں بھی۔
جسم میں قوت پیدا کرنے والی خوراک ہم اس کے اندر سے حاصل کرتے ہیں
برکت ہو تجھ پر۔ برکت ہو دھرتی ماتا پیاری۔
میرا سارا پریم اور دھرم خاک کے ذروں کے لئے ہے۔

ایک کسان جس کی فصلیں پڑوسیوں کی طرح اچھی نہیں ہوئی ہیں۔ اپنے دل کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:۔

میں نے ہل چلانے میں ساری عمر بسر کر دی۔
آہ! خوشی کا دن مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا۔
بہت بوڑھا اور بہت کمزور ہو گیا ہے میرا جسم اور میرا دل
خوشی کا چہرہ ایک لمحے کے لئے بھی مجھے دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

ایک گیت سنئے جس میں پہاڑوں اور ندیوں کا ذکر ہے:۔

کب — ارے کب جمع ہو گی برف؟
دور، بہت دور ہمالیہ کی چوٹیوں پر۔
کہاں۔ ارے کہاں جا کر دم لے گی؟
بل کھا کر بہنے والی تیز ندی۔

اب ایک ایسی ماں کا گیت سنئے جس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے:۔

ترائی کے علاقے میں پیپل کے درخت مرجھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
سورج کی جھلسا دینے والی گرمی کی وجہ سے۔
آہ! کس کام کا ہے میرا حسن میرے لئے
میری کوئی بیٹی ہے اور نہ کوئی بیٹا۔

ذرا آنکھوں کی تشبیہہ سن کر ذوقِ نظر کی بھی داد دیجئے۔

لدا ہوا ہے پھلوں اور پھولوں سے تیری جوانی کا پودا۔

اور پیاری تیری آنکھیں گویا قریب قریب رکھے ہوئے دو کرپلے ہیں۔
یا پھر وہ ملتی جلتی ہیں دو پاس پاس بیٹھے ہوئے جگنوؤں سے۔
جن کی روشنی دکھائی دیتی اور غائب ہوتی ہے پلک جھپکنے کیسا
ایک غم نصیب کے دکھے ہوئے دل کی آہ بھی سن لیجئے:۔
نو لاکھ ستارے اوپر آسمان میں جڑے ہوئے ہیں۔
ناممکن ہے ناممکن ہے میرے لئے ان کو شمار کرنا۔
میرے لبوں تک دکھے ہوئے دل کے الفاظ آکر رہ جاتے ہیں۔
ناممکن ہے ناممکن ہے میرے لئے ان کو بیان کرنا۔
کتنی خوشنما ہے برف سے ڈھکی ہوئی ہمالیہ کی چوٹی
جیسے کوئی سانپ کینچلی اتار کر پھینک گیا ہو۔
راہ چلنے والے مت سنا اپنی بانسری کے درد بھرے راگ۔
میرے جگر میں اُف! میرے جگر میں ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔

ایک دولہا کا گیت سنئے جس نے پہلی رات اپنی دلہن کا چہرہ دیکھا ہے:۔

کتنا خوشنما معلوم ہوتا ہے نیپال چاندنی راتوں میں۔
گویا وہ تمام دنیا کے اوپر خود ایک آسمان ہے۔
لیکن کہیں زیادہ خوبصورت ہے میری پیاری دلہن کا چہرہ۔
گویا وہ ایک چمکتا ہوا چاند ہے میرے لئے میرے دل کی دنیا کا

سسرال جانے کے لئے ایک نوجوان لڑکی کھیت کے قریب بہنے والی ندی کے کنارے اشنان کرنے بیٹھی ہے۔ وہ مانگ میں بھرنے والا سیندور گھر میں بھول آئی ہے۔ اس کا گیت سنئے:۔

یہاں بہتی ہے دیکھو یہاں بہتی ہے۔
پیارے نیپال کی سنہری ندی۔
اپنے بال ہاں اپنے بال میں صاف کر رہی ہوں۔
پیارے نیپال کی سنہری ندی میں۔
میرے بال ہاں میرے بال دھل کر سلجھ گئے۔
پیارے نیپال کی سنہری ندی میں۔
ایک چٹان پہ اپنے بال دھوپ میں سکھانے بیٹھی ہوں۔
قریب پیارے نیپال کی سنہری ندی کے۔
افسوس۔ آہ۔ افسوس! میں گھر بھول آئی
سر کی مانگ میں رنگ بھرنے والا سیندور
رنجیدہ۔ اُف رنجیدہ میرا دل ہو گیا۔
اپنے دولہا کے گھر میں کس طرح واپس جاؤں۔
میری ظالم ساس مجھے دیکھ کر بولے گی۔
آ گئی ایک بے پروا نالائق لڑکی میکے سے

ایک لڑکی اپنی ساس کے ظلم وستم سے گھبرا کر چڑیا سے التجا کرتی ہے کہ میرے دکھ درد کی خبر میرے ماں باپ کو پہنچا دے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اور بھائی بہن کو ہرگز معلوم نہ ہو کہ ان کی بیاہی ہوئی بہن ساس کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ سنئے۔

کتنا بھلا ہے تیرا گیت اے سنہری چڑیا۔
تیرا اڑنا کس قدر پیارا ہے اے سنہری چڑیا۔
اڑ جا۔ ہاں اڑ جا میری ماں کے گاؤں تک۔
اور میرے دل کی باتیں جا سنا اے سنہری چڑیا۔
اگر میری ماں سوال کرے تو اس سے کہہ دیجو۔
اپنی ساس کے ظلم سے تنگ آ کر تیری بیٹی مر رہی ہے۔
میرے بھائی سے کہیو تیری بہن مزے میں ہے۔
اگر وہ تجھ سے پوچھے۔ اے سنہری چڑیا۔
اگر میرا باپ سوال کرے تو اس سے کہہ دیجو۔
اپنی ساس کے ظلم سے تنگ آ کر تیری بیٹی مر رہی ہے۔
میری بہن سے کہیو تیری بہن مزے میں ہے۔
اگر وہ تجھ سے پوچھے۔ اے سنہری چڑیا۔
کتنا بھلا ہے تیرا گیت۔ اے سنہری چڑیا۔
تیرا اڑنا کس قدر پیارا ہے۔ اے سنہری چڑیا

نیپالی لڑکیاں کبوتروں کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ ماں کے گھر سے رخصت ہوتے وقت ایک لڑکی اپنے باپ سے کبوتر کا ایک جوڑا مانگتی ہے باپ بیٹی کی گفتگو سنئے:۔

باپ! نو جوڑے کبوتروں کے تیری چھت پر بیٹھے ہیں۔
مجھے دے دے۔ مجھے دے دے ان میں سے ایک جوڑا کبوتروں کا
ایک گائے۔ ایک گائے تجھے دے دوں گا میری بیٹی!
مجھے افسوس ہے کہ میں جدا نہیں کر سکتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔
باپ! میں تیری دی ہوئی گائے کا کیا کروں گی۔
آہ! کتنی بدقسمت ہوں کہ مجھے نہیں ملتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔

ایک ہاتھی۔ ایک ہاتھی۔ تجھے دے دوں گا۔ میری بیٹی!
مجھے افسوس ہے کہ میں جدا نہیں کرسکتا ایک جوڑا کبوتروں کا۔
باپ! میں تیرے دئیے ہوئے ہاتھی کا کیا کروں گی۔
آہ کتنی بدقسمت ہوں کہ مجھے نہیں ملا ایک جوڑا کبوتروں کا۔
رومت۔ رومت۔ پیاری بیٹی رومت۔
ابھی ابھی میں تجھے دے دوں گا۔ ایک جوڑا کبوتروں کا۔
خوش رہ باپ۔ میں گھریلو کام سسرال میں اچھی طرح کرسکوں گی۔
جب اپنے گھر کا پلا ہوا دیکھوں گی ایک جوڑا کبوتروں کا۔

ایک عورت اپنے خاوند کے ہاتھوں کتنی ہی دکھی ہو ہندو دھرم کے مطابق وہ کسی طرح بھی اس سے الگ نہیں ہوسکتی۔ اس کی زندگی گویا ہمیشہ کے لئے غلامی ہے۔ ایک درد بھرا راگ سنئے:۔

اس اجنبی سرزمین پر موت مجھے اپنی گود میں اٹھائے گی۔
اور افسوس میرے لئے کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔
کچھ نہیں سوائے ماری ہوئی قسمت کے ایک عورت کی زندگی ہے۔
افسوس اس کی شادی اس کے لئے پوری غلامی ہے۔

نیپالی بڑے بہادر اور لڑائی کے وقت میدان میں کام آنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہندوستانی فوج میں بھی بہت سی گورکھا پلٹنیں ہیں۔ ایک عورت جس کا خاوند ملازمت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ فراق میں آنسو بہا رہی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

"افسوس ایک سپاہی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔
عموماً موت کا چہرہ بھی اسے لڑائی کے میدان ہی میں دیکھنا پڑتا ہے"۔

اس کی نند یہ بات سن کر اسے تسلی دیتی ہے اور سنگھار کرنے کے لئے کہتی ہے۔ سنئے:۔

"سنوارے۔ ہاں سنوارے اپنے بالوں کو۔ میرے بھائی کی دلھن۔
میرا بڑا بھائی بہت جلد پیارے نیپال میں آنے والا ہے"۔

وہ لڑکی اپنی نند کو جواب دیتی ہے:۔

"تیرا دل کس طرح دھڑک کر تجھے اس امر کا یقین دلا رہا ہے۔
وہ تو پیارے نیپال سے بہت دور لڑائی کے میدان میں گیا ہے"۔

اب اتفاق دیکھئے کہ وہ سپاہی واپس آتا ہے اور گھر کے قریب پہنچ کر شکار کھیلنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ عورت اس کو دیکھ کر پہچانتی نہیں اور کتنی عجیب گفتگو ہوتی ہے۔

تو کون ہے؟ ہاں مجھ کو بتا تو کون ہے؟
اے شیروں کے شکاری تو کون ہے!
کس نے دی ہے تجھے پیاری جوانی یہ بالا جوبن!
اے شیروں کے شکاری تو کون ہے"۔
"میں ہوں بہادر باپ کا بہادر بیٹا!
سن اے عورت! میں ہوں شیروں کا شکاری۔
پرماتما کی کرپا ہے یہ پیاری جوانی یہ بالا جوبن
یہ بڑی کرپا ہے۔ شیروں کے شکاری پر"
"تو نے شیر کو گولی سے مار لیا۔ ایک ہی وار میں۔
بہادری چمک رہی ہے شیروں کے شکاری کے چہرے پر۔
تو کون ہے۔ ہاں مجھ کو بتا۔ تو کون ہے!
اے شیروں کے شکاری تو کون ہے"!

اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اور خوشی خوشی گھر آجاتے ہیں۔ آخر میں فقیروں کی ایک صدا بھی سن لیجے جسے وہ ہر دروازے کے سامنے ہو کر لگاتے ہیں۔

اس گھر کی مالکہ جب پتھر کے ٹکڑوں کو چھوئے۔
تو پرماتما کی کرپا سے وہ بدل جائیں جواہرات میں۔
زمین جس پر وہ قدم رکھ کر چلے۔
پرماتما کی کرپا سے اناج میں بدل جائے۔
پتے جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے صاف کرے۔
پرماتما کی کرپا سے ریشم کے کپڑے میں بدل جائیں۔
پانی جس کو وہ اپنی انگلیوں سے چھوئے
پرماتما کی کرپا سے تیل میں بدل سے۔
لکشمی ہمیشہ اس گھر میں آباد رہے۔
سب چھوٹے بڑے کیلے کی طرح پھلیں پھولیں۔
اس گھر کے لوگ ہری گھاس کی طرح تر و تازہ رہیں۔
ان کی عمریں بڑ اور پیپل کے درختوں کی سی ہوں۔
ان کا گھر اچھے اچھے کپڑوں سے بھر جائے۔
بھوٹ کا نمک اور لہاسا کا سونا انہیں بہت زیادہ ملے۔
گھر کی تمام بیماریوں کو پوتر گنگا دھو کر صاف کردے۔
اور تمام تکلیفیں اڑ جائیں ہمالیہ کی چوٹیوں سے آنے والے جھونکوں کے ساتھ
یہ ہے ایک بھکشو کی دعا اپنے پرماتما سے۔

ان کے علاوہ اور بہت [illegible] ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے جذبات کتنے پیارے او[illegible] ہیں اور وہ ان گیتوں میں زندگی کی کتنی سچی تصویر کھینچتے ہیں۔ [illegible]

فضل حق قریشی دہلوی

نواہائے راز

شرم کی بات نہیں کچھ تمہیں اپنی ہی قسم
کیا کہا پھر تو کہو اہلِ وفا تم ہو کہ ہم

آنکھ تو چار کرو میری طرف تو دیکھو
میں بھی کچھ عرض کروں تم تو نہ ہو گے برہم

آج چھیڑا ہے اگر مجھ کو تو انصاف سے شرط
ورنہ جو چاہے وہ کہہ لو سرِ تسلیم ہے خم

بے زباں مجھ کو نہ سمجھو فقط اتنا ہے خیال
تم خجل ہو گے کروں گا میں اگر ذکرِ ستم

کچھ زباں سے نہ کہا تم نے مرے منہ پہ مگر
تم مبادا ہوئے مغموم تو ہو گا کسے غم

مسکراتے ہوئے اُس آفتِ جاں نے یہ کہا
جو ترے دل میں ہو کہہ تجھ کو مرے سر کی قسم

عرض کی میں نے کہ "غیروں پہ نہیں چشمِ کرم"
ہنس کے فرمایا "یہ سچ ہے تو وفادار ہیں ہم"

عرض کی میں نے کبھی چشمِ کرم مجھ پہ نہ کی
ہنس کے فرمایا کہ "ناداں ہے یہی عینِ کرم"

عرض کی میں نے "یہ کیا کیا نہ ستم مجھ پہ ہوئے"
ہنس کے فرمایا کہ عاشق ہے تو کر شکرِ ستم"

عرض کی میں نے "میں کس منہ سے کروں شکرِ جفا"
بولے "جس منہ سے کہ کہتا ہے مجھے ظلم شیم"

عرض کی "ہو گا مرا عقدۂ دل وا کب تک"
بولے "جس وقت کہ زلفوں سے مری دور ہو خم"

عرض کی میں نے "غمِ عشق ستاتا ہے بہت"
ہنس کے فرمایا کہ "دے کاش خدا سب کو یہ غم"

عرض کی میں نے "خطِ شوق کا لکھا نہ جواب"
بولے "کر شکر کہ تیرے نہ کئے ہاتھ قلم"

عرض کی میں نے "یوں خون جگر میں کب تک"
ہنس کے فرمایا "یہ جب تک کہ ترے دم میں ہے دم"

عرض کی "ہجر میں روتے ہوئے اک عمر ہوئی"
ہنس کے فرمایا کہ "اے وائے بہ حالِ شبنم"

قیدِ ہستی سے جو چھٹنے کا کیا میں نے سوال
بولے "کچھ دن ابھی رہ اور گرفتارِ الم"

عرض کی میں نے کہ "ہے حسرتِ پابوس بہت"
بولے "پھر خاک میں ملئے صفتِ نقشِ قدم"

عرض کی "رحم کی امید یہ کب تک میں جیوں"
بولے "اس کے لئے کہہ سکتے نہیں کچھ ابھی ہم"

عرض کی "بس ہے مجھے ایک محبت کی نگاہ"
بولے "کس کس پہ کریں ہم نگہِ لطف وکرم"

عرض کی "میں نے تو کیا رحم نہ کھاؤ گے کبھی"
ہنس کے فرمایا "کہ ہاں اس کی تو امید ہے کم"

عرض کی میں نے کہ "ہے بارِ گراں تن پہ یہ سر"
ہنس کے فرمانے لگے "تجھ کو مرے سر کی قسم"

عرض کی "حسن کے جلوے مرے دل میں دیکھو"
بولے "کیا خوب ترے دل کے بھی محتاج ہیں ہم"

عرض کی میں نے یہ سب ہے مری تقدیر کا پھیر
ہنس کے فرمایا کہ پھر کر گلۂ بختِ دژم"

"حسنِ سبز اب تو ہے مرغوب مجھے" میں نے کہا
ہنس کے فرمایا کہ "ناداں یہ ترے حق میں ہے سم"

عرض کی "اب تو جگر میں نہیں اک بوند لہو"
ہنس کے فرمایا "کہ کر اور خطِ شوق رقم"

ڈبڈبا آئے مری آنکھوں میں آنسو تو کہا
تجھ پہ ہنستا ہے انہیں باتوں سے سارا عالم

عرض کی میں نے "شبِ ہجر ہے بس یا میں ہوں"
بولے "کر شکر ہے کوئی تو شریکِ غم و ہم"

پوچھا "دکھلاؤ گے اعجازِ مسیحائی کب"
ہنس کے فرمایا "جب آئے گا لبوں پر ترا دم"

عرض کی میں نے "دمِ نزع تو آؤ گے ضرور"
ہنس کے فرمایا کہ "ہاں شاہِ ولایت کی قسم"

صدق جائسی

جاپان میں جشن نوروز

اہل جاپان طبعاً میلے تہوار کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے قومی تہوار کچھ کم نہیں جن میں تمام قوم خوشی مناتی ہے۔ مقامی میلے بھی بہت سے ہیں۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا جس میں کوئی نہ کوئی میلہ یا تہوار نہ ہوتا ہو۔ محلے وار میلے تو اس قدر ہیں کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ جاپانی بارہ مہینے خوشی مناتے ہیں۔ پھر بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ دیگر اقوام کا کوئی تہوار انہیں پسند آ جائے تو اختیار کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً بڑے دن کا تہوار ایسی دھوم سے مناتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے تمام جاپان عیسائی ہوگیا۔ مگر اس میں عقیدت کو کوئی دخل نہیں۔ بڑے دن میں تہواریت بہت ہے۔ اس وجہ سے انہیں پسند آ گیا ہے۔ پھر یہ ماہ دسمبر میں آ پڑا ہے جس میں جشن نوروز کی تیاری کے لئے اتنی خرید و فروخت ہوتی ہے کہ سال بھر کی آدھی بکری اسی مہینے میں ہو جاتی ہے۔ ڈیپارٹمنٹ اسٹور اور بڑی بڑی دکانیں بڑے دن کے نام سے قیمتوں میں تخفیف کر دیتی ہیں یا خریداروں کو کچھ انعام دیتی ہیں۔ ہر جگہ سینٹا کلاس نظر آتا ہے۔ بچوں کو کھلونے ملتے ہیں۔ بڑے دن کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ ریسٹورنٹوں اور ہوٹلوں میں خوب ڈنر کھائے جاتے ہیں۔ ناچ گھروں اور شراب خانوں میں رونق ہوتی ہے غرضکہ عیسائی ممالک کی تقلید کرنے میں جاپانی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

جاپانیوں کا سب سے بڑا تہوار جشن نوروز ہے جو یکم جنوری کو منایا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں قمری حساب سے سال کا شمار ہوتا تھا اور نوروز کا تہوار ماہ فروری میں پڑتا تھا۔ اوائل عہد میجی میں جاپان نے شمسی سال اختیار کیا۔ اس وقت سے یکم جنوری کو نوروز منایا جانے لگا۔ دیہات میں اب بھی یکم جنوری سے زیادہ رونق دار تہوار فروری میں منایا جاتا ہے۔ توکیو میں اور دوسرے بڑے شہروں میں جشن نوروز کی تیاری ایک مہینہ پہلے سے ہوتی ہے بلکہ آخر نومبر سے ہی بازاروں کی چہل پہل بڑھ جاتی ہے۔ خریداروں کے استقبال کے لئے دکانیں خوب سجائی جاتی ہیں۔ اسٹوروں میں ملازمین کی تعداد بڑھا دی جاتی ہے۔ دکانیں دیر تک کھلی رہتی ہیں۔ وسط دسمبر سے بازاروں کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے کیونکہ سرکاری دفاتر، کمپنیوں، کارخانوں اور دکانوں کے ملازمین کو سالانہ یا ششماہی انعام ملتا ہے۔ یہ ۱۵ ار دسمبر سے ۲۸ دسمبر تک تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ایک یا دو مہینے کی سالم تنخواہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض جگہ اس سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۵ء میں محکمہ ریلوے نے اپنے دو لاکھ ملازمین میں جو انعام تقسیم کیا تھا۔ اس کی مقدار سوا کروڑ این تھی۔ آخر دسمبر کی بکری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ توکیو کے ڈیپارٹمنٹ اسٹوروں میں کوئی بھی ایسا نہیں جس میں روزانہ پچاس ہزار گاہکوں سے کم آتے ہوں۔ بعض میں ایک لاکھ روزانہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عورتوں کے لئے دسمبر کا مہینہ نہایت مصروفیت کا ہوتا ہے۔ تمام خرید و فروخت خود کرتی ہیں۔ گھر والوں کے لئے کمونو کے کپڑے خریدتی ہیں اور سیتی ہیں۔ خانہ داری کا سامان مثلاً برتن، برش، جھاڑو وغیرہ اسی مہینے میں خریدا جاتا ہے۔ گھر کا تمام سامان باہر نکال کر صفائی کی جاتی ہے جس میں مرد عورت بچے سب لگ جاتے ہیں۔ فرش کی تتامیوں کی بالائی چٹائیاں بدلوائی جاتی ہیں۔ شوجیاں دھو کر نئے کاغذ چڑھائے جاتے ہیں۔ غرضکہ گھر کو صاف کر کے چندن بنا دیتی ہیں۔ سلیقہ مند عورتیں نوروز کے لئے موچی بھی گھر میں بناتی ہیں۔ اس کو عید کی خستہ کچوریوں اور سوئیوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پچیس تیس برس پہلے تک دہلی میں گھر گھر سوئیاں توڑی جاتی تھیں۔ اب یہ منظر کہیں نظر نہیں آتا۔ وہی حال موچی کا ہے۔ مگر یہاں یہ دستور ابھی فنا نہیں ہوا۔ بہت سے گھروں میں اب بھی بنتی ہے۔ اس کے لئے خاص قسم کے چاول استعمال ہوتے ہیں جن کو موچی گومے کہتے ہیں۔ چاولوں کو بڑی بڑی پتیلیوں میں ابال کر اوکھلی میں کوٹتے ہیں۔ جب بالکل آٹا ہو جاتا ہے تو اس کے پیڑے یا ٹکیاں بنا لیتے ہیں۔ نوروز کے دن موچی کو کوئلے پر سینک کر نوری لپیٹ کر خود کھاتے ہیں اور مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ اس کا مسالہ نوری اور شویو ہے۔ نوری بحری سبزی سے بنائی جاتی

ہے اور اس میں آیوڈین کا جزو بہت ہوتا ہے۔ شویو ایک قسم کا ساس یا سرکہ ہے جو ہر جاپانی کھانے میں پڑتا ہے۔ تین روز تک ہر کھانے پر موچی ضرور ہوتی ہے۔ اسے سکھا بھی لیتے ہیں اور مہینوں تل کر کھاتے ہیں۔

نوروز پر تحائف بھیجنے کا بڑا رواج ہے۔ تحفے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ آرائشی سامان کے ساتھ گھر کے کام کی چیزیں بہت ہوتی ہیں۔ بچوں کے کھلونے، بڑوں کی استعمالی اشیا، کھانے پینے کی چیزیں، غرضکہ سب کچھ بھیجا جاتا ہے۔ شکر کے مکعب اور انڈے تک بھیجے جاتے ہیں۔ قصائیوں کی دکانوں پر مرغیاں، مرغابیاں اور ہر قسم کا شکار، یہاں تک کہ چڑیاں تک ذبح کی ہوئی لٹکی رہتی ہیں۔ یہ بھی تحفوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ تحفہ بھیجنے کا طریقہ مقرر ہے۔ بکس میں بند کر کے کاغذ لپیٹا جاتا ہے اس پر سوتی ڈوری باندھی جاتی ہے جو نصف سفید ہوتی ہے اور نصف سرخ۔ اس کی گرہ کا بڑا سا گول پھندا بنایا جاتا ہے اور ڈوری کے نیچے کاغذ کی نوشی اڑس دی جاتی ہے۔ اسے پھر اور کاغذ میں لپیٹا جاتا ہے۔ عام طور سے تحفہ جات ڈاک سے روانہ کئے جاتے ہیں۔ جن دکانوں سے تحفے خریدے جاتے ہیں وہ بھی اپنے خرچے پر گھروں میں پہنچا دیتی ہیں اور شہر کے شہر میں یہ طریقہ اکثر برتا جاتا ہے۔ قریب کے گھروں میں خود بھی لے جاتے ہیں۔ تمام تحفہ جات نوروز کے قبل پہنچا دئے جاتے ہیں۔ ان کا انتخاب عورتوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے کیونکہ خانہ داری کی تمام خرید فروخت کی وہی ذمہ دار ہیں۔ مرد کسی کو خاص طور سے تحفہ دینا چاہیں تو خود بھی خرید لیتے ہیں۔

مردوں کے ذمے نوروز کی مبارک باد لکھنے کا کام ہوتا ہے۔ بازار میں مطبوعہ کارڈ ملتے ہیں۔ جن پر کوئی نظم یا مختصر عبارت چھپی ہوتی ہے۔ سادگی کے ساتھ مذاق کی نفاست کا اظہار ضرور ہوتا ہے کرسمس کارڈ یا عید کارڈ کی طرح مہنگے نہیں ہوتے بلکہ نہایت سستے۔ ایک سین میں ایک کارڈ مل جاتا ہے اور اس پر ڈیڑھ سین کا ٹکٹ لگایا جاتا ہے۔ ایک ایک آدمی کے لئے سو کارڈ بھیج دینا بالکل معمولی بات ہے جو زیادہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ وہ کارڈ میں اپنا نام اور پتہ بھی چھپوا لیتے ہیں کہ لکھنے کی تکلیف سے نجات ہو۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتہ لکھنے میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ ۲۵ دسمبر سے ڈاک میں ڈالنے شروع کر دیتے ہیں۔ ۳۱ دسمبر تک یہ کام ختم کر دیا جاتا ہے ڈاک خانہ تمام کارڈوں کو جمع کرتا رہتا ہے اور سب کی تقسیم نوروز کی صبح کو کرتا ہے۔ مبارک نامے بھیجنے کا شوق بہت بڑھا ہوا ہے اور ہر سال بڑھتا ہی نظر آتا ہے۔ ۱۹۳۳ء کے نوروز پر جاپان کے ڈاک خانوں نے بیاسی کروڑ کارڈ تقسیم کئے تھے۔ آبادی کے حساب سے ہر فرد کے حصے میں دس کارڈ آتے ہیں جس میں بچے بوڑھے عورتیں، شہری اور دیہاتی سب شامل ہیں۔ ایک مبارک نامے پر صرف ڈھائی سین خرچ ہوتے ہیں۔ تمام قوم کا حساب لگایا جائے تو صرف اسی مد میں دو کروڑ ین صرف ہو جاتے ہیں۔ اس سے کتنے کاغذ کے کارخانوں کے مزدوروں کے پیٹ پلتے ہوں گے اور کتنے کاغذ فروش روزی کماتے ہوں گے۔

مبارک ناموں کی تعداد سے آبادی کی خوشحالی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے نوروز پر اُن کی تعداد تینتیس کروڑ تھی جو سال ماسبق کے مقابلے میں دس فی صدی زیادہ تھی اور اندازہ تھا کہ ۱۹۳۶ء میں تقریباً پچاس فی صدی اضافہ ہوگا۔ مگر نوروز پر مبارک نامے یکلخت ڈھائی گنے سے بھی بڑھ گئے یعنی دو سو پچپن فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں اہل جاپان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور انہوں نے آپس میں مبارک باد دے کر خوشحالی کا ثبوت دیا۔

جشن نوروز کے لئے مکانوں اور دکانوں کی صفائی کے ساتھ آرائش کا خاص انتظام کیا جاتا ہے۔ مکان، دکانیں، بازار سب سجائے جاتے ہیں۔ آرائش فروشوں کی دکانیں شروع دسمبر سے محلے محلے کھل جاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ ۲۸ دسمبر سے آرائشیں سجائی جاتی تھیں مگر چند سال سے ۱۵ دسمبر سے سجاوٹ کا رواج ہو گیا ہے۔

گھر اور دکان کے باہر کا دو۔ ماتسو کی آرائش کی جاتی ہے۔ اس کے تین طریقے ہیں۔ اول صنوبر کا ایک ایک درخت پھاٹک کے باہر دائیں بائیں جانب جڑ سمیت رکھ دیا جاتا ہے۔ ہر صنوبر میں بانس کا پیڑ بھی باندھ دیتے ہیں۔ دوئم ہرے بانس کی پھننگ آڑی تراش دیتے ہیں اور بانس کی جڑ میں صنوبر کے چھوٹے چھوٹے پودے باندھ کر پھاٹک کے دونوں جانب رکھ دیتے ہیں۔ سوئم بانس کی جڑیں صنوبر کی ہری شاخیں باندھ کر پھاٹک کے دائیں بائیں رکھ دیتے ہیں اور ان میں گچھے دار رسّی آرائش کے طور پر باندھ دیتے ہیں۔ صنوبر کے سالم پودے کثیر تعداد میں مہیا ہونے مشکل ہیں۔ اس لئے تیسرا ط[illegible]ے سے رائج ہے۔

بانس اور صن[illegible]بہار پودے ہیں اور دونوں بڑی عمر پاتے ہیں۔ عام طور سے مش[illegible] صنوبر ایک ہزار برس تک زندہ رہتا ہے اور بانس دس ہزار بر[illegible] ہرا بھرا رہتا ہے۔ نوروز پر ان پودوں کے استعمال سے یہ مراد [illegible] ہے کہ گھر والے عمر دراز ہوں اور خوشحال

ہیں۔

گھر کے اندر "توکونومہ" میں موچی کے پیڑے رکھے جاتے ہیں۔ تین ٹانگ کی چوبی چوکی پر اول بڑا پیڑا رکھتے ہیں پھر اس کے اوپر چھوٹا پیڑا۔ موچی کے اوپر اور چاروں طرف "او۔ کزاری" سجائی جاتی ہے۔ اس میں کئی اشیا شامل ہیں۔ کڑوی نارنگی، خشک جھینگا، خشک کری، خشک کاکی، فرن، بحری سبزی وغیرہ۔ ہر چیز کچھ نہ کچھ معنی رکھتی ہے۔ مثلاً کڑوی نارنگی کو "دائی دائی" کہتے ہیں اور اسی لفظ کے دوسرے معنی ہیں نسلاً بعد نسلٍ خشک کری کو "کاچی کری" کہتے ہیں اور اس کے دوسرے معنی ہیں جنگ کرکے فتح حاصل کرنا جھینگے کی کمر خمیدہ ہوتی ہے۔ اس سے مراد ہے کہ آدمی اتنا بڈھا ہو جائے کہ اس کی کمر جھینگے کی طرح خم ہو جائے۔ فرن سدا بہار پودا ہے، آدمی اس کی طرح ہمیشہ خوشحال رہے۔ دیگر اشیا سے خوشی، شرمیلاپن، رواداری وغیرہ مراد لی جاتی ہے۔

موچی کے ہمراہ جو آرائش لگائی جاتی ہے وہی گھر کے دیگر حصوں میں یعنی دروازے پر، عبادت گاہ پر، باورچی خانے میں، اور کوئیں پر سجائی جاتی ہے۔ وہاں اس سامان میں موچی نہیں ہوتی بلکہ تقریباً گز بھر لمبی گاؤدم رسی ہوتی ہے جو لٹکا دی جاتی ہے اور ایک ڈوری الگنی کے طور پر باندھ دی جاتی ہے جس میں یہ اشیا لٹکا دی جاتی ہیں۔ ان کے ہمراہ سفید کاغذ کتر کر ڈوری میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ یہ ڈوری تاریخ جاپان کے ایک اہم واقعے کی یادگار ہے۔ تخلیق جزائر جاپان کے بعد جب سورج دیوی آسمانِ بالا پر حکمران ہوئی تو اس کا بھائی اس سے ملنے گیا۔ وہ نہایت شریر تھا۔ اس نے اپنی بہن کو اتنا تنگ کیا کہ وہ عاجز آ کر ایک غار میں چھپ گئی۔ تمام عالم میں اندھیرا چھا گیا۔ اسی ہزار دیوتاؤں نے بہت جتن کئے مگر وہ باہر نہ نکلی۔ آخر ایک دیوی نے ناچنا شروع کیا۔ اس شادمانی کی وجہ معلوم کرنے کے لئے سورج دیوی باہر آئی۔ دیوتاؤں نے فوراً غار کا منہ بند کر دیا اور اس پر ایک ڈوری تان دی کہ وہ دوبارہ اندر نہ جا سکے اور دنیا تاریکی سے محفوظ رہے۔ اس ڈوری کا آج بھی یہی منشا ہے کہ گھر تاریکی اور بلیات سے محفوظ رہے۔ کاغذ کی کترنیں اُن قیمتی کپڑوں کی یادگار ہیں جو پہلے دیوتاؤں کے آگے چڑھائے جاتے تھے۔ کادو، ماتسو، اور او۔ کزاری، کے علاوہ "دائی کوکو" کی مورت بھی گھروں میں رکھی جاتی ہے۔ یہ خوشحالی کا دیوتا ہے۔ دسمبر میں اس کی مورت کے مٹی کے کھلونے بہت بکتے ہیں۔ یہ مورت عموماً باورچی خانے میں رکھی جاتی ہے۔ نوروز کی صبح کو ہر گھر کے دروازے پر نمک بھی ڈال دیا جاتا ہے کہ بلیات گھر میں داخل نہ ہو سکیں۔

توکیو والے نوروز کی آرائش پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اس سے کئی قسم کے پیشہ وروں کے پیٹ پلتے ہیں۔ مالی بانس اور صنوبر مہیا کرتے ہیں۔ مچھیرے جھینگا اور بحری سبزی لاتے ہیں۔ میوہ فروش نارنگی، کاکی اور کری فراہم کرتے ہیں محض نارنگی کی اتنی بکری ہوتی ہے کہ دس بارہ دسمبر سے مال گاڑی کے ساٹھ ڈبے روزانہ توکیو میں بک جاتے ہیں۔ دیہاتی کسان رسیاں بٹ بٹ کر شہر میں بھیجتے ہیں۔ شہر والے گاؤں والوں سے صرف رسیاں ہی نہیں خریدتے بلکہ بہت سی دیہاتی مصنوعات شہروں میں کھپتی ہیں۔ آج کل بہت سامان کلوں سے بننے لگا ہے۔ پھر بھی دیہات سے بہت کچھ آتا ہے اور وہاں کی مصنوعات کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی جاتی ہے۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی چیز گاؤں کی بنی ہوئی مل جائے گی۔ یہاں کے کسان کھیتی باڑی کے علاوہ خالی وقت میں ریشم کی کاشت کرکے اور دیگر مصنوعات بنا کر اپنے گزارے کا سامان کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کسانوں کے لئے کھیتی باڑی کے علاوہ کوئی ذریعہ آمدنی کا نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بناتے بھی ہیں شہر والے ان کی ہمت افزائی نہیں کرتے۔ اگر گاؤں والوں کی صناعی کی قدر کی جائے تو ابتدائی تعلیم کا مسئلہ کیسی آسانی سے طے ہو جائے اور ملکی مصنوعات کو فروغ حاصل ہو کر اقتصادی حالت کس قدر سدھر جائے۔

~~~

مدارس میں نوروز کی تعطیلات ۲۵ر دسمبر سے شروع ہو جاتی ہیں اور تقریباً ۷ر جنوری تک رہتی ہیں۔ ۲۵ر دسمبر کو بڑے دن کی تعطیل نہیں ہوتی۔ بلکہ غمی کا قومی تہوار ہے۔ اس روز دفاتر بھی بند رہتے ہیں۔ اس تہوار کی وجہ سے جاپان میں بڑا دن ۲۵ر دسمبر کو نہیں منایا جا سکتا بلکہ ۲۴ر دسمبر کو منایا جاتا ہے۔ دفاتر میں ۲۹ر دسمبر سے ۳ر جنوری تک تعطیل رہتی ہے۔ ۲۸ر دسمبر کا دن بھی نیم تعطیل سمجھنا چاہئے کیونکہ اس روز سب لوگ دفتر جاتے تو ہیں مگر کام کچھ نہیں کرتے۔ صرف حاکم کو سلام کرکے

سلسلہ کزاری یعنی آرائش اور "او" تعظیمی لفظ ہے یعنی آرائش شریف۔
~~~

چلے آتے ہیں۔ یہ سلام اُس انعام کا شکریہ ہے جو انہیں ۲۷ر دسمبر کو یا اس کے قبل مل چکا ہے۔

اختتام سال کے پہلے دوست احباب جلسے کرتے ہیں۔ یہاں اس قسم کے جلسے کرنے کا بڑا اچھا دستور ہے پہلے سے چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جلسے کا انتظام کسی رسٹورنٹ میں ہوتا ہے جہاں پارٹیوں کے لئے چھوٹے بڑے پرائیویٹ کمرے ہوتے ہیں۔ جلسوں میں کھانوں کا انتظام ضرور ہوتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو چائے اور رفواکات ضرور ہوں گے۔ دعوتی رقعے بہت پہلے سے بھیج دئے جاتے ہیں۔ جو لوگ شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کم از کم تین روز قبل شرکت کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ اس طرح شرکا کی تعداد معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے مطابق کمرے اور کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے۔ دعوتی رقعے میں کھانے کی قیمت درج ہوتی ہے۔ رسٹورنٹ میں گئے کھانے کے دام دئے اور جلسے میں شریک ہوگئے۔ نہ چندے کے لئے خوشامد کی ضرورت اور نہ اُدھار کے لئے تقاضے کی حاجت۔ یہ جلسے اس غرض سے منعقد کئے جاتے ہیں کہ سب مل کر سال کو الوداع کہیں اور سال بھر کے رنج والم کو بھلا دیں۔ انہیں بونِنکائی کہتے ہیں۔ ہر شخص شریک ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ کئی کئی جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ جس کو کسی بونِنکائی میں شرکت کا موقع نہ ملا وہ بدقسمت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اپنی طرف سے بھی احباب کو دعوتوں میں مدعو کرتے ہیں۔ بعض جلسوں میں شراب اور گیشاؤں کے ناچ گانے کا بڑے وسیع پیمانے پر انتظام ہوتا ہے اور دل کھول کر روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سال بھر کے رنج و آلام بھلانے کی بجائے اتنے بڑے جلسے کا بل ادا کرنے کی فکر گلے پڑ جاتی ہے اور میزبان صاحب نئے الم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پہلے اس قسم کے جلسے صرف سرکاری ملازمین کرتے تھے۔ اب عام پبلک بھی کرتی ہے جس میں دفاتر کے اہلکار، دکاندار، کارخانہ دار، مزدور اور طلبا سب شامل ہیں۔

جتنے رنج و غم سال بھر میں اٹھانے پڑتے ہیں وہ سب جنوں اور بھوتوں کی شرارت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بعض بدھ مندر ان جنوں اور بھوتوں کو خارج کرنے کی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ ٹوکیو کے علاقہ اساکُسا میں جہاں رحم کی دیوی کا بہت بڑا مندر ہے جنوں اور بھوتوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ اس میں سینما کی ایکٹرسیں جن اور بھوت بنتی ہیں۔ لوگ اس جلوس کو دیکھنے بڑے شوق سے جاتے ہیں اور مندر کو خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔

اختتام سال کے قبل ہر شخص اپنا حساب بیباق کر دیتا ہے۔ کمپنیوں کے دفاتر میں یہ زمانہ نہایت مصروفیت کا ہوتا ہے۔ رات دن حسابات کی جانچ پڑتال ہوتی رہتی ہے۔ بہرحال ۲۷ر دسمبر کے قبل جانچ کا کام ختم کرنا پڑتا ہے کہ ملازمین کو انعام دیا جا سکے اور تاریخ مقررہ پر چھٹی دے دی جائے لوگوں کو اپنا قرضہ بے باق کرنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پرانا قرضہ چکانے کے لئے نیا قرضہ سخت شرائط پر لینا پڑتا ہے۔

نوروز پر خوشی منانی ایسا اہم کام ہے کہ اہل جاپان ہر گھر میں جشن کا انتظام کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ غریبوں کی امداد کے لئے کئی انجمنیں قایم ہیں۔ یہ چندہ فراہم کرتی ہیں۔ فوقانیہ مدارس کی لڑکیاں فراہمی چندہ میں بہت ہاتھ بٹاتی ہیں۔ چار چار پانچ پانچ لڑکیوں کی ٹولیاں چوراہوں پر کھڑی ہو جاتی ہیں اور رہرراہ گیر سے امداد کی درخواست کرتی ہیں۔ اس رقم سے موچی خریدی جاتی ہے اور غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو ہانے سُکی کے بلّے اور چڑیاں تقسیم کی جاتی ہیں کہ نوروز پر کھیل سکیں۔ اسی طرح لڑکوں کو کنکوے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نوروز کی خیرات میں دھوبی تک شرکت کرتے ہیں۔ بعض نیک دل دھوبی پہلے سے اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم قومی جھنڈے مفت دھو دیں گے جو لوگ مقدرت رکھتے ہیں ان کی غیرت ہرگز تقاضا نہیں کرتی کہ اس اعلان سے ناجائز فایدہ اٹھائیں۔ غریبوں کو اپنے جھنڈے مفت دھلوانے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ جھنڈے نوروز پر ہر گھر کے دروازے پر لہراتے ہیں۔

نوروز کا اعلان ۳۱ر دسمبر کی شب کو بارہ بجے کیا جاتا ہے۔ مندروں اور درگاہوں میں کانسی کی بڑی بڑی گھنٹیاں آویزاں ہوتی ہیں۔ بارہ بجتے ہی یہ گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ایک گھنٹی ایک سو آٹھ مرتبہ بجائی جاتی ہے تاکہ ایک سو آٹھ بلیّات دور ہو جائیں۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی لوگ اپنے گھروں سے عبادت کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ رات کو زیارت کرنے والے کم ہوتے ہیں عموماً صبح کو جاتے ہیں۔ بال بچوں کو ساتھ لئے ہوئے سب نئے کپڑے پہن کر مندروں یا درگاہوں میں پہنچتے ہیں۔ شاہ میجی کی درگاہ پر سب سے زیادہ اژدہام ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے نوروز پر تین [illegible] اندر اندر پندرہ لاکھ آدمیوں نے اس درگاہ میں عبادت کی تھی۔ نورو[illegible] سے ہر شخص کی ذات بھی متاثر ہوتی ہے۔ یعنی اسی روز ہر جاپانی کی عمر [illegible] سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ خواہ کوئی بچہ دسمبر کی آخری تاریخ کو پیدا ہو [illegible] وہ دوسرے سال کا کہلائے گا۔

نوروز عموماً گھر پر منایا جاتا ہے۔ مگر بہت سے لوگ تفریحاً شہر کے باہر چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سال ٹوکیو سے دس لاکھ آدمی نوروز کی تعطیل منانے باہر چلے گئے تھے۔

نوروز کو علی الصبح شہنشاہ جاپان بحیثیت قوم کے ملّائے اعظم کے پہلی رسم ادا کرتا ہے۔ ننگے بدن پر ٹھنڈے پانی کے لوٹے ڈال کر جسم پاک کرتا ہے پھر محل کی عبادت گاہوں میں چاروں سمتوں کی عبادت بجا لاتا ہے۔ اس عبادت کا تعلق "اماتیراسو۔ او میکامی" یعنی سورج دیوی کی اور آباؤ اجداد کی پوجا سے ہے۔ اسی طرح ہر جاپانی اپنے گھر کی عبادت گاہ میں پوجا کرتا ہے۔ شنٹو اور بدھ مذہب کے پیروؤں میں عبادت کے دیوتا مختلف ہوتے ہیں۔

نوروز اپنے ساتھ مسرت کا ایک سیلاب لاتا ہے۔ ہر شخص کا چہرہ بشاش ہوتا ہے اور زبان پر کلمۂ "امید بتو" ہوتا ہے۔ صبح اٹھتے ہی گھر والے ایک دوسرے کو مبارک باد کہتے ہیں۔ باہر جس کسی سے ملاقات ہو پہلے مبارکباد ادا کی جائے گی پھر دوسری بات ہوگی۔ پچھلی شام کو جس قرض خواہ نے بڑی شدت سے تقاضا کیا تھا۔ آج وہی مبارک باد پیش کرنے میں سبقت کرتا ہے ہر گھر دلھن بنا ہوا ہے۔ "کادو۔ ماتسو" کی آرائش تو کئی دن پہلے لگائی جا چکی تھی۔ آج آفتاب طلوع ہونے سے قبل ہی ہر گھر پر قومی پرچم لہرانے لگا۔ جس گلی میں نکل جاؤ سرخ آفتاب کا جھنڈا لہراتا دکھائی دے گا۔ کوئی منحوس گھر ایسا نہ بچے گا جس نے جھنڈا لگا کر قوم پرستی کا ثبوت نہ دیا ہو۔ اس یگانگت اور یک جہتی کو دیکھ کر اجنبیوں کے دل پر اس قوم کے اتحاد کا ہیبت گہرا نقش بیٹھتا ہے۔

نوروز کی صبح کو ٹوکیو جیسے غدار شہر میں ایسی خاموشی ہوتی ہے کہ شہر خموشاں معلوم ہوتا ہے بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور، جن میں کل شام تک ایسی گہما گہمی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی، آج بند پڑے ہیں۔ تمام ملازمین کو تین دن کی چھٹی مل جاتی ہے۔ ہر دکان بند، ہر دفتر بند، کہیں کوئی راہ گیر نظر نہیں آتا۔ سب لوگ اپنے بال بچوں میں بیٹھے خوشی منا رہے ہیں۔ پہلا کام کوئیں میں سے پانی نکالنا ہے۔ یہ رسم پرانے زمانے سے چلی آئی ہے اور اب بھی بہت ٹھاٹھ سے منائی جاتی ہے۔ پانی زندگی کے لئے نہایت اہم ہے اس لئے نئے سال میں پہلا پانی نکالنے کی رسم ایک تقریب بن گئی ہے۔ آج کل ہر گھر میں نل لگ گئے ہیں۔ پھر بھی بیشتر گھروں میں ان کے ساتھ ساتھ کنواں بھی ہے جس میں پمپ لگا ہوتا ہے۔ اسی میں سے پہلا پانی نکالا جاتا ہے۔ یہ تقریب ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ شاعروں نے اس پر نظمیں کہی ہیں۔

گھر کا ہر فرد نیا کیمونو پہن کر دیوان خانے میں آ بیٹھتا ہے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد کہہ کر نئے پانی کی بنی ہوئی سبز چائے پی جاتی ہے۔ پھر میٹھی شراب پی جاتی ہے جس میں کچھ مسالے پڑے ہوتے ہیں کالی مرچ، ادرک، دارچینی اور دیگر مسالے جن میں ترکاریاں اور پھلوں کے چھلکے بھی ہوتے ہیں کوٹ پیس کر ریشم کی تھیلی میں بھر کر شراب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس مرکب کو "توسو" کہتے ہیں اور یہ صرف نوروز کے موقع پر پیا جاتا ہے۔ اسے صحت بخش اور مقوی معدہ بتاتے ہیں اور یہ معدے کو ان ثقیل غذاؤں کو قبول کرنے کے لئے تیار کرتا ہے جو نوروز کے ایام میں کھائی جاتی ہیں پہلے صاحب خانہ ایک پیالی پیتا ہے۔ پھر گھر والی۔ ان کے بعد درجہ بدرجہ بچے پیتے ہیں اور آخر میں نوکر۔

اس کے بعد ایک شوربہ پیا جاتا ہے جسے "زونی" کہتے ہیں۔ یہ شوربا دو طرح کا بنایا جاتا ہے یا تو آب مقطر کی طرح صاف شفاف ہوتا ہے یا اس میں پسی ہوئی دال ڈال کر گاڑھا کر لیتے ہیں۔ اس میں مرغ کا گوشت، ترکاریاں اور "موچی" کے ٹکڑے پڑے ہوتے ہیں۔ "توسو" اور "زونی" کے بعد ناشتے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نوروز پر تین دن تک یہ چیزیں پی جاتی ہیں۔ ہر امیر غریب "توسو" اور "زونی" ضرور پیتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر صاحب خانہ ڈاک دیکھتا ہے۔ ڈاکئے بچارے نوروز منانے سے محروم رہتے ہیں۔ گھر گھر نوروز کی ڈاک تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ ڈاک میں کچھ مبارک نامے ایسے ضرور نکل آتے ہیں کہ جہاں اس نے خود کارڈ نہیں بھیجا تھا۔ وہ یا تو ان کے جواب میں اسی وقت مبارکنامے لکھتا ہے یا دن کے کسی اور وقت کے لئے ٹال دیتا ہے۔

بہر حال یکم جنوری کو یہ کام ضرور انجام دے لیتا ہے۔ کچھ دن چڑھے وہ گھر سے نکلتا ہے اور قریب کے احباب و اعزہ کے گھروں کے چکر لگاتا ہے ہر گھر کی ڈیوڑھی میں ایک خوشنما کشتی رکھی ہوتی ہے۔ اس میں اپنے نام کا کارڈ رکھ دیتا ہے۔ اگر معمولی شناسائی ہے تو صرف کارڈ رکھنے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ گھر والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے گھنٹی بھی نہیں بجاتا۔ یونہی الٹے قدم واپس چلا آتا ہے۔ جن لوگوں سے بے تکلفی ہے ان کے گھروں پر گھنٹی بجاتا ہے۔ گھر والی آ کر استقبال کرتی ہے۔ مرد مبارکباد دینے باہر گئے ہوتے ہیں۔ عورتیں ہی یہ فرض انجام دیتی ہیں۔ معمولی ملاقات ہے تو مبارک باد کے رسمی جملے ایک دوسرے کو کہتے ہیں اور

مہمان ڈیوڑھی سے ہی رخصت ہوتا ہے۔ تعلقات بڑھے ہوئے ہیں تو گھر والی اسے اندر بلاتی ہے۔ یوں تو گھر والی ہر مہمان کو اندر آنے کو کہتی ہے مگر وہی لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں جن کے تعلقات زیادہ دوستانہ ہیں۔ دیوان خانے میں بٹھا کر گھر والی اس کے آگے ناشتہ رکھتی ہے۔ یہ کچھ کھا پی کر رخصت ہوتا ہے۔ دوپہر کا کھانا گھر پر کھاتا ہے پھر باہر نکلتا ہے۔ اسی طرح تین روز تک مرد ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں تین روز کے بعد عورتوں کی باری آتی ہے۔ پھر وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے نکلتی ہیں۔ سات روز تک اور کبھی کبھی پندرہ روز تک یہ سلسلۂ ملاقات جاری رہتا ہے۔ سات روز تک ہر گھر میں بڑے پر تکلف کھانے پکتے ہیں اور ہر قسم کی شرابیں پی جاتی ہیں۔ ان ثقیل غذاؤں کا بار معدے پر اس قدر پڑتا ہے کہ "توسو" کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور عموماً ضعفِ معدے کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر لڑکے اور لڑکیاں کھیلنے کے لئے باہر نکلتی ہیں لڑکیوں کے کمونو رنگ برنگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ ہوتے ہیں جن میں گلابی رنگ غالب ہوتا ہے۔ شوخ رنگ کے لباس میں وہ بالکل تیتریاں نظر آتی ہیں۔ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ گھر کے دروازے کے آگے گلی میں یا سڑک کی پٹڑی پر "ہانے شکی" کھیلتی ہیں۔ "یہ بیٹل ڈور" کی طرح کا ایک کھیل ہے جسے بیڈمنٹن سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ اس میں نہ جال ہوتا ہے اور نہ کورٹ کی لکیریں۔ دو لڑکیاں آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور بلے سے چڑیاں اُچھال اُچھال کر مارتی ہیں۔ بلے لکڑی کے ہوتے ہیں جن کا ایک رُخ سادہ اور دوسرا منقش ہوتا ہے۔ عموماً کابوکی کے مشہور ایکٹروں کے چہرے منقش ہوتے ہیں۔ عورتیں گھر کے کام کاج میں لگی ہوتی ہیں۔ انہیں فرصت ملتی ہے تو وہ بھی "ہانے سکی" میں شریک ہو جاتی ہیں۔ یہ کھیل نوروز پر ہی کھیلا جاتا ہے۔

لڑکے کنکوے اڑاتے ہیں۔ گھروں کی چھتیں کھپریل کی ہوتی ہیں اور صحن میں اتنی گنجائش ہوتی نہیں کہ وہاں اڑا سکیں۔ لہٰذا وہ قرب و جوار کے میدانوں کا رُخ کرتے ہیں۔ پارکوں میں کنکوے بازوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے۔ یہ شغل صرف لڑکوں کے لئے مخصوص ہے۔ بڑے آدمی شاذو نادر شریک ہوتے ہیں۔ مقابلہ دو باتوں میں ہوتا ہے۔ اول پتنگ کی جسامت، دوئم اس کی اونچائی۔ جس کا پتنگ سب سے اونچا جاتا ہے وہی جیتتا ہے۔ بڑے سے بڑا پتنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ کبھی کبھی دس فٹ مربعہ کے پتنگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں شکل ہر طرح کی ہوتی ہے کچھ مربعے کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ عموماً پرندوں کی شکلیں ہوتی ہیں۔ پہلے زمانے میں ایک دوسرے کا پتنگ کاٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کل یہ مقابلے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ پتنگ کاٹنے کی عجیب ترکیب ہے۔ ہندوستان کی طرح مانجھے کی ڈور نہیں ہوتی بلکہ معمولی ڈور میں چاقو کے چھوٹے چھوٹے پھل باندھ دیتے ہیں۔ پتنگ اس طرح لڑاتے ہیں کہ اپنے پتنگ کے چاقو سے دوسرے کی ڈور کٹ جائے۔ پتنگ بازی کا شغل نوروز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک اور تہوار پر بھی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ زور سے ہوتا ہے۔ وہ محض لڑکوں کا تہوار ہے جو ماہِ مئی میں پڑتا ہے۔

شام کو "ہیاکونین۔ اِشو" کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کو زیادہ مرغوب ہے مگر مرد بھی بڑے شوق سے کھیلتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں "ایک سو آدمی۔ ایک نظم"۔ جاپان کے بہترین شعرا کی ایک ایک نظم انتخاب کر لی گئی ہے۔ ان میں کوئی ستر مرد شعرا شامل ہیں اور تیس عورتیں "ہائیکو" قسم کی سترہ بول والی نہایت مختصر نظم ہوتی ہے۔ ہر نظم کا نصف حصہ ایک کاغذ پر چھپا ہوتا ہے جو تاش کے برابر ہوتا ہے اور بقیہ نصف حصہ دوسرے تاش پر۔ کھیلنے والوں کو تمام نظمیں حفظ یاد ہوتی ہیں۔ یہ کھیل دو طرح سے کھیلا جاتا ہے۔ مقابل کی دو ٹولیاں بنا کر بھی کھیلتے ہیں اور الگ الگ بھی۔ سب لوگ گھیرا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بیچ میں وہ تاش پھیلائے جاتے ہیں جن پر نظم کا آخری حصہ ہے۔ ابتدائی حصے والے تاش کسی خوش الحانی سے پڑھنے والے کو دے دئے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک تاش پڑھتا ہے اور اُسے دُہراتا رہتا ہے۔ کھیلنے والے اس نظم کے آخری حصے کی تلاش کرتے ہیں جس کو دکھائی دے گیا وہ جھپٹا مارتا ہے۔ جس کا ہاتھ پہلے پڑ گیا وہی اٹھا لیتا ہے بعض لوگوں کو نظمیں اتنی ازبر ہوتی ہیں کہ قاری نے پہلا بول پڑھا کہ ان کے ذہن میں نظم کا آخری حصہ آ گیا جھپٹنے بازی میں بڑا چہل پہل رہتا ہے۔ آخر میں جس کے پاس زیادہ تاش نکلے وہی جیت گیا۔

یکم جنوری کا تمام دن ایسے ہی مشاغل میں گزر جاتا ہے۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ نہانے کی فکر کرے۔ نہ گھر والی کو اتنی مہلت کہ حمام گرم کرے۔ دکانداروں کا نوروز بھی اسی چہل پہل میں گزرتا ہے۔ ان کا نیا سال دراصل دوسری جنوری سے شروع ہوتا ہے۔ خریداروں کی

فرمائشات کی تعمیل بھی یہ دوسری تاریخ کو کرتے ہیں۔ اس روز فرمائش کا مال نکال کر اسے باندھنے کی رسم بڑی دھوم سے منائی جاتی ہے۔ کئی مراسم ادا کی جاتی ہیں۔ پھر اسے گاڑی میں لاد کر اسی شان سے گاہک کی دکان

نوروز وہاں بھی چند مراسم برتی جاتی ہیں۔

سال کا پہلا غسل بھی دوسری جنوری کی صبح کو کیا جاتا ہے۔ گزشتہ سال کا آخری غسل ۳۱ دسمبر کو کیا گیا تھا۔

دوسری جنوری کی شب کو خواب دیکھنے کی بھی تیاری کی جاتی ہے۔ اس غرض کے لئے مندروں میں تعویذ فروخت ہوتے ہیں۔ ایک پرچے پر "ڈاکا" قسم کی یعنی کتیس بول والی نظم چھپی ہوتی ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ جاپانی حروف میں لکھی جائے تو اُسے الٹا سیدھا دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں اور ہر طرح ایک ہی عبارت پڑھی جائے گی۔ اس کا ترجمہ یہ ہے "سب لوگ طویل رات کی نیند سے جاگ اٹھے ہیں۔ جہاز کے موجوں پر چلنے کی آواز کیسی خوش آئند ہے۔" اس تعویذ کو تکیے کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں اور اس کی تاثیر سے اچھا خواب دکھائی دیتا ہے۔ اچھے خواب کی تعبیر اچھی ہوتی ہے اور نیا سال خوشی اور خوشحالی میں بسر ہوتا ہے۔ بہترین خواب کوہ فجی کا ہے۔ دوسرے درجے پر عقاب کا اور تیسرے درجے پر بینگن کے پودے کا۔

تیسری جنوری کو شاہی محل میں نئے سال کے پہلے درباری مراسم ادا کئے جاتے ہیں۔ یکم جنوری کی طرح آج بھی قومی تہوار کی تعطیل ہے۔ آج شام تک نوروز کی بہت سی تقریبیں ختم ہو جاتی ہیں۔ قومی جھنڈے بھی آج رات کو یا دوسرے روز کی صبح کو اتار کر رکھ دئے جاتے ہیں مگر چند تقریبیں اور رہیں جو کچھ عرصے تک ادا ہوتی رہتی ہیں۔

۴ جنوری کو شاہی محل میں دربار منعقد کیا جاتا ہے جس میں صرف وزرائے سلطنت شریک ہوتے ہیں۔ شہنشاہ بذاتِ خاص تشریف لاتے ہیں۔ وزیر اعظم امورِ سلطنت کی اطلاع پیش کرتے ہیں اور وزیر محلاتِ شاہی امورِ محلات کی اطلاع گزرانتے ہیں۔ آج کا دربار گویا نئے سال کے کاروبارِ سلطنت کی ابتدا ہے۔

اسی سلسلے میں ۵ جنوری کو شہنشاہ کی جانب سے بڑی دعوت دی جاتی ہے جس میں شہزادگانِ خاندانِ شاہی، وزرائے سلطنت، عہدیداران وزارتِ محلاتِ شاہی، ممبرانِ پارلیمنٹ، اعلیٰ عہدیداران سلطنت اور اور سفرائے دول کو شرفِ باریابی بخشا جاتا ہے۔

۶ جنوری کو شاہی محل کے سامنے فائر بریگیڈ والوں کی پریڈ ہوتی ہے۔ پائے تخت کے محکمۂ پولیس کا افسر اعلیٰ اور شاہی خاندان کا کوئی شہزادہ سلامی لیتا ہے۔ فائر بریگیڈ والے اونچی اونچی سیڑھیوں پر نٹوں کے کرتب دکھاتے ہیں اور انعام پاتے ہیں۔ سال گزشتہ شہر کے جن جن بریگیڈوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ان کو سندات عطا کی جاتی ہیں۔

۷ جنوری کو "ناناکُسا" کا تہوار منایا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جب نوروز فروری میں پڑتا تھا تو اس میں کچھ آسانی ہوتی تھی۔ آج کل بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماہ جنوری سخت سردی کا زمانہ ہے اور اس میں تمام ہریاول مرجھا جاتا ہے اور ساگ پات مر جاتا ہے۔ اس تہوار میں نئے سال کے سات ساگ ضروری ہیں۔ انہیں کوٹا پیسا جاتا ہے۔ عورتیں کوٹتے وقت ایک گیت گاتی جاتی ہیں۔ جب یہ مسالہ پس کر تیار ہو گیا تو اس کا شوربا پکایا جاتا ہے اور اسے چاولوں میں ملا کر دلیہ بنا لیتے ہیں۔ پہلے یہ دلیہ "اجیگامی" دیوتا یعنی مٹی کی مورت کے آگے چڑھایا جاتا ہے پھر گھر والے کھاتے ہیں۔ بلیات سے جو بیماریاں پیدا ہوتی وہ اس دلئے کے کھانے سے دور ہو جاتی ہیں۔ نیز اس سے موسم بہار و گرما و خزاں و سرما کی مخصوص بیماریاں رفع ہو جاتی ہیں۔

نوروز کے سلسلے میں شہر اوساکا میں دو تہوار خاص طور سے منائے جاتے ہیں۔ ایک تہوار ۱۰ جنوری کو پڑتا ہے۔ یہ "ایبیسو" دیوتا کا تہوار کہلاتا ہے جو خوشحالی کے سات دیوتاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ تہوار تین دن تک رہتا ہے۔ لوگ اس دیوتا کی درگاہ میں خوشحالی کی دعا کے لئے جاتے ہیں۔ عورتیں اور نوزائیدہ بچے بیماریوں سے حفاظت کے لئے جاتے ہیں اور گیشاؤں کا بڑا شاندار جلوس نکالا جاتا ہے۔ دوسرا تہوار ۱۴ جنوری کو پڑتا ہے اور یہ کسانوں کے لئے مخصوص ہے "تِنُوجی" کے مندر کے صحن میں ہزاروں بانس کے ننھے ننھے پودے لگائے جاتے ہیں۔ نیا سال شروع ہوتے ہی مندر کے پجاری کسانوں کے لئے دعا کرنی شروع کر دیتے ہیں ۱۴ جنوری کو کسانوں کی دو ٹولیوں کا مقابلہ ہوتا ہے کہ اس سال کس کی کھیتی کم محنت کرنے سے زیادہ پھلے پھولے گی۔ مقابلہ لٹھا دھکیلی میں ہوتا ہے۔ ہر ٹولی کے پانچ پانچ طاقتور جوان کندھوں پر لکڑی کا موٹا لٹھا رکھے اکھاڑے میں آتے ہیں۔ ایک ٹولی والے دوسروں کو دھکیلتے ہیں۔ جیتنے والوں کے مقابلے میں نئی ٹولی آتی ہے۔ کئی گھنٹے تک لٹھا

ڈھکیلی ہوتی رہتی ہے۔ مرد ڈھکیلنے میں شرکت کرتے ہیں اور عورتیں ان کا دل بڑھاتی ہیں۔ آخر میں مندر کی جانب سے تمام شرکا کو بانس کے پودے دئے جاتے ہیں۔ ان میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ بیمار آدمی کے بچھونے میں رکھ دئے جائیں تو وہ اچھا ہو جاتا ہے۔

۲۰ جنوری سے "کان مائیری" کا تہوار شروع ہوتا ہے۔ اس میں صرف سخت محنت طلب پیشوں کے شاگرد حصہ لیتے ہیں۔ وہ جاڑیوں کے سفید کمونو پہن کر رات کو گھر سے نکلتے ہیں۔ کمر میں گھنٹیاں بندھی ہوتی ہیں۔ دوڑتے ہوئے کسی درگاہ میں جاتے ہیں اور "توبہ۔ توبہ۔ پاکی۔ پاکی" کے دعائیہ کلمات پڑھتے جاتے ہیں۔ درگاہ میں پہنچ کر پہلے کچھ پیسے چڑھاتے ہیں اور دیوتا سے اپنے پیشے کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔ پھر حوض کے قریب پہنچ کر کمونو اتار ڈالتے ہیں اور ٹھنڈے پانی کے لوٹے بھر بھر کر اپنے بدن پر ڈالتے ہیں۔ پھر کمونو پہن کر دعائیہ کلمے پڑھتے ہوئے اسی طرح دوڑتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں۔ یہ جاترا وسط فروری تک رہتی ہے۔ اگر دوران سال میں کسی نے اپنا کارخانہ بدل دیا ہے تو نئے سال پر دوسری درگاہ کی جاترا کرتا ہے۔

۲۵ جنوری کو "تنجین" دیوتا کی درگاہوں میں "اسو۔ گائے" کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں جھوٹ واپس کرنا مگر اصطلاح میں اس سے ایک خاص پرندے کی واپسی مراد لی جاتی ہے۔ لوگ اس دیوتا کی درگاہوں میں جاتے ہیں۔ وہاں نقلی پرندے بکتے ہیں۔ وہ خرید کر مندر میں چڑھاتے ہیں۔ پجاری اس کے بدلے میں ایک پرندہ دے دیتے ہیں۔ لوگ اسے گھر لے جاتے ہیں۔ اس کی برکت سے انہیں نئے سال میں خوشی اور خوشحالی نصیب ہوتی ہے اور آفات دور رہتی ہیں۔

نوروز کے سلسلے میں شاہی محل میں دو تقریبیں اور عمل میں آتی ہیں۔ ایک تقریب میں شہنشاہ کلاسک ادب کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ یہ نئے سال کا پہلا کلاسک مطالعہ ہے۔ اس سال یہ تقریب ۱۴ جنوری کو منعقد ہوئی۔ شہنشاہ دربار فرماتے ہیں جس میں خاص خاص وزرا کو شرکت کی اجازت ہوتی ہے۔ تین شاہی یونیورسٹیوں سے ایک ایک ماہر پروفیسر بلایا جاتا ہے۔ وہ تخت شاہی کے روبرو کھڑے ہو کر آدھ گھنٹے تک کلاسک ادب پر تقریر کرتا ہے۔ ایک تقریر جاپانی ادب پر ہوتی ہے۔ دوسری چینی ادب پر اور تیسری مغربی ادب پر۔ تقریروں کے ختم ہونے پر دربار برخاست ہوتا ہے۔

دوسری تقریب شاہی مشاعرے کی ہے۔ نوروز کے کوئی تین مہینے پہلے شہنشاہ کی جانب سے مضمون طرح کا اعلان کیا جاتا ہے تمام جاپانی اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور نوروز پر اپنی کہی ہوئی نظم شاہی محکمہ شعر میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں ان کی جانچ کی جاتی ہے اور بہترین نظمیں منتخب ہوتی ہیں۔ یہ شاہی دربار میں پڑھی جاتی ہیں۔ نظم کی قسم "واکا" ہوتی ہے جس میں اکتیس بول ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے نوروز کے لئے مضمون طرح "سمندر پر بادل" تھا۔ ۲۰ جنوری کو دربار منعقد ہوا۔ اس میں درباری امرا اور چند وزرا شریک ہوئے۔ سب سے پہلے افسر الشعرا نے اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔ پھر رعایا کی پیش کردہ بہترین نظمیں سنائیں۔ پھر شہزادگان کی نظمیں سنائیں۔ پھر ملکہ معظمہ کی نظم تین بار پڑھ کر سنائی۔ پھر شہنشاہ کی والدہ ملکہ کی نظم تین بار پڑھ کر سنائی۔ سب کے آخر میں شہنشاہ کی نظم پانچ بار پڑھ کر سنائی۔

ملکہ معظمہ کی نظم کا ترجمہ یہ ہے۔ "آفتاب صبح نکلتا ہے تو منظر کی خوبصورتی بڑھتی جاتی ہے اور سفید بادل آنطرف بحر نظر آتے ہیں۔"

شہنشاہ کی والدہ ملکہ کی نظم کا ترجمہ یہ ہے۔ "صبح کی خاموشی میں ایک جہاز سمندر میں چلا جا رہا ہے اس کے دھوئیں کے پیچھے پیچھے بادل چل رہے ہیں۔"

شہنشاہ کی نظم کا ترجمہ یہ ہے۔ "جب ہم صوبہ کی میں رائس شیہونو کا دورہ کر رہے تھے تو ہم نے بادل آنطرف بحر پھیلے ہوئے دیکھے۔"

شہنشاہ کی نظم جاپانی زبان میں بجنسہ درج ہے۔

کی نو کنی نو
شیہو نو مساکی نی
تاچی یو رتے
اوکی نی تا نا بکو
کموا دمُرد کانا

یہ تمام میلے اور تقریبیں نوروز کی خوشی میں منائی جاتی ہیں۔ مگر ابھی ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ایک اہم میلہ اور تقریب ابھی باقی ہے جو ماہ فروری میں اس روز قرار پائی ہے جس روز قمری حساب کی رو سے نوروز پڑتا ہے۔ یہ تہوار "ستسوبون" کہلاتا ہے اور اس سال ۴ فروری کو ہوا تھا۔ یہ تمام بڑے مندروں اور درگاہوں میں منایا جاتا ہے۔ اس میں ماسے ماکی کی رسم ادا کی جاتی ہے جو صرف مندروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر گھر میں ادا

کی جاتی ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے لئے ہر مندر میں ایک یا کئی مردِ سال کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بہت بڑا اعزاز ہے۔ عموماً عمائدین ملک، مشہور پہلوان یا مشہور اشخاص منتخب کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی غیر ملکی اخبارات کے ممتاز نمائندوں کو بھی یہ اعزاز مل جاتا ہے۔ لوگ جوق در جوق مندروں میں جمع ہوتے ہیں۔ چند سال سے مندروں کے منتظمین اس اعزاز میں مشہور ایکٹریسوں اور گیشاؤں کو بھی شریک کر لیا کرتے تھے۔ لوگ ان کو دیکھنے اور بھی زیادہ آتے تھے۔ اس سال پولیس نے اس طرزِ عمل کو مخربِ اخلاق قرار دے کر حکماً بند کر دیا۔

یہ تقریب شام ہوتے پر ادا کی جاتی ہے۔ مردِ سال بھنی ہوئی دال کی ٹوکری ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ چاروں سمتوں کی طرف باری باری سے منہ کرتا ہے اور ایک دعا یعنی "بھوت باہر، خوشحالی اندر" پڑھتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی مٹھی بھر بھر کر دال پھینکتا جاتا ہے۔ لوگ اس کے دانے لپک لیتے ہیں۔ چاروں سمتیں ختم کر کے اوپر اور نیچے بھی منہ کر کے دال پھینکتا ہے۔ گھروں میں یہ رسم ہر کمرے میں ادا کی جاتی ہے۔ جب ایک کمرے میں رسم ختم ہو چکی تو گھر والی فوراً بیرونی دروازے بند کر دیتی ہے کہ بھوت پھر اندر نہ آ جائیں۔ لوگ اس دال کا ایک ایک دانہ گن کر کھاتے ہیں۔ عمر کے جتنے سال ہوئے ہیں اتنے ہی دانے کھانے ضروری ہیں۔ اسی وجہ سے ہر سال ایک دانہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کو اپنی عمر کے دانے کھانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ان دانوں کی برکت سے عمر دراز ہوتی ہے اور آدمی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ بقیہ دانے تبرک کے طور پر محفوظ رکھے جاتے ہیں کہ گھر میں برکت ہو۔ بعض لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ آدمی کی عمر یکم جنوری کی بجائے "سینسوبون" پر بڑھتی ہے۔

نوروز کے میلے تہواروں کو دیکھ کر واضح ہوتا ہے کہ جاپانی پرانی رسموں کے بڑی سختی سے پابند ہیں۔ اسے قدامت پرستی کہئے یا کسی اور نام سے یاد کیجئے۔ مگر یہ پابندیٔ رسوم انہیں مادی ترقی سے باز نہیں رکھتی۔ ان کا قدم زمانے کے ساتھ چلنے میں کبھی پیچھے نہیں پڑتا۔

نورالحسن برلاس

نئی بات۔ پرانی بات

کچھ بات عجب ہے اور نئی اِن لمحوں میں!

کچھ بات پرانی بھی ہے اتنی جتنا پرانا وقت کا راگ!

کچھ بات نئی ہے ان میں جیسے تم نے دبایا ہات مرا!

کچھ بات نئی ہے اِن میں جیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں!

کچھ بات نئی ہے ان میں جیسے سورج کی زریں کرنیں

ساگر کے کھولتے پانی پر کچھ رنگ سا کرتی جاتی ہیں!

کچھ بات نئی ہے ان میں جیسے چاند کی ٹھنڈی سی کرنیں

پیڑوں سے چھن کر آتی ہیں اور موہن سائے بناتی ہیں!

کچھ بات نئی ہے ان لمحوں میں جو اُس وقت میں بھی ہوگی

جس وقت نہ ہوں گے تو اور میں!

ہاں بات نئی ایسے جیسے پانی ساحل پر سر پٹکے!!

"میراجی"

جو ہوتا میں راجہ

جو ہوتا میں راجہ، مری جاں! — جو ہوتا میں راجہ؛
کئی ملک قبضے میں کرتا میں،
پھر تیرے قدموں پہ جھکتے، ہر اک ملک کے رہنے والے!
وہ کھاتے تری مست آنکھوں کی قسمیں،
ترے کالے بالوں کی ہونٹوں کی قسمیں!
ترے نرم ہونٹوں کی بالوں کی قسمیں
وہ کھاتے،

ہمیشہ وفادار تیرے وہ رہتے،
ہمیشہ وفادار تو میری رہتی،
ہمیشہ وفادار میں تیرا رہتا!

~~~~~

جو ہوتا میں راجہ
تو لاتا میں ہیرے
میں لے آتا موتی، — کئی لعل نیلم، زمرد
تجھے لا کے دیتا!
یہ دنیا انگوٹھی کا ہوتی نگینہ!
ستاروں کی مالا گلے میں لٹکتی!
یہ چاند اور سورج بھی ہوتے
ترے نرم اور گرم سے جسم کے بے بہا اور انمول گہنے!
~~~~~

تجھے لا کے یہ کچھ میں دیتا مری جاں
جو ہوتا میں راجہ مری جاں
جو ہوتا میں راجہ

مگر میں بھلا دوں یہ وحشی سے سپنے!
جنوں خیز الفاظ دل میں نہ آئیں
اور اونچے خیال آسماں کے نہ لائیں!
زمیں کے ہیں تُو اور ہیں رہنے والے۔
کہیں دُور بن میں برندا کے بن میں مجھے دے رہی ہے سنائی
کنھیا کی بنسی!
یہ سُر ہیں کہ جادو جنہیں سُن رہی ہے کوئی سانولی مست رس والی گوپی،
کنھیا کی رادھا کہ گوکل کی رانی!

یہ سُر ہیں محبت کی باتیں کہ جن سے
پریتم کو سندر سے سندر بنا دیں، — پریمی کی آنکھیں!
یہ سُر ہیں محبت کے جادو کہ جن سے
پریتم کو اپنا بنا لیں، — پریمی کے جذبے!
تجھے بھی میں اک گیت ہی لا کے دیتا، مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ، مری جاں —
جو ہوتا میں راجہ!

"میراجی"

"فرانسا وی ان"

تخیل پرست انسان

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افرادِ تمثیل:۔

سلیم ۔۔۔۔ صاحبِ خانہ
اختر ۔۔۔۔ مہمان
نووارد ۔۔۔۔ چور

وقت:۔ رات کے ایک اور دو بجے کے درمیان۔

منظر:۔ ایک اوسط درجے کے گھرانے کا ڈرائنگ روم۔ خوب آراستہ وپیراستہ۔ دو مرد کرسیوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ بائیں طرف کی کھڑکی میں سے چاند کی ایک شعاع کمرے میں آرہی ہے۔ سامنے ایک بڑی کھڑکی ہے جو کٹہرے کی طرف کھلتی ہے۔ کمرے میں اور کوئی روشنی نہیں۔ یہ دو مرد سلیم اور اختر ہیں۔ سلیم صاحبِ خانہ ہے اور اختر اس کا مہمان۔ سلیم کی عمر ۳۵ برس کی ہے صورت شکل سے درشت مزاج اور سخت گیر معلوم ہوتا ہے۔ اختر کی عمر ۲۰ یا ۲۱ برس کی ہے۔ دونوں مضبوط و توانا ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو سرگوشی کے لہجے میں۔ انہیں معلوم ہوا ہے کہ چند روز سے کوئی چور اُن کے گھر کا چکر لگا رہا ہے۔ آج اُسے پکڑنے کی فکر میں یہ دونوں جاگ رہے ہیں۔ آتش دان میں آگ چمک رہی ہے۔

اختر۔ (سامنے والی بڑی کھڑکی کھول کر چپکے چپکے پنجوں کے بل واپس آتا ہے) کچھ بھی نہیں ہے باہر تو۔ یہ کیا مشغلہ نکالا ہے تم نے؟ (پھر باہر جھانکتا ہے) پتہ تک نہیں کھڑکتا۔ باہر تو خوب سردی ہے۔

سلیم۔ کھڑکی بند کر دو۔ نہیں کھٹکا نہ لگاؤ ابھی۔ یونہی بھیڑ دو۔

اختر۔ اب تو وقت ہو گیا ہوگا۔ کس وقت دیکھا گیا تھا اُسے؟

سلیم۔ بس کوئی یہی وقت ہوگا۔ بھئی میں تو بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ دیکھنے والوں کو یونہی شبہ گزرا ہوگا (جیب میں سے سیگریٹ کیس نکال کر سگریٹ جلاتا ہے) جب مسلسل تین راتوں تک وہ یہاں آتا رہا اور خالی ہاتھ گیا تو کچھ ضروری نہیں ہے کہ آج پھر وہ یہیں آئے۔

اختر۔ (آتش دان کی طرف جاتے جاتے ٹھٹک کر) یہ آہٹ کس کی ہے؟ (غور سے سنتا ہے) مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی کے پاؤں کی چاپ ہے تمہارے پاس اپنا طمنچہ ہے نا؟

سلیم۔ ہاں ہے۔

اختر۔ میرے پاس بھی تیار ہے۔

سلیم۔ میرا طمنچہ خالی ہے۔

اختر۔ میرا بھرا ہوا ہے۔

(کمرے میں گھنٹہ ایک بجاتا ہے۔ خاموشی میں اس کی آواز زور سے سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد ہی گھر کے کسی اور حصے میں سے کسی اور گھنٹے کے ایک بجانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر کسی اور گھنٹے کی آواز آتی ہے۔ اس کے بعد دور سے گھنٹہ گھر کا گھڑیال بجتا ہے)

سلیم۔ یہ ایک بجا ہے یا ڈیڑھ؟

اختر۔ (میز پر رکھے ہوئے بجلی کے لیمپ کو روشن کرتا ہے اور اپنے ہاتھ کی گھڑی دیکھتا ہے) ڈیڑھ بجا ہے۔ سنو۔ پھر آواز سنائی دی۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی کی آہٹ سُنی ہے۔

(دونوں سنتے ہیں۔ آہٹ سنائی دیتی ہے)

اختر۔ (جیسے ایک دم سے گھبرا گیا ہو) یہ۔ سنائی دی؟

سلیم۔ ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو ۔ ۔ ۔ لیمپ بجھا دو (اختر لیمپ گل کر دیتا ہے)

اختر۔ دیکھو پھر! کوئی ادھر ہی آرہا ہے۔

(سلیم اپنی جیب میں سے طمنچہ نکال کر کارتوس چڑھاتا ہے اور دونوں جلدی سے ایک پردے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ ایک لمحہ بعد کمرے کے فرش پر ایک تاریک سایہ پڑتا ہے۔ کھڑکی کے باہر کوئی ہے)

اختر۔ خدا خیر کرے۔ وہ آپہنچا۔

(سایہ آگے پیچھے حرکت کرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ وہ باہر برآمدے میں گھوم رہا ہے اور یہ دونوں پردے کے پیچھے چھپے کھڑے ہیں۔ کھڑکی کے قریب پھر کوئی نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ کھڑکی کو کھولتا ہے۔ کھٹکا کھلا ہوا ہے اس لئے پٹ کھل جاتے ہیں۔ آنے والا مذبذب حالت میں کھڑا رہتا ہے۔ پھر بہت ہوشیاری سے کمرے کے اندر ایک قدم رکھتا ہے اور کان لگا کر سنتا ہے۔ اس کا سر سلیم کے بہت قریب ہے۔ اس کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا ہے۔ پھر وہ اندر قدم بڑھاتا ہے۔ سلیم نہایت پھرتی سے نکل کر کھڑکی کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اختر لپک کر دروازے پر پہنچ جاتا ہے)

سلیم۔ اب کہاں جاتے ہو دوست!

(آنے والا گھبرا کر کھڑکی کی طرف پلٹتا ہے تو سلیم اور طمنچے کو دیکھتا ہے۔ پیچھے ہٹ کر ایک کونے میں ہو جاتا ہے)

سلیم۔ (طمنچے کی زد میں اُسے لیتے ہوئے) اپنے منہ پر سے ڈھاٹا ہٹاؤ اور ہاتھ اونچے کرو۔ (ایک دفعہ پھر اپنے الفاظ دُہراتا ہے) اپنے منہ سے ڈھاٹا ہٹاؤ اور ہاتھ اونچے کرو ورنہ گولی تمہارے جسم کو توڑ کر نکل جائے گی (نووارد سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے پھر دانستہ طور پر اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر لیتا ہے) چلو چلو۔ یہاں یہ حماقت نہیں چلے گی۔ اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گے تو میں گولی چلا دوں گا۔ (نووارد ساکت و خاموش کھڑا رہتا ہے) میں تین تک گنتی گنتا ہوں اور پھر طمنچہ داغ دوں گا۔ ایک ۔ ۔ ۔ دو ۔ ۔ ۔ تین! ۔ ۔ ۔

(سلیم کو گولی چلانے کا خیال تک نہیں تھا۔ تین کی آواز ختم ہو جاتی ہے اور دونوں بدستور کھڑے رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ نووارد ڈر کر حکم نہیں مانتا سلیم کچھ پست پڑتا ہے۔ نووارد ایک دم سے بولتا ہے۔ آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ آواز ہلکی ہے مگر اس میں ایک نوع کا وقار ہے)

نووارد۔ گولی چلاؤ۔ سوچو مت۔ گولی چلاؤ۔

اختر۔ (کچھ گھبرایا ہوا کیونکہ پہلے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا) اگر تم سنتے کیوں نہیں جو تم سے کہا جا رہا ہے وہ کیوں نہیں کرتے؟

نووارد۔ تم گولی کیوں نہیں چلاتے ۔ ۔ ۔ میں جو تم سے کہہ رہا ہوں۔ اس طرح تو یہاں کھڑا رہنا بہت دشوار ہے۔

اختر۔ تم کون ہو؟

(نووارد اپنا ڈھاٹا کھول دیتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال کی ہے۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا ظلم و تشدد اُس نے برداشت کیا ہے مگر جو مصائب اس نے اٹھائے ہیں اُن سے اُس کی شائستگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس کی بول چال اور لب و لہجہ نہایت صاف اور شستہ ہے)

نووارد۔ میں کون ہوں؟ چور ۔۔۔ ایک معمولی چور ۔۔۔ بس یہ ہوں میں۔ آپ نے گولی کیوں نہیں چلائی ۔ ۔ ۔ میری خواہش یہی تھی مجھے اس سے نجات مل جاتی۔ اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوتا۔

سلیم (سرد مہری اور سخت گیری سے) ٹھہرے رہو جہاں تم ہو۔ خبردار جو تم ہلے۔ اختر کھڑکی کا کھٹکا لگا دو (اختر کھڑکی بند کر دیتا ہے۔) دروازے میں بھی قفل لگا دو (اختر دروازہ بھی بند کر دیتا ہے) روشنی جلا دو۔

(میز کے قریب جا کر اختر لیمپ روشن کر دیتا ہے)

نووارد۔ (جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے اور کافی دیر تک خاموشی رہتی ہے تو کچھ اور ہی لہجے میں بولتا ہے اس کی آواز میں غیر متوقع چمک ہوتی ہے ۔۔۔ جیسے طوفان خیز رات میں ستارے کی چمک) تو پھر اب؟ اب آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ پولیس کو بلوائیں گے۔ شاید۔ تھانہ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہے نا؟ کیا آپ کے ہاں ٹیلیفون ہے؟

سلیم۔ نہیں۔

نووارد۔ یہ تو ایک عذاب ہے (کچھ خوش مذاقی سے کہتا ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے بولنے والا شکست خوردہ اور مایوس ہو چکا ہے) سنتے ہیں جناب آپ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے لئے باعث زحمت بن رہا ہوں۔ ابھی تو صرف ڈیڑھ بجا ہے نا کیسا نامناسب وقت

ہے) سلیم خاموش رہتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ نووارد کہتا ہے) یہ اچھا ہوا کہ آپ دو حضرات یہاں ہیں۔ ایک صاحب اگر شہر جائیں گے تو دوسرے میرے پاس ٹھہریں گے (پھر جیسے نیا خیال ذہن میں آیا ہو) یا پھر تینوں کو یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔

سلیم۔ (خشکی سے) ازراہِ کرم اس کا فیصلہ ہم دونوں پر چھوڑ دیجئے۔

نووارد۔ بسر و چشم۔ میں تو صرف اس لئے بول رہا ہوں کہ خاموشی نہ رہے ——— آہ!

(اظہارِ تکلیف کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نووارد اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور گرنے سے بچنے کے لئے ایک کرسی کا سہارا لیتا ہے۔ سلیم اور اختر اُسے دیکھتے رہتے ہیں کچھ تعجب سے اور کچھ شبہ سے۔ ایسے شخص کو گرفتار کرنے کی اُن کو مطلق توقع نہ تھی۔ کافی کوشش کے بعد نووارد اپنے آپ کو سنبھالتا ہے اور جب سنبھل جاتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ خوش مذاقی کا جو انداز اس میں تھا بلکخت معدوم ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کسی نے اُسے کچل ڈالا ہے۔ اُس کی آنکھیں بے معنی طور پر کمرے میں گھومتی ہیں۔ سامنے کچھ پھل پڑے رکھے ہیں۔ اس پر اس کی نظر پڑتی ہے)

نووارد۔ کیوں جناب اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو اس میں سے میں کچھ لے لوں۔ میرے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں گئی ہے کوئی . . . پرسوں دن کے وقت سے۔

سلیم (ہاتھ میں طمنچہ لئے ہوئے) تم جہاں ہو وہیں ٹھہرو۔ اختر تم اٹھاکر دے دو۔

(اختر چند پھل اٹھاکر نووارد کے سامنے میز پر رکھ دیتا ہے)

نووارد۔ شکریہ (جلدی جلدی نگلنا شروع کر دیتا ہے جیسے بہت بھوکا ہے) . . . تھوڑا سا پانی بھی مل سکتا ہے مجھے؟

سلیم۔ اگر آپ ہمیں پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع دے دیتے تو دعوت کا انتظام پوری طرح کر لیا جاتا۔

نووارد (سلیم کے طنز کو محسوس نہ کرتے ہوئے) معاف فرمائیے گا۔ میرا اس طرح آپ سے چیزیں طلب کرنا بدتمیزی میں داخل ہے . . . میں چور ہوں لیکن یہ محسوس کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ خیر (بطور ثبوت کے کہتا ہے) یہ پہلا موقع ہے کہ میں پکڑا گیا ہوں۔

(سلیم اختر کو اشارہ کرتا ہے کہ نووارد کو پانی دے دے۔ اختر گلاس میں پانی دیتا ہے) شکریہ۔ آپ نے بہت کرم فرمایا (پانی پیتا ہے) میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کی سخت ضرورت تھی۔

سلیم (اختر سے) کیوں بھئی ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ میں جاؤں شہر میں اور کسی کو یہاں بلاکر لاؤں ——— یا تم جاؤ اور میں یہاں ٹھہروں۔

اختر۔ نہیں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں یہاں ٹھہر جاؤنگا

نووارد۔ میں بالکل ساکت و خاموش رہوں گا۔

سلیم۔ کاش آپ ایسے ہی رہیں۔

(نووارد کھسیانی ہنسی ہنستا ہے)

اختر۔ نزدیک کا راستہ کونسا ہے؟ کھیتوں میں سے یا پکی سڑک؟

سلیم۔ کھیتوں میں سے ——— صرف اندیشہ ہے کہ تم راستے سے بھٹک جاؤگے۔ میرا ہی جانا مناسب ہے۔

اختر۔ مجھے راستہ خوب معلوم ہے۔

سلیم۔ یقین ہے تمہیں؟

اختر۔ بالکل۔

سلیم۔ اچھا۔ میں بطور تمہارے میزبان کے تم سے پوچھتا ہوں تم جاتے ہو ——— یا یہاں ٹھہرتے ہو؟

نووارد۔ آپ حضرات پیسہ اچھال کر فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے (یہ بات غیر متوقع طور پر کہی گئی اور چونکہ اچانک کہی گئی تھی اس لئے دونوں نے پلٹ کر نووارد کی طرف دیکھا) مجھ سے اُدھار لیجئے۔ (اپنی جیب میں سے ایک سکہ نکال کر میز پر ڈالتا ہے) لیجئے۔ ایک پیسہ ہے ——— اور ساری دنیا میں میری یہی کل دولت ہے! تو اسے آپ بعد میں مجھے واپس دے دیجئے گا دے دیں گے نا؟

(سلیم اور اختر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، گویا [illegible] ہیں کہ ہمیں اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ دونوں نے نظروں ہی نظروں میں طے کیا کہ یہی کر دیکھنا چاہئے)

سلیم۔ (پیسہ اٹھا لیتا ہے) اچھا اختر تم [illegible] لیتے [illegible] حروف!

اختر۔ حروف۔

(کمرے کے بیچ میں جو چھوٹی میز ہے اس [illegible] اختر دائیں طرف سلیم اور اس کے پیچھے نووارد ہے [illegible])

نو وارد۔ ٹھہریئے۔ مجھے ایک خیال اور آیا ہے۔ میری طبیعت اس وقت کچھ موزوں ہے۔ یہ کھانے کا نتیجہ ہے۔ چلئے ہم تینوں ساتھ چلیں۔ آپ میں سے کسی کو پھر میرے پاس تنہا نہیں رہنا پڑے گا اور جب آپ واپس آئیں گے تو اکیلے نہیں آئیں گے۔

سلیم۔ واللہ! ٹھیک بتایا تم نے۔

نو وارد۔ میرے خیالات عموماً ٹھیک ہی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں اس حالت میں ہوں . . . میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ کھانے کا خمار . . . کیوں جناب اس سے پہلے کہ ہم یہاں سے روانہ ہوں کیا آپ کو آپس میں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا اگر میں ایک آرام کرسی میں آسودہ ہو کر چند منٹ کے لئے ایک سیگرٹ پیوں؟ اس لطف سے میں مہینوں سے محروم ہوں . . . آپ سمجھ نہیں سکتے کہ میرے لئے کتنی بڑی تفریح کا باعث ہو گا۔

سلیم۔ بہت اچھا۔

اختر۔ تم عجیب و غریب آدمی ہو۔

نو وارد۔ (آواز میں تھکی ہوئی ناامیدی کی جھلک) کیا واقعی؟

سلیم۔ تم محسوس نہیں کرتے کہ تم کیا ہو؟

نو وارد۔ کیا کوئی بھی یہ محسوس کرتا ہے؟ . . . آپ کیا ہیں؟ (تکلیف سے کراہتا ہوا ایک کرسی میں بیٹھ جاتا ہے پھر دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے) مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ حضرات کی نیند میں مخل ہو رہا ہوں مگر ایک لحاظ سے یہ غلطی آپ ہی کی ہے — آپ کو میرے لئے جاگتا نہیں رہنا چاہیئے تھا (کرسی میں بیٹھ جانے کے بعد نو وارد کے گرد کچھ اس درجہ تاسف انگیز ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ اختر کا دل پسیج جاتا ہے۔ سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر نو وارد کے سامنے پیش کرتا ہے اور نو وارد ایک سگریٹ لے کر کچھ اس طرح مسکرا کر اختر کی طرف دیکھتا ہے جیسے کوئی بچہ اظہارِ ممنونیت کرتا ہے) شکریہ۔

(اختر دیا سلائی جلا کر نو وارد کا سگریٹ سلگاتا ہے۔ ان کی نظریں ایک لمحے کے لئے ملتی ہیں۔ نو وارد اپنی نظریں جھکا لیتا ہے لیکن اختر اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

سلیم (اختر کی مہربانی کو بہ نظرِ تحسین دیکھتا ہے اور ہنس کر کہتا ہے) کچھ اور آپ ان کی خاطر کر سکتے ہیں!

اختر۔ (ہلکی آواز میں) بیچارہ! اس کے لئے یہ واقعہ ایسا ہے جیسے کوئی بُرا خواب ہو۔

نو وارد۔ یہ آپ کیوں کہتے ہیں؟ . . . یہ بُرا خواب نہیں ہے۔ (آرام کرسی میں پھیل بیٹھتا ہے اور سگریٹ مزے لے لے کر پیتا ہے۔ پیچھے جھکتا ہے، پاؤں پھیلاتا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتا ہے۔ گھٹنے پر سے پاجامہ پھٹا ہے جس میں سے گھٹنا نظر آتا ہے اس لئے نو وارد پہلو بدل کر بیٹھتا ہے) یہ ایک خوبصورت خواب کی طرح ہے۔ میں نے یہ خواب اکثر دیکھا ہے، اور اتنا دیکھا کہ اس کو فراموش کر بیٹھا . . . سجے سجائے نفیس کمرے میں اس طرح پھر سانس لینا (کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے تاکہ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا سکے) واللہ! حسین تصویریں اور قالین! (ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر اس کی نظر قالین پر سے ہوتی ہوئی اپنے پھٹے ہوئے پاجامہ پر پڑتی ہے) . . . اس حلیہ کو پہنچنے میں مجھے دس برس لگے ہیں (کرسی میں ابھر کے بیٹھتا ہے۔ پھر سامنے میز پر جو تصویر رکھی ہے اس پر نظریں جم جاتی ہیں) لاہور! مشن کالج!

اختر۔ ہاں (میز پر جو لیمپ رکھا ہے اُسے روشن کر دیتا ہے)

نو وارد۔ میں بھی ایک زمانے میں وہاں تھا (کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے)

اختر۔ آج کل میں اس کالج میں ہوں۔

نو وارد۔ (بہت دلچسپی لیتے ہوئے عجلت سے) اچھا آپ آج کل وہیں ہیں! بوڑھا سیموئل اب بھی سینیئر ٹیوٹر ہے؟

اختر۔ (میز پر بیٹھتے ہوئے) ہاں۔

نو وارد۔ (ہنس کر جیسے پرانی باتیں یاد آرہی ہوں) کیا واقعی ابھی تک وہیں ہے؟ پیارا بوڑھا سیموئل! کیا آپ وہاں تازہ وارد ہیں یا سینیئر؟

اختر۔ (قدرے ناز و پندار کے ساتھ) میں تھرڈ ایئر میں ہوں (نو وارد سر ہلاتا ہے گویا سمجھ گیا)

نو وارد۔ اب کے جو آپ بوڑھے سیموئل سے ملیں تو انہیں یاد دلائیے کہ . . . مگر نہیں۔ شاید یہی بہتر ہو گا کہ آپ تذکرہ نہ کریں۔

(پھر کھیلنے کی آواز سنائی دیتی ہے جیسے کوئی ہنس رہا ہو)

سلیم۔ آپ دونوں اپنی اپنی تعلیمی زندگی کا تذکرہ ختم کریں تو ہم چلیں۔

اختر۔ نہیں سلیم۔ نہیں ——— ابھی بہت وقت ہے (نووارد کی طرف سگریٹ کا ڈبا بڑھاتے ہوئے) سگریٹ اور لیجئے جناب (اس "جناب" پر سلیم بے چینی سے جنبش کرتا ہے اور اختر بھی اپنی لغزش کو محسوس کرتا ہے) میرا مطلب یہ ہے . . . (بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ نووارد فوراً سگریٹ لے کر شکریہ ادا کرتا ہے) مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیئے اور یہ خلاف تہذیب بھی ہے لیکن . . . میرا مطلب یہ ہے کہ . . . میں بے جا سوال نہیں کرنی چاہتا۔ لیکن آپ نے ایسی زندگی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟

(نووارد اختر کی طرف ایک نظر دیکھتا ہے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں جب جواب دیتا ہے تو سوال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا)

نووارد۔ ایک دن جو اپنے کمرے میں میں آیا تو دو خط مجھے ملے۔ (توقف) ایک میں کرکٹ کا میچ کھیلنے کی دعوت تھی اور دوسرے میں یہ اطلاع تھی کہ میرے والد کا سب روپیہ ڈوب گیا۔ اب ایک کوڑی بھی باقی نہیں تھی۔

(نووارد کی نظریں کمرے میں گھومتی ہیں۔ پھر اختر پر پڑتی ہیں۔ اس کے بعد سامنے جم کر رہ جاتی ہیں جیسے بھولی بسری باتوں کو کوئی یاد کر رہا ہو)

اختر۔ پھر کیا ہوا؟

نووارد۔ پھر کیا ہوا؟ میں نے کوشش کی اور ایک دفتر میں مجھے ساٹھ روپے ماہوار کی جگہ مل گئی۔ لیکن نئے نئے خیالات میرے دل میں ہمیشہ پیدا ہوتے تھے اس لئے راتوں کو میں مضامین لکھا کرتا تھا بعض رسائل و اخبارات سے معاوضہ مل جاتا تھا۔ فلم کے لئے ایک کہانی بھی لکھی تھی جو اچھے داموں بک گئی۔ اس دن مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس طرح میں نے کافی رقم پیدا کی۔

اختر۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر کیا ہوا؟

نووارد۔ ایک عورت ——— میں نے اس کی زندگی برباد کر دی۔

سلیم۔ (جو کمرے میں ٹہلتا پھرتا ہے۔ کھڑکی سے بستر تک اور بستر سے کھڑکی تک) مجھے یہی گمان تھا۔ کوئی آدمی تمہاری حالت کو اس وقت تک نہیں پہنچتا جب تک اپنا ہی کوئی ذاتی نقص اُسے نہ گرائے۔ کیچڑ کی چھینٹیں اُسی وقت پڑتی ہیں جب کیچڑ میں پاؤں رکھا جائے

نووارد۔ (سلیم کی طرف پلٹ کر ملائمت سے کہتا ہے) نہیں۔ لوگ موٹروں میں تیزی سے میرے قریب سے گزرے اور مجھے کیچڑ میں لت پت کر گئے اور پھر مجھے اس درجہ گندہ و ناپاک سمجھا کہ مجھے ملنے کے لائق نہ سمجھا (آواز میں اب احساسات نمایاں ہوتے ہیں) ہماری شادی ہو گئی (سلیم سے) اس نے اُس کی زندگی کو برباد کر دیا ——— اور میری زندگی کو بھی . . . (سلیم تمسخر سے دیکھتا ہے) اگر وہ تنہا ہوتی تو میں غرق ہونے سے بچ جاتا ——— وہ آزاد رہتی مگر اس کے لواحقین بھی تھے اور دنیا ہمیں ایک دوسرے سے جدا بھی ہونے نہیں دیتی تھی ——— اس لئے ہم دونوں کچلے گئے۔

سلیم۔ مضحکہ خیز بات ہے۔

نووارد۔ (سادگی سے) ہے نا؟ لیکن اس وقت ہم مضحکہ خیز ضرور تھے۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ خدا ان کی مدد کرے۔ انسان تو مدد کرتے نہیں۔

سلیم۔ باتیں بنانے میں کیا لگتا ہے ——— اپنی ناکامیوں کے لئے انسان ہمیشہ عذر تلاش کر لیتا ہے۔

نووارد۔ عذر تلاش کر لیتا ہے؟ . . . (ایک دم سے بھڑک اٹھتا ہے) اور میں ناکام کیسے ہوں؟ کیا اُن سب کاموں میں جنہیں میں نے کرنے کی کوشش کی مجھے بری طرح ناکامی ہوئی؟ میں نے اپنے آپ کو ایک کافی سمجھ دار انسان بنایا۔ میں نے اپنے آپ کو محسوس کرنے اور سوچنے کا عادی بنایا۔ میں نے اوروں کی محسوس کرنے اور سوچنے میں مدد کی۔ میرے پاس تخیلات تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں ان کا اظہار لکھ کر کر سکتا ہوں ——— اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دوستی اور محبت کے معنی سیکھے ——— ان سب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس پر ناز کیا جا سکے ——— میں نے غلطیاں کیں، مگر میں ناکام نہیں ہوا اور وہاں کھڑے ہو کر آپ ——— اس سب کچھ کے مالک ——— کیوں حقارت سے ناک بھوں چڑھا کر اس چیز کو نفرت سے دیکھ رہے ہیں جس سے میری موجودہ ہستی عبارت ہے؟ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ میں نے جو کچھ کیا اس کی وقتی قیمت کچھ بھی نہیں تھی۔ بس یہی بات ہے اور آپ چاروں طرف دیکھئے کہ لوگ اپنا روپیہ کس چیز پر صرف کرتے ہیں ——— بیکار زہریلے [illegible] کے ڈھیروں کو دیکھئے جنہیں وہ پڑھتے ہیں۔ نشاط خانوں [illegible] دیکھئے کہ ذلیل موسیقی [illegible] کے لئے لوگوں سے کس قدر کھچا کھچ

بھرے ہوتے ہیں۔ اُن سڑی سڑی تصویروں کو دیکھئے جنہیں وہ اپنی دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں۔ ان ذلیل گانوں کو دیکھئے جو عوام میں مقبول ہو کر بچے بچے کی زبان پر ہوتے ہیں — اور پھر مجھے حقارت سے دیکھئے کہ میں اس کو فروخت نہ کرسکا جو میرے اندر تھا اور جب لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو اُسے وہ صرف کس طرح کرتے ہیں؟ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جو دنیا کے اور شہروں سے برابر کی ٹکر لیتے ہیں، آپ میرے ساتھ چل کر اُس گندگی اور ارذل بستی کو دیکھئے جو انسانیت کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے — اور پھر مجھے ناکام کہئے کہ میں اُبھر نہ سکا۔ اگر روپیہ ہو تو دنیا ناکامی کو بھی کامیابی سمجھے گی۔ یہ معیار ہے قدر و قیمت کا — اور یہ معیار بدترین، ظالمانہ، اور سب سے جھوٹا معیار ہے (وفورِ جذبات سے کرسی میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) رہے عذرات! اگر عذرات کا کوئی ذکر ہے تو جتنی کامیابیاں آپ کو حاصل ہوں اتنے ہی عذرات بھی پیش کرنے چاہئیں کہ آپ موٹروں میں بیٹھے اوروں پر تیزی سے کیچڑ اچھالتے جاتے ہیں۔

(نووارد کا ہیجان ختم ہو جاتا ہے اور وہ ہلکی طنزیہ ہنسی کے ساتھ بے دم سا ہو کر کرسی میں پھر دراز ہو جاتا ہے۔ اختر خاموشی کو توڑتا ہے)

اختر۔ آپ کے ڈرامے کا کیا ہوا؟

نووارد۔ (ہنس کر) وہ دکھایا ہی نہیں گیا۔ تھیٹر کے مالک نے کہا کہ اس میں خیالات بہت زیادہ ہیں اور لوگوں کو اس قسم کی چیز پسند نہیں آتی۔ جب اس ڈرامے کو قبول کر لیا گیا تھا تو میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اپنے لکھنے لکھانے پر اعتماد کیا تھا مگر اِن کا رُخ غلط ہوتا گیا۔ ان میں بہت زیادہ سنجیدگی آگئی۔ میں اس کا کوئی علاج نہ کرسکا۔ میں نے کبھی اس نیت سے لکھا ہی نہیں تھا کہ عوام کی جہالت کے مطابق ہو اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُن کے مذاق کا لحاظ رکھا جائے اور بیوی کے وجود کی وجہ سے معاملات مشکل تر ہوتے چلے گئے اور ہم گرتے چلے گئے گرتے چلے گئے یہاں تک کہ انجام پر پہنچ گئے۔

اختر۔ انجام؟

نووارد۔ (سست اور بے زور آواز میں) کشمکش اور کھانے کے لئے معقول غذا بھی نہیں۔ اس سے اُس بیچاری کی زندگی اجیرن ہو گئی (اُسے واقعات واضح طور پر یاد آتے ہیں اور وہ پھر بھڑک اٹھتا ہے) متعفن تنگ و تاریک محلے میں ایک بوسیدہ بدبودار کمرہ — اور ڈاکٹر جس کی فیس دینے کے لئے میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی — اور میں اُسے سخت کرب و تکلیف سے مرتا دیکھتا رہا — اور میں نے کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھنے سے ہمیشہ نفرت کی (اس کے ہاتھ آنکھوں کو چھپا لیتے ہیں گویا کسی بھیانک تصویر کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ جلدی ہی آنکھیں کھول دیتا ہے اور ذرا آہستگی سے کہتا ہے) بس یہ سب کچھ ہو گیا — میرا خیال یہ تھا کہ میں ان باتوں کو بھول گیا ہوں گا۔

اختر۔ اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟

نووارد۔ (اختر کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے) آپ لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں بیٹھ کر اپنے کل وحشیانہ ماضی کی روداد سناتا رہوں گا؟

اختر۔ معاف فرمائیے گا۔ مجھے نہیں پوچھنا چاہئے تھا — خدا جانے میں نے آپ سے کیوں دریافت کیا . . . نہ جانے کیوں میں جاننا چاہتا تھا۔

نووارد۔ (اختر کے ملائم و متاسف لہجے سے فوراً متاثر ہو کر) کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ میرے حال سے کیوں آگاہ نہ ہوں (کچھ حقارت سے) شاید اس وجہ سے کہ دلچسپ ہے۔ آپ اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کریں گے — دو بجے رات کو جیتے جاگتے چور کے روبرو — زندگی کو دیکھ رہے ہیں آپ؟

اختر۔ جی نہیں۔ جی نہیں۔

نووارد۔ (اختر کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے اپنی داستانِ حیات سناتا ہے) جب وہ مر گئی تو میں نے ہر چیز کو پھینک دیا اور مردوں اور عورتوں کو یکجا دیکھنا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ میں بھاگ گیا کھیتوں میں چلا گیا۔ موسم گرما تھا۔ سڑک کنارے کسی درخت کے سائے میں پڑ رہتا تھا — بھیک مانگتا تھا یا چھوٹی موٹی مزدوری کر لیتا تھا۔ میری حالت اس درجہ خراب نہ ہوتی اگر وہ ہر وقت میرے کانوں میں روتی نہ رہتی۔ جب پہلی رات کو بارش ہوئی تو مجھے نزلہ ہو گیا۔ میں بیمار پڑ گیا — اور پھر سردیاں آگئیں مجھے پھر شہر میں آنا پڑا۔ میں کمزور تھا — اس قدر کمزور کہ کسی کام کے

لائق نہیں۔ کام اگر تھا بھی تو مجھ سے نہ ہوتا۔ خدایا! بس یہ تھا وہ موقع جب میں ڈوب کر بالکل تہ میں پہنچ گیا . . . فاقے مرنے لگا . . . شاید آپ کے لئے یہ صرف ایک لفظ ہو — صبح کا ناشتہ نہ کرنا یا دن کا کھانا دو ایک گھنٹے دیر سے کھانا . . . مگر فاقے کرنا — میں نے یہ کیا ہے — مہینوں تک کیا ہے — دکانوں اور پٹریوں پر پڑے رہنا اور کسی پرانے پھٹے ہوئے بوری کے ٹکڑے سے گرمی حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس مخلوق سے نفرت کرنا جس کے ساتھ رہنے سہنے پر مجبور رہتا — جو آرام و آسائش سے گزر کرتے انہیں کوسنا۔ ایک دن شب میں مجھے پولیس نے گرفتار کرکے چالان کر دیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا کہ تم سوسائٹی کے لئے عذاب ہو (نہایت حقارت سے) "سوسائٹی کے لئے عذاب!" اس سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔ سوسائٹی کا میں اس درجہ مرہونِ منت تھا کہ میں اس کے لئے عذاب بننا ہرگز نہ چاہتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے ایک چیز لے لی جو میری نہیں تھی اور اُسے بیچ ڈالا — اور ایک شب کے لئے میرے پیٹ کے لئے غذا اور تن کے لئے گرمی کا انتظام ہو گیا۔ جائز یا ناجائز کا سوال ہی اس صورت میں پیدا نہیں ہوتا — یہ اس قدر بہیمانہ کیفیت ہوتی ہے۔ (سلیم کی طرف دیکھ کر) نفرت انگیز ہے نا یہ؟ . . . (وہ اٹھتا ہے) میں نے چیزیں اڑانی شروع کر دیں — مگر یہ چیزیں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ اُن کے اڑانے سے مالک کو سخت تکلیف اٹھانی پڑے — میرا مطلب حقیقی تکلیف سے ہے . . . (اپنا میلا کچیلا ڈھاٹا اٹھاتا ہے) پھر میں نے یہ صورت اختیار کی . . . بس . . . (ڈھاٹا میز پر ڈال دیتا ہے) . . . ہاں تو اب میں یہاں ہوں۔ (یکایک اُسے اختر کا طمنچہ میز پر قریب پڑا نظر آتا ہے۔ ڈھاٹے کے نیچے رکھا تھا۔ سلیم آتشدان کے قریب ہے۔ اختر نیچے فرش کی طرف دیکھ رہا ہے۔ نووارد طمنچہ اٹھا لیتا ہے اور چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ سلیم کی شست لگاتا ہے اور زور سے کہتا ہے) تو لیجئے!

(اختر گھبراہٹ میں ایک کرسی الٹ کر کونے میں جا کھڑا ہوتا ہے)

سلیم۔ (ایک لمحہ کے لئے بدحواس ہو کر) نیچے کرو اُسے (آواز سن کر نووارد متوجہ ہوتا ہے)

نووارد۔ وہیں کھڑے رہو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔

اختر۔ (اپنے کونے سے نکل کر نووارد کی طرف بڑھتا ہے) سنئے تو یہی یہ میرا ہے۔

(نووارد اختر کی طرف طمنچہ کرتا ہے)

سلیم۔ اختر وہیں ٹھہرو۔

(اختر ٹھہر جاتا ہے)

نووارد۔ بس ٹھیک ہے . . . اب اگر تم دونوں میں سے ایک بھی ہلا تو میں گھوڑا دبا دوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بھرا ہوا ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ اب آپ کا اپنا فعل ہوگا۔

اختر۔ وہ بھرا ہوا ہے۔

نووارد۔ شکریہ آپ کا۔

اختر۔ اگر آپ کسی کو مار دیں گے تو بھلا فایدہ کیا ہوگا۔ اس کے بدلے میں آپ کو پھانسی مل جائے گی۔

نووارد۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے پھانسی کی پروا ہوگی یا نہیں . . . دیکھو چپکے کھڑے رہو (سلیم ٹھہر ٹھہر کر نووارد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ طمنچہ اس کی طرف لگا ہے مگر وہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نووارد زور سے کہتا ہے) ٹھہرو!

سلیم۔ (نووارد کے قریب آجاتا ہے اور پُرسکون لہجے میں کہتا ہے) چھوڑیئے اسے۔ بہتر ہوگا کہ آپ [illegible] سے رکھ دیں۔

نووارد۔ آپ بہادر آدمی ہیں۔

سلیم۔ آپ بڑے بے وقوف ہیں . . . چھوڑیئے اسے (سلیم اس کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور نووارد مسکرا کر طمنچہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ سلیم اُسے میز کے خانہ میں مقفل کر دیتا ہے)

نووارد۔ مجھے اس کے حاصل کرنے کے بعد کوئی بڑا کارنامہ کرنا چاہئے تھا — آپ دونوں کو اس بات کی قسم [illegible] چاہئے تھی کہ مجھے جانے دیں گے — یا آپ کا سب [illegible] پیسہ حاصل کرنا چاہئے تھا — یا کچھ اور۔ مگر مجھے تو [illegible] نہیں کہ یہ کام کیسے کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] طمنچوں سے سخت نفرت ہے . . . اس قدر [illegible] سے! اگر سر میں گولی مارنی ہو تو پاؤں پر نشانہ لگانا پڑتا [illegible] ہے نا! مجھے یقین ہے کہ میں کسی کو طمنچے سے مار ہی نہیں [illegible]

اختر۔ (ایک دم سے) سلیم انہیں ہم جانے کیوں نہ دیں؟

نووارد۔ یا اللہ۔

سلیم۔ (خوش مزاجی سے) ہاں کہتے تو ٹھیک ہو۔ اتنی دور جانے سے ہم بچیں گے . . . میرا خیال یہ ہے کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں اس سے پیشتر کہ میری رائے پھر بدل جائے۔

نووارد۔ بہت اچھا۔ خدا حافظ۔ (کھڑکی کی طرف رُخ کرتا ہے)

سلیم۔ سنئے۔ (اس کے پیچھے پیچھے کھڑکی کے قریب آکر جیب میں سے کچھ روپے پیسے نکال کر اُسے دیتے ہوئے کچھ خفت و احساسِ ندامت سے کہتا ہے) آپ یہ لے لیں ـــــ اس سے آپ کو روزگار تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔ بہرحال کوشش کیجئے کہ کوئی کام مل جائے۔

نووارد۔ (روپے کی طرف دیکھکر سلیم کیطرف دیکھتا ہے) شکریہ . . . کیا میں ایک سگریٹ اور لے سکتا ہوں؟

اختر۔ (بغیر کسی احساسِ ندامت کے) آپ پورا ڈبہ لے جائیے۔ (اختر ڈبہ اٹھا کر لاتا ہے اور نووارد آگے بڑھ کر لیتا ہے۔

نووارد۔ (ڈبہ لے کر) شکریہ . . . خدا حافظ۔

اختر۔ خدا حافظ۔

(کھڑکی پر پہنچ کر نووارد پلٹ کر اختر سے کہتا ہے)

نووارد میں خوش ہوں کہ آپ نے وقتِ رخصت ہاتھ ملانے کی تجویز نہیں کی ـــــ یہ حماقت آمیز حد تک تھیئٹریکل ہو جاتا۔

(چلا جاتا ہے)

اختر۔ کیا دیا تم نے اُسے؟

سلیم۔ کوئی پچاس روپے۔

اختر۔ اچھا!

سلیم۔ میں بڑا بے وقوف ہوں (میز پر جو لیمپ روشن ہے اُسے بجھا دیتا ہے) یہ وقت کا اثر ہے۔ بھلا دو بجے رات کے بھی کسی کے ہوش و حواس بجا رہتے ہیں۔ آؤ۔ میں سونے جا رہا ہوں (کھڑکی بند کرکے پردے کھینچ دیتا ہے ـــ کمرے میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تاریکی میں سے اُس کی آواز سنائی دیتی ہے) لوگوں سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ کہہ دیں گے کہ کوئی اُچکا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھاگ گیا۔

اختر کی آواز۔ ٹھیک ہے (ایک لمحے کی خاموشی۔ پھر ایک کرسی کے گرنے کی آواز) توبہ۔ توڑ دیا گھٹنا۔

(سلیم دروازے کے پاس پہنچ کر دیا سلائی جلاتا ہے)

سلیم۔ لو آ جاؤ اب۔

(اختر نکل جاتا ہے۔ سلیم دیا سلائی بجھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کمرے میں گھنٹہ دو بجاتا ہے۔ اندر گھر میں دوسرا گھنٹہ دو بجاتا ہے۔ دور فاصلے سے گھنٹہ گھر کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر زور سے دو بجتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

(ماخوذ از مائلز میلیس)

شاہد احمد

رُباعی

ارزانیِ جانِ عشق ارزانی نہ ہوئی
عقل و خرد و تمیز ارزانی نہ ہوئی
ہم بھی سمجھے آن کو بندہ روتے امجدؔ
افسوس کہ کوئی شے ارزانی نہ ہوئی

امجد حیدرآبادی

غزل

چشمِ بینا کو حجابِ رُخِ زیبا کیا ہے
فطرتِ حُسن کو اندازِ یہ سوجھا کیا ہے

کبھی سورج ہے کبھی چاند ہے زیبِ گردوں
رات دن سوچ رہا ہوں کہ یہ ہوتا کیا ہے

پھول کھلتے ہیں تو کانٹے بھی نکل آتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ تماشا کیا ہے

سوچتا ہوں کہ ہے کیا کیا مری آنکھوں سے نہاں
اور میں دیکھ رہا ہوں یہاں پیدا کیا ہے

اپنی آنکھوں پہ تھا انساں کو غرورِ بے حد
اور کہتے تھے ستارے ابھی دیکھا کیا ہے

یہ شکایت ہے کہ تو یاد نہیں ہے مجھ کو!
چاند کو تا بہ سحر دیکھتے رہنا کیا ہے

عندلیبانِ قفس سے کوئی اتنا پوچھو
آخر انجامِ غم و آہ و بکا کا کیا ہے

کوئی ناکامِ تمنا ہی کرے اندازہ
مدعائے دلِ ناکامِ تمنا کیا ہے

بادۂ حال میں ہوں مست مجھے کیا معلوم
دوش کا رنج ہے کیسا غمِ فردا کیا ہے

خود کہے دیتی ہے ویرانیِ میخانۂ عشق
ساقیا حال ترے بادہ کشوں کا کیا ہے

رونا اس بات پہ آتا ہے کہ سوچا کیا تھا
اور اس بات پہ ہنستا ہوں کہ ہوتا کیا ہے

تیری کشتی نے مصیبت میں دیا تجھ کو جواب
ناخدا تیرے خدا کا بھی بھروسہ کیا ہے

میں بھی ان کا ہوں مرا دل بھی نہیں کا ہے ضیاؔ
اب بتاؤ کسے اپنا کہوں، اپنا کیا ہے

ضیا فتح آبادی

رادھا کے گیت !!

(۱)

کوئل گاتے گاتے چپ ہو گئی!
ندی بہتے بہتے رک گئی!
کلی ہنستے ہنستے رو پڑی!
رادھا پوچھتی ہے "سکھی! ہردے مندر کی مورتی آج
کیوں اداس ہے!!!"

(۲)

سکھی!
رادھا کا پریم ابھی ادھورا ہے!!
پورا اُس وقت ہوگا جب رادھا کی آنکھوں سے
آنسو نہیں موت کے سپنے ٹپکیں گے!
پورا اُس وقت ہوگا جب رادھا کے جیون کا
بن باس ختم ہوگا!
سکھی!
رادھا کا پریم ابھی ادھورا ہے!!

(۳)

سکھی، پریم ناگن سچے ہردوں کو کھا جاتی ہے!!
جل پری ساگر سے نکل کر کنارے پر آئی اور مر گئی!
کنول ساگر کے اندر گیا اور جان دے دی!
سکھی، پریم ناگن سچے ہردوں کو کھا جاتی ہے!

(۴)

ندی بہتی جا رہی ہے اور روئے جا رہی ہے!
کلی ہنستی جا رہی ہے اور روئے جا رہی ہے!
کوئل کوکتی جا رہی ہے اور روئے جا رہی ہے۔
سکھی، وہ پریم ہی کیا جس میں آنسو بہیں بھی اور تھم بھی
جائیں!!!

(۵)

آکاس کی اپسراؤں نے گا کر کچھ گیت،
چندرماں کو دے دیئے!
چندرماں نے وہ گیت اپسراؤں سے لئے،
اور روتے ہوئے تاروں کی طرف پھینک دئے۔
تارے خوشی میں چلّائے "ہمارے گیت ہمیں
مل گئے!!!"
رادھا کا ہردے بھی پکارتا رہا "آہ، میرا گیت
مجھے کیوں نہیں ملتا!!؟"

(۶)

سکھی، جا یہ ہار پریتم کو دے آ
پریم کا یہ ہار رادھا نے اپنے ہردے کے آنسوؤں سے گوندھا ہے!
پریم کا یہ ہار رادھا نے اپنے روپ کی اداسیوں سے گوندھا ہے!
سکھی، جا یہ ہار پریتم کو دے آ

(۷)

وہ دن دور نہیں !
جب رادھا کا تھکا ہوا جیون،
موت کے سپنوں کا ہار بن جائے گا !!
وہ دن دور نہیں !
جب رادھا کا بے آس من،
موت کے گالوں کا رس بن جائے گا !!
رادھا کہتی ہے "سکھی، میرے جیتے جی خوشیوں
کا چندرماں اب نہیں چمکے گا۔!!!

(۸)

پپیہے کا گیت،
رادھا کیوں سنے ؟
جس کا اپنا ہی گیت بن گیا ہوا پڑا ہے !!
کوئل کا گیت،
رادھا کیوں سنے ؟
جس کا اپنا ہی گیت مرجھایا ہوا پڑا ہے !!

(۹)

رادھا کی آنکھوں میں ایک سپنا آیا
جو رادھا کو رلاتا رہا اور ہنستا رہا
جیون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
اور کہا "دکھ کی ہنسی جب سپنا بن جاتی ہے تو
سدا ہنستی ہی رہتی ہے !!"

(۱۰)

سکھی،
آج رادھا کا من اداس ہے !!
چندرماں ! آج دھرتی پر وہ کرن پھینک جس میں
رادھا کی چتا کا سپنا ناچ رہا ہو !!
کام دیو ! آج رادھا کو اپنی ہنس مکھ بان سے تھوڑی
دیر کے لئے مار ڈال !!
سکھی،
آج رادھا کا من اداس ہے !!

عظیم قریشی

فکرِ اقبال

[مندرجہ بالا عنوان سے میں نے نظموں کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہر نظم میں فلسفے کے کسی خاص موضوع پر کسی مغربی شاعر اور علامہ اقبال کے نظریات کا مقابلہ کیا جائے گا جس سے میرا مقصد علامہ موصوف کے افکار کو واضح کرنا ہے۔ یہ نظمیں "ادبی دنیا" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی۔ ح۔ ط]

(۱)

"عزم للحیات"

شوپنہار

دنیا فریب و مکر و ریا، درد و رنج و غم! — حرص و ہوا و کشمکشِ "عزم للحیات"!
تسکینِ جاں ہیں فلسفہ و علم و شعر و فن — ممکن نہیں ہے آہ! مگر ان کو بھی ثبات
فطرت ہے طفل، اور جہاں بلبلوں کا کھیل! — کھلتا نہیں ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات
اندوہِ بے کراں سے عبارت ہے زندگی — شاید کہ بعدِ مرگ بشر کو ملے نجات

اقبال

اے "عزم للحیات" کے معنی سے بے خبر! — آ میں بتاؤں رازِ سراپردۂ حیات
افسانۂ زبونیٔ ہمت ہیں علم و فن — حاصل ہیں فلسفے کا پریشاں توہمات
تیغِ خودی سے جوہرِ ہستی کی ہے نمود — تیغِ خودی سے زندہ حقیقت ہے کائنات

اس تیغ میں ملے گی اماں تجھ کو بالیقیں　　کیوں ڈھونڈھتا ہے موت میں اپنے لئے نجات

(۲)

"عزم للقوت"

نطشہ

"عزم للقوت" میں ہے رازِ حیات　　"علم" میں ہے "عزم للقوت" کا راز
علمِ محسوسات ہے علمِ بشر　　رُوح ہے بیگانۂ سوز و گداز!

اقبال

"عزم للقوت" جسے کہتا ہے تُو　　"علم" سے محکم نہیں عرفاں سے ہے
انتہائے علم ہے علمِ نظر
رازیہ مجھ پر کھلا قرآں سے ہے

حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

جاپان کی موجودہ تعلیم پر ایک نظر

تعلیم دماغی اور جسمانی تربیت کا ایک سائینس ہے۔ اس لئے اس میں کچھ شک نہیں کہ کسی کی شخصیت کی تکمیل اور بلند حوصلگی اور اخلاقی جذبات اور خیالات کی تحصیل کے لئے درست تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ انفرادی زندگی کو بکار آمد بنانے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے۔ اس طرح قومی زندگی میں خوشحالی اور خوش نصیبی کی نشو و نما کرنے کے لئے یہ لازمی چیز ہے۔ خصوصاً ابتدائی تعلیم۔ یہ جس قدر ملک میں اندر و باہر پھیلتی جائے گی اور قومیت کے قوام کو درست کرنے والے جتنی اس کی اصلاح کرتے رہیں گے اسی قدر قوم میں بہبود کے آثار نظر آتے جائیں گے اور ملک اخلاقی اور اقتصادی ترقی کی معراج پر پہنچے گا۔

اس وقت میرا مقصد تعلیم پر بحث کرنا نہیں ہے۔ اور نہ اس مختصر مقالہ میں جاپان کی تعلیمی تاریخ بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس لئے عصر موجودہ کی جاپانی تعلیم پر ایک بالکل سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر جاؤں گا۔ اور تفصیل کے لئے کسی آئندہ فرصت کا انتظار کروں گا۔

تعلیم پر نظر ڈالنے سے پہلے موجودہ جاپان کی جغرافیائی حالت کا ایک خاکہ پیش کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ہمارا ملک جاپان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ جو برّاعظم ایشیا کے مشرق کی طرف بحرالکاہل میں شناوری کی مشق کر رہا ہے۔ اس کا رقبہ ٦٧٥١١٨٠٤٣ مربع کلومیٹر ہے۔ ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کے مطابق جاپان کی کل آبادی ٩٧٦٩٤٦٢٢٨ ہے۔ یعنی فی مربع کلومیٹر ۱۸۱ نفوس آباد ہیں۔ اس کا پایۂ تخت ٹوکیو ہے۔ جس کی آبادی ۵۸۷۵۳۲۸ ہے۔ شہر اوساکا دوسرے درجے پر ہے۔ اور اس کی آبادی ۲۹۸۹۸۶۶ ہے۔ علاوہ ان دونو شہروں کے یہاں دو اور ایسے شہر ہیں۔ جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور تیس ایسے شہر ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ سے دس لاکھ کے درمیان ہے۔ اور ۹۲ شہروں کی آبادی بیس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان شمار کی گئی ہے۔ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے۔ وہ جاپانی زبان ہے۔ یعنی جاپانی زبان ہی ہماری پیاری مادری زبان ہے۔ شاید یہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہ ہوگی کہ تعلیم یہاں اسی جاپانی زبان کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

جاپان میں موجودہ تعلیم کا آغاز ۱۸۶۸ء کے ریسٹوریشن کے بعد ہوتا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں اس تعلیم کے متعلق ضروری قوانین مرتب اور نافذ کئے گئے۔ ۸۰-۱۸۷۹ء میں ان قوانین پر تنقیدی نگاہیں ڈال کر ان میں اصلاحیں کی گئیں اور ۱۸۸۵ء میں جب کہ وای۔ موری وزیر تعلیمات مقرر ہوئے۔ تو موجودہ تعلیم کو ایک خاص معیار پر لانے کی کوشش شروع ہوئی یہاں تک کہ ۱۸۹۰ء میں آنجناب شہنشاہ میجی کی طرف سے ایک مشہور تعلیمی شاہی فرمان جاری ہوا۔ اس شاہی فرمان کو ہم جاپانی بحرِ ذخارِ علم و فن کا قطب نما خیال کرتے ہیں۔

جاپانی تعلیم کی چند خصوصیتیں ہیں۔ (۱) یہ تعلیم قومیات اور اخلاقیات کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ (۲) تعلیم اور مذہب کی جدائی یعنی مذہب کو تعلیم میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ (۳) یہاں ہر طبقہ کے لوگ۔ امیر ہوں یا غریب بلا امتیاز تعلیم حاصل کرنے کا مساوی حق رکھتے ہیں۔ برخلاف یورپ اور دوسرے ممالک کے جہاں اعلیٰ تعلیم زیادہ تر دولتمندوں ہی کو حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اس بلا تخصیص تعلیم نے درحقیقت تمام ملک کو حصولِ علم کے لئے تیار کر دیا ہے۔ اور غریب سے غریب جاپانی اپنی اولاد کو اسکولوں اور کالجوں میں بھیجنے کا شوقین نظر آتا ہے۔

عہدِ میجی سے پہلے یہاں عموماً تعلیم کا یہ دستور تھا کہ صرف استادوں کے گھر مکتب خانے تھے۔ جہاں علم کے شوقین جا کر لکھنا پڑھنا سیکھا کرتے تھے۔ لیکن ریسٹوریشن کے بعد جب نیا دور شروع ہوا تو تعلیم کا طرز بھی بدلا۔ یورپ اور امریکہ کا طریقِ تعلیم اختیار کیا گیا۔ عہدِ میجی کے ابتدائی زمانہ میں ہمارے مڈل اسکولوں میں جغرافیہ۔ ممالک غیر کی تاریخ۔ تحریرِ اقلیدس۔ جبر و مقابلہ وغیرہ وغیرہ کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی تھی۔ لیکن یہ بات اب مدت دراز سے بالکل بند ہو

گئی۔ اور موجودہ زمانہ کی تعلیم میں بالکل نہیں پائی جاتی۔

جاپان میں علاوہ پیرز اسکول اور فوجی اکادمیوں کے سب درس گاہیں گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کے ماتحت ہیں۔ ان درس گاہوں میں سے یونیورسٹیوں اور کالجوں اور ہائی اسکولوں کا تعلق براہ راست محکمۂ تعلیم کے ساتھ ہے یعنی قومی بیت المال ان درس گاہوں کے اخراجات کا کفیل ہے۔ مڈل اسکول صوبہ سے پرورش پاتے ہیں۔ اور پرائمری اسکولوں کا خرچ شہر یا گاؤں سے ملتا ہے۔ جہاں یہ موجود ہیں۔

جاپان میں چھ سال کی ابتدائی تعلیم قانوناً جبریہ ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں آدمی رہتے ہیں۔ خواہ پہاڑی علاقہ ہو خواہ چھوٹا سا جزیرہ بچوں کے لئے پرائمری اسکول موجود ہے۔ جہاں لڑکے لڑکیاں دونوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

پرائمری اسکولوں میں جونیئر کلاس اور سینیئر کلاس موجود ہیں۔ جونیئر کی چھ سال کی تعلیم قانوناً جبریہ مقرر کی گئی ہے۔ جو لوگ اپنے بچوں کے لئے مڈل اسکول کی تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے وہ انہیں سینیئر کلاس میں داخل کراتے ہیں۔ یہاں مدت تعلیم دو برس یا کبھی تین برس کی ہوتی ہے۔

پرائمری اسکولوں کی تعداد ۱۹۳۱ء میں ۲۵۶۶۵ اور ان کے استادوں اور استانیوں کی تعداد ۲۳۳۸۶۲ اور شاگردوں کی ۱۰۳۸۱۲۹۰ تھی۔

چونکہ ہمارے ملک کی آبادی برابر ترقی کر رہی ہے۔ اور ہر سال تقریباً دس لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ابتدائی مدارس کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہنا لازمی ہے۔

ہر بچہ سات برس کی عمر کا ہوتے ہی پرائمری اسکول میں داخل کیا جاتا ہے۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ یہاں شرح داخلہ فیصدی کس حد تک پہنچ چکی ہے:-

پرائمری اسکول جانے والے بچوں کی شرح داخلہ (فیصدی)

اوسط	لڑکی	لڑکے	
۹۹.۴۸	۹۹.۴۶	۹۹.۵۱	۱۹۲۹ء
۹۹.۵۱	۹۹.۵۰	۹۹.۵۲	۱۹۳۰ء
۹۹.۵۴	۹۹.۵۳	۹۹.۵۵	۱۹۳۱ء

ابتدائی تعلیم تو آج اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ ایسا جاپانی مشکل سے ملے گا۔ جو اپنی مادری زبان میں معمولی خط و کتابت نہ کر سکے یا اخبار وغیرہ نہ پڑھ سکے۔ یہاں مجھے جاپانی کتب خانوں اور اشاعت کتب و رسائل کے متعلق بھی کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اطلاعات کے مطابق جاپان میں ۴۶۰۹ کتب خانے موجود ہیں۔ جن میں کتابوں کی تعداد ۱۰۱۳۸۰۰۰ ہے۔ اور سال بھر میں ۲۴۹۸۰۰۰۰ آدمی ان کتب خانوں میں جاتے ہیں۔ پھر ۱۹۳۳ء کے آخر میں اخباروں کی تعداد ۱۱۸۶۰ تھی جن میں روزانہ اخباروں کی تعداد کل کے دسویں حصے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور عام کتابوں رسالوں کی تعداد اشاعت بھی ۱۹۳۳ء میں دنیا بھر میں تیسرے درجے پر تھی۔

پرائمری اسکولوں کے استادوں اور استانیوں کو تعلیم دینے کے لئے مردانہ اور زنانہ نورمل اسکولوں کی تعداد ۱۹۳۱ء میں ۱۰۴ تھی اور علاوہ ان کے یہاں دو مردانہ اور دو زنانہ ہائیر نورمل کالج ہیں۔

مردانہ اور زنانہ مڈل اسکولوں کی تعداد ۱۵۳۸ تھی۔ ان مڈل اسکولوں کی معلمی ان لوگوں کو دی جاتی ہے۔ جو ہائیر نورمل کالج یا دوسرے کالج اور یونیورسٹیوں کے فارغ التعلیم ہوں۔

چھ برس کی پرائمری تعلیم کے ختم ہونے پر لڑکے مڈل اسکول اور لڑکیاں زنانہ مڈل اسکولوں میں داخل ہوتی ہیں۔ مردانہ مڈل اسکول کی مدت تعلیم پانچ برس اور زنانہ مڈل اسکول کی چار سال یا پانچ سال کی ہوتی ہے۔ مڈل اسکولوں کو چھوڑنے کے بعد لڑکے یا تو ہائی اسکول چلے جاتے ہیں یا کسی تجارتی صنعتی یا زراعتی کالجوں کے داخلہ کا امتحان دیتے ہیں۔ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں مدت تعلیم تین سال کی ہوتی ہے۔ لیکن بعض کالجوں میں یہ کورس چار سال کا بھی ہوتا ہے۔ جو طالب علم ہائی اسکول کی عموماً تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ وہ یونیورسٹی کے داخلہ کا امتحان دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تعلیم کے مختلف شعبے موجود ہیں۔ مختلف نصاب تعلیم کی تکمیل کے لئے عام طور پر تین برس صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اور جو ڈاکٹری کی سند حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چار سال تک وہاں رہنا پڑتا ہے۔

لڑکوں میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو پرائمری اسکول کو چھوڑنے کے بعد تجارتی یا صنعتی یا زراعتی مڈل اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو عام طور پر چار پانچ سال تک رہنا پڑتا ہے۔

بعض لڑکیاں مڈل اسکولوں کو چھوڑنے کے بعد زنانہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں چلی جاتی ہیں۔ مندرجہ ذیل فہرست سے غالباً درسگاہوں اساتذہ اور طلبا کی تعداد معلوم ہو سکے گی۔

درسگاہوں کی فہرست ۱۹۳۱ء

	درسگاہیں	اُستاد	شاگرد یا طالب علم	فارغ التعلیم
پرائمری اسکول	۲۵۲۲۵	۲۲۳۸۶۲	۱۰۳۸۱۲۹۰	۱۹۴۱۶۸۵
زنانہ و مردانہ نورمل اسکول	۱۰۴	۲۵۲۵	۳۸۸۲۸	۱۱۰۳۳
مردانہ ہائیر نورمل کالج	۲	۱۸۸	۱۸۴۴	۴۰۲
زنانہ ہائیر نورمل کالج	۲	۱۱۱	۸۵۰	۲۰۳
مردانہ مڈل اسکول	۵۵۸	۱۳۸۰۲	۳۳۶۱۸۶	۵۹۱۵۷
زنانہ مڈل اسکول	۹۸۰	۱۵۲۵۷	۳۶۲۶۲۵	۸۸۳۴۵
ہائی اسکول	۳۲	۱۴۴۱	۲۰۸۴۴	۵۸۳۰
یونیورسٹی	۴۵	۵۹۸۴	۶۹۹۸۵	۲۰۱۸۲
مختلف کالج	۱۶۳	۷۱۲۷	۸۹۸۶۵	۲۳۱۵۱
تجارتی صنعتی زراعتی اسکول وغیرہ	۱۰۰۳	۱۵۲۱۳	۲۹۲۰۱۵	۷۲۳۱۶
تجارتی صنعتی زراعتی سپیشل اسکول	۱۵۰۸۳	۲۰۳۵۱	۱۲۷۱۹۷۱	۴۳۳۴۵۳
اندھوں کے مدرسے	۷۷	۶۲۵	۴۵۵۰	۱۰۲۹
بہروں گونگوں کے مدرسے	۵۹	۵۰۰	۴۱۴۴	۵۸۳
باقی مختلف درسگاہیں	۱۹۹۲	۱۶۷۹۵	۱۹۸۸۱۵	۱۶۷۱۹۹
میزان	۴۵۷۶۵	۳۳۳۷۷۹	۱۳۰۷۳۸۵۴	۲۸۲۴۵۶۸

علاوہ مندرجہ بالا مختلف اقسام کی درس گاہوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے کنڈر گارٹن موجود ہیں۔ محکمۂ تعلیم کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۳۱ء میں ۱۶۲۲ کنڈر گارٹن موجود تھے۔ جن کی استانیوں کی تعداد ۵۰۱۲ اور بچوں کی ۱۲۶۵۶۴ تھی۔

اب میں فیس کے متعلق کچھ بیان کروں گا۔ کنڈر گارٹن میں تقریباً تین این سے لے کر پانچ این ماہوار فیس ہے۔ چونکہ چھ سال کی پرائمری تعلیم قانوناً جبریہ ہے۔ اس لئے پرائمری اسکولوں میں کوئی فیس نہیں ہوتی۔ مڈل اسکولوں کے لئے تقریباً پانچ چھ این سے لے کر نو دس این ماہوار اور ہائی اسکولوں اور کالجوں کے لئے تقریباً اسی پچاسی این سالانہ اور یونیورسٹیوں میں تقریباً ایک سو این سے لے کر ایک سو پچاس این سالانہ تک فیس ہے۔

گورنمنٹ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیس اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیس میں کسی قدر فرق ہے۔ چونکہ پرائیویٹ درس گاہوں کے لئے عموماً گورنمنٹ کی طرف سے مالی امداد نہیں ملتی۔ اور ان کو فیس ہی پر اپنے مدرسوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ان کو فیس زیادہ لینی پڑتی ہے۔

مندرجہ بالا مختصر بیان سے ہمارے معزز دوستوں کی معلومات میں جو جاپان کے متعلق ہیں۔ اگر تھوڑا سا بھی اضافہ ہونے کا موقع ہوگا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

آخر میں جناب منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے حقیر مضمون کو اپنے قیمتی رسالہ میں جگہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

آر۔ گاموؔ (جاپانی) بمقام دہلی

قطعہ

مری جاں پر بنی ہے کاہشِ دردِ محبت سے — مرے اللہ دُہائی ہے مرے اللہ دہائی ہے
مجھے غم دے الم دے رنج دے دے سب زمانے کے — اٹھائے اٹھ نہیں سکتا کہ یہ رنج جدائی ہے

جلال الدین اکبر

بہار

پھر بہار آئی ہُوا تازہ فسونِ کائنات
ذرہ ذرہ ہے نمودِ ذوقِ تجدیدِ حیات

آسماں سے پھر نزولِ بارشِ انوار ہے
ایک عالم نغمہ ریز اور اک جہاں گلزار ہے

رقص سے زہرہ کے گونج اٹھا فرازِ کوہسار
پھر ہوا ہے حسنِ عالم سوز، ہمرنگِ بہار

پھر ہوئے روشن ستارے کرمکِ شبتاب سے
پھر نئے نغمے ہوئے پیدا نئے مضراب سے

پھر ہوئی رقصاں رگوں میں موجِ خونِ زندگی
چھا گئی ہے پھر فضا پر تازگی ہی تازگی

پھر جنوں نے کردئیے جیب و گریباں تار تار
ہے قیامت عالمِ جذبات کی رنگِ بہار

اٹھ رہے تھے ولولے نومیدیٔ جاوید سے
مرتعش تھا دل کسی موہوم سی امید سے
آتشِ تخئیل میرے قلب کو گرما گئی
برگ و گل بن کر مرے اجڑے چمن پر چھا گئی
لرزشیں پیدا ہوئیں میرے شکستہ ساز سے
نغمہ ہائے شوق جاگ اُٹھے مری آواز سے

حمید عرفانی ایم اے

جُھکی جھکی آنکھیں

عذراان عورتوں میں سے نہیں جن کی رگ رگ سے پیامِ زندگی چھلکتا ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جن کی رگ رگ میں پیامِ زندگی سُلگتا ہے۔ جن سے وصال میں بھی تکمیل حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے یا جنہیں میٹھا سا اضطراب پریشان کئے رکھتا ہے جو دلخراش حقائق سے دور دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے۔ مگر عذرا میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

عذرا کو بار بار دیکھ کر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ حساس سی ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران سی موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں اور گداز جسم۔ اس کی حیران سی خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوتِ تکلم کا بیشتر حصہ سلب کر چکی ہیں خدا جانے کونسی دنیا میں رہتی ہیں بہر صورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ اس کا خاوند اور ساس رہتے ہیں رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کمر کا وہ ہلکا سا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے بلکہ کسی وقت مجھے شبہ سا ہوتا ہے کہ یہی ہلکا سا خم اس کی جاذبیت کا راز ہے۔ جب کبھی عذرا کچھ بُن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف سا احساس ہوگا کہ بیشک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے۔ اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے لیکن اگر وہ آنکھیں اٹھا کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو . . . میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کرو گے۔ اس وقت مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عذرا مجھ سے کوسوں دور ہے اور یقین نہیں پڑتا کہ وہ ہے بھی یا نہیں یا زندگی حقیقت ہے یا محض خواب۔ اس وقت چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گھوم جاتی ہے یعنی میں پریشان سا ہو جاتا ہوں۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے۔ جب وہ یہیں سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر اُن دنوں اس کے انداز میں کچھ یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں تو اس کی نگاہ میں بچپنے ہی سے تھیں شاید اس لئے کہ بچپن سے ہی وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی۔ مگر شادی کے بعد اس کی نگاہیں اور بھی حیران ہوگئیں اور اب وہ حیرانیاں ترنم سے بھیگ چکی ہیں۔ اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اس کی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانکے رکھتی ہیں۔

اُن دنوں جب وہ سکول سے لوٹا کرتی تھی تو اس کے انداز میں ایک "بیگانہ روئی" سی پیدا کرنے کی کوشش عیاں ہوتی۔ مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چھلک ہی پڑتی۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹک جاتی یا اس کی آنکھ میں ایک ہلکا سا تبسم لہرا جاتا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اُسے زندگی میں دلچسپیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے انداز میں ایسی "بیگانہ روئی" پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی جو والدین کے نقطۂ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہئے۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداریاں دیکھنے کے کیوں متحمل نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے بچے ننھی کلیوں کی طرح سوئے ہی رہیں اور شاید اسی طرح سوئے سوئے ہی مرجھا جائیں اس لئے یا تو وہ اپنے بچوں میں بیداریاں نہ دیکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور یا بیداریاں پیدا ہونے ہی نہیں دیتے۔ عذرا کے والد موخرالذکر قسم کے آدمی تھے۔ گھر میں کھانے پینے کو بہت تھا اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ بیویوں کے متعلق وہ اپنے آپ کو بہت بدقسمت سمجھتے تھے۔ انہیں یہ گلہ تھا کہ ان کی بیویوں کو شادی کے بعد جلد ہی عام ہو جانے کی قبیح عادت ہے۔ اُن کی آرزو تھی کہ انہیں کوئی ایسی بیوی ملے جو گوناگوں ہو اور ان کا ایمان تھا کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں ایسی عورت موجود ہے اس لئے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کا عام ہو جانا اس کی بدمذاقی کی دلیل ہے۔ اس کے متعلق وہ اکثر سوچا کرتے تھے۔

"انجنیئر صاحب کی بیوی کو دیکھئے۔ اس کی آنکھوں میں بیسیوں نگاہیں ہیں۔ ایک سے ایک نئی۔ کبھی وہ اداسیوں میں تو کبھی سرخیوں میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کبھی "ہم تمہیں جانتے ہی نہیں" اور کبھی "اب کہئے مزاج کیسے ہیں" کی سی نگاہیں اور پھر ان کا نور رنگ بھی ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ کبھی گلابی اور کبھی گہری گہری، گدری گدری، میلی میلی۔ یہ جو پڑوس میں مسز ملک ہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں اُسے کس قدر ملکہ ہے۔ اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر خم و پیچ مضطرب رہتے ہیں۔ ایک وہ عذرا کی ماں کہ بیٹھ جاتی تو گھنٹوں اٹھنا محال ہو جاتا۔ بس دن بھر آلو ہی چھیلتی رہتی تھی اور پھر وہ زہرہ تھی کہ ایک مرتبہ ساڑی کے لئے بگڑ بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھی رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصے تک چہرے کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔"

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی۔ مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمۂ اجل ہو گئی۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ پیدا ہوا۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں۔ اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خود تو وہ عام طور پر باہر بیٹھک میں بیٹھے رہتے۔ جب کبھی وہ اندر آتے تو عذرا کو کوئی نہ کوئی نصیحت کرنے کے عادی تھے۔

"عذرا دوپٹہ سنبھالو ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا" یا
"حشمت! وہ گلی والی کھڑکی بند کر دو۔ عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں" یا
"عذرا تم مسز ملک کے ہاں زیادہ آیا جایا نہ کرو۔ لڑکیاں اپنے گھر میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔"

اور جواب میں عذرا نے کبھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا تھا۔ وہ خود بھی اس سے زیادہ بات چیت کرنے سے گھبراتے تھے۔ جوان بیٹی سے باپ کے لئے از حد مشکل ہو جاتا ہے۔ خدا جانے وہ عذرا سے ڈرتے تھے یا اپنے آپ سے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال ہی نہ آیا تھا اور نہ انہوں نے عذرا کو کبھی بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔ چونکہ دو بیویوں کے میاں رہنے کے باوجود وہ ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے اس لئے ان کے دوست انہیں زینتِ محفل سمجھتے تھے۔ باہر دیوانخانے میں اکثر جمگھٹا رہتا اور قہقہوں سے در و دیوار گونجتے رہتے۔

ایک روز صبح سویرے جب عذرا سکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنی محبوب نیلی ساڑی پہنے بال بنا رہی تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آ کر نہایت خشمگیں انداز سے کہنے لگے۔

"عذرا۔ آج سے تم سکول نہ جایا کرو۔ بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر ابا امتحان" عذرا نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ حیرانی اور خوف سے مدہم ہو رہا تھا۔

"مگر وگر کوئی نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "امتحان دینے کی کچھ ضرورت نہیں۔"

ایک ساعت کے لئے عذرا کی آنکھیں اٹھیں، شعلے کی طرح چمکیں، مگر اُس کے والد جا چکے تھے۔ حشمت نے اُن آنکھوں کو دیکھا اور اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھرتھرا رہا ہو۔ پھر وہ جھک گئیں دو موٹے موٹے آنسو اُس کے رخساروں سے ڈھلک کر اس کی ساڑی میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہو گئیں۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہو گئیں۔ اس دن سے عذرا کو ٹھٹھکتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا اور "راستے بیگانہ نہ رہے" پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی۔ شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے کھوئی ہوئی سی کھڑی رہتی۔ حتیٰ کہ چند ہی دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذیر سے نکاح پڑھوا کر اُسے رخصت کر دیا۔ غالباً اس لئے کہ عذرا کی بیداریوں کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا کہ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان چند ایک ساعت کے لئے ان خاموش مہیب چٹانوں میں اُبھر اُبھر کر ان خاموشیوں کے مسکن کو اور بھی خاموش اور بھیانک تر چھوڑ جاتی ہے۔

اس جھٹ پٹ پر خلقِ خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونے ہی تھے چہ میگوئیاں ہوئیں دبی دبی آوازیں اٹھیں۔ مگر آوازہ کسنے کی نوبت نہ پہنچی ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرحدار نہیں سمجھی جاتی تھی کہ محلے والیاں اس سے کینہ توزی کرتیں۔ دوسرے انہیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشر کرتیں۔ بلکہ وہ تو اُن کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان نگاہوں کی قدردان تھیں۔ چند ایک مثلاً انجنیئر کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آوازہ

کسنے ہیں بلکہ تھا ان کو تو یہ گلہ تھا کہ نہ ڈھول ڈھمکا نہ چھم چھم نہ تاک نہ جھانک، نہ تو تو میں میں۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی۔ کئی ایک کو تو مدت سے عذرا کی شادی کی تقریب سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو "میل" بن کر جائیں، حنا مالیدہ ہاتھ ہوں، جھلملاتی ہوئی ساڑیاں ہوں، کاجل رسیں، بندیاں چمکیں، پلیٹوں سے چوڑیاں بجیں، پان بنائے جائیں اور اس افراتفری میں اچانک کوئی آنکلے تو گھونگٹ نکالنا تو کیا دوپٹہ سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ کوئی گستاخ لٹ جھٹک کر منہ پر آگرے اور ناک میں دم کر دے یا پتلی پتلی، گوری گوری حنائی انگلیاں دوپٹے کو سنبھالنے کی ناکام جستجو میں عریاں رہ جائیں۔ باریک تہوں سے نظریں چھن چھن کر پڑیں۔ سفید سفید باہیں گھونگٹ سے نکل کر کچھ دیں کچھ لیں یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو۔

مگر کچھ نہ پوچھئے۔ آخر خلق خدا خلق ہی ہے اور بات بات ہی ہے۔ سو نکل ہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا "کسی سے آنکھ لڑ گئی ہوگی"۔ کوئی کہنے لگی "لو اب تو ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی"۔ کوئی کہنے لگی "سنا ہے اس کے ابا نے خط پکڑ لیا"۔ کوئی بولی "ا بوبی بی وہ تو اس کے ابا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ دفتر سے آرہے تھے۔ باغ میں وہ اسے پہلو میں لئے بیٹھا تھا۔ توبہ کیسا زمانہ آیا ہے۔ غرضکہ کئی باتیں نکلیں۔ بلکہ کونسی بات تھی جو رہ گئی۔ مگر دبی دبی باتیں ہوئیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ لوگوں کے لئے تو بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر شاید عذرا کے لئے بات ہی بات رہ گئی اور وہ خود آئی گئی ہو گئی۔

اُس بے چاری کا صرف یہی قصور تھا کہ وہ سکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے ہوئے بیٹھی رہتی کہ مرمریں بُت کا شبہ ہوتا۔ اگر کسی شوخ چشم کے دل میں اُس بت کو دیکھ کر ایک سویا ہوا مصور بیدار ہو جائے اور اُسے اُس بُت میں محو کر دے . . . اس مصور کے پریشان کن غور و خوض کو بس نس میں محسوس کر کے عذرا کی پلکیں اٹھیں وہ موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں نظر بھر کر دیکھ لیں . . . مصور کی نگاہ کسی کی رگ رگ میں ایک بیجاری جاگ اُٹھے تو عذرا کا اس میں کیا قصور؟ وہاں سکول کی ویران سی سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔

پوری تفصیلات سے تو مجھے واقفیت نہیں۔ ہاں سلیم کا اونچا لمبا قد اور فراخ شانے اور اس کا اندازِ بے نیازی اس امر کا شاہد ہے کہ اُسے تانک جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا عادی ہے۔ غرضکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے تصور میں اوندھے پڑے رہنے، آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشتاق ہیں۔ چند دن تو صبح ۶ بجے وہ روز اُس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا۔ پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا سکول کے پھاٹک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ رہی تھی تو سلیم آکر اُس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر اُسے ایک طرف لے گیا اور اُسے شانوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو؟" "تمہارا کیا نام ہے؟" . . . "تم بولتی کیوں نہیں" . . . "اچھا" اُس نے عذرا سے جھنجھوڑ کر کہا "تم چاہے کوئی بھی ہو۔ تم میری ہو اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا"۔ اور پیشتر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے یا اُسے کیا کرنا چاہئے۔ سلیم جا چکا تھا۔ پھر اُسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے آنے کے لئے کیا عذر پیش کیا تھا یا کس راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھاٹک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا ٹھہرنا پڑا بھی تھا یا نہیں۔ اُس روز اُس کی آنکھیں تبسم سے آشنا ہوئی تھیں اور اُس کی چال نے ٹھمکنا سیکھا تھا۔ اُسے اُس واقعے کی حقیقت پر اعتبار نہیں آتا تھا مگر اُس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے، اور اُس کے شانوں پر ایک لذیذ سا درد ہو رہا تھا۔

وہ اُس روز اپنے سفید طوطے سولی سے کہہ رہی تھی "سولی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا کوئی بھی" وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ پھر اُس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اُسے گدگدا دیا۔ وہ ہنس پڑی "کیوں سولی ہے نا"

اُس کے بعد اُن کی دو چار سرسری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور دو چار خطوط آئے گئے ہوں گے اور بس سلیم ہمیشہ کے لئے اس کے لئے چند ایک دھندلے دھندلے نقوش چند ایک دل کی پرکیف دھڑکنیں اور ہاتھوں شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور دل اور سینے کی چند مبہم سی تھرتھریوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا جس قدر یہ نقوش منتشر اور موہوم سے تھے۔ شاید اُس کے دل میں اُن کے متعلق حسیات اُسی قدر گہری اور مضبوط تھیں۔

گاڑی میں عذرا اپنی ساس کے ہمراہ ایک درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی وہ جا رہے تھے۔ مگر اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ وہ کہتی تھی کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ جیسے قدرت اُسے چھیڑنے کے لئے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ایسی بات کیسے ممکن تھی۔

باہر کھیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پھیکا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چبھتا تھا۔ ان کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے ہیبت ناک دیو نما کھمبے گرد سے اٹے ہوئے کسانوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھنگنوں میں کوئی "گلیور" آن کھڑا ہو۔ سورج جھک جھک کر تھک چکا تھا اور اُس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں۔ دور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا اُن جھلسے ہوئے میدانوں کے تسلسل میں، ایک دھندلے خواب کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اُس ٹیلے پر سلیم کھڑا اُسے بلا رہا تھا یا اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ دور سڑک پر جو لاری جا رہی ہے اس میں سلیم بیٹھا ہے۔ پھر اُس کے شانے کوئی نامعلوم گرفت محسوس کرتے اور وہ سنتی "تم میری ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا" اور وہ ٹھٹھک کر بیدار ہو جاتی اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سوتی اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں۔ مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف تھی۔ ماں کی آنکھوں میں تجسس اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپا نہ سکتی تھیں۔ اُس کے برعکس سوتی کی آنکھیں پرنم سی معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دل کی کیفیت سے واقف تھے۔ مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "سوتی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے" اُس وقت غالباً پہلی مرتبہ اُس کے دل میں سوتی کو آزاد کرنے کی خواہش محسوس ہوئی۔ ہاں۔ خدا جانے کتنی بہاریں اُس نے اِس پنجرے میں گزاری ہیں۔ کیا اُس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے؟ کیا اُس کے دل میں بھی کسی زمانے کی یاد اٹھتی ہے" پھر اُس نے سُنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ماں پوچھ رہی تھی۔ "بیٹی عذرا۔ نذر پوچھتا ہے کچھ پیو گی؟ . . . دیکھو نا کس قدر گرمی ہے"! . . . "تمہیں ضرور پیاس لگی ہوگی کیوں بیٹی؟" اُس کی آواز میں منت تھی۔ عذرا نے کنکھیوں سے دیکھا۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔ اُسے کنکھیوں سے بھی اُدھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر اُس نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے اُس کے شانوں سے پکڑ کر اُس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا . . .

اس نے یوں محسوس کیا جیسے میلوں سے کوئی کہہ رہا ہو۔ "نہیں اماں تم کہو تو۔ دیکھو کس قدر گرمی ہے"! اُس بھدی سی آواز میں کس قدر اُداسی تھی۔ ہاں اگر سلیم اس سے پوچھتا۔ اگر وہ سلیم کے گھر جا رہی ہوتی۔ مگر سلیم سلیم خدا جانے کہاں ہوگا۔ خدا جانے اُسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں۔ شاید وہ اپنی بیچاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو۔ شاید ان رنگین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کٹی۔ مگر اُس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ "نہیں نہیں یہ الزام ہے سلیم ایسا نہیں" پھر دو اُداسیوں بھری تبسم آنکھیں اُس کے سامنے معلق ہو جاتیں۔ نہیں وہ آنکھیں مذاق نہیں کر سکتیں۔ شفقت سے لبریز ہیں۔ اُس کے دل میں یقین سا ہو جاتا۔ "وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ دنیا کا ذرہ ذرہ چھان مارے گا۔ شاید وہ اسی گاڑی میں ہو" . . . "یہ کہیں وہ بیمار نہ ہو"۔ وہ ایک جھرجھری سی محسوس کرتی "نہیں وہ بیمار نہیں۔ بس نہیں"۔ عذرا اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹیک دیتی اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ چوکھٹ نہیں۔ وہ سلیم کے شانے ہیں۔ وہ سمٹ کر اُن شانوں پر جھک جاتی "چاہے کچھ بھی ہو اب مجھ کو تم سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا . . . کوئی بھی نہیں"!

اُس کی ساس نے اُسے کمرے میں ایک وسیع پلنگ پر بٹھا دیا۔ کمرے میں دھندلی سی روشنی تھی۔ تمام مکان سنسان سا محسوس ہوتا تھا۔ دو چار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں۔ مگر چند منٹ ٹھہر کر چلی گئیں۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ اس رات لیمپ اس قدر روشن نہیں معلوم ہوتے تھے، اور اندھیرا تھا۔ مگر اُس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سلیم کھڑا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے وہ سلیم کے انتظار میں بیٹھی ہو۔

دور ہوا درختوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک اُداس سا کالا درخت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا۔ لیمپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا۔

اُس کے چہرے پر پریشانی کی گھوریاں تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ سلیم کی آواز ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیسا حسین خواب تھا۔ اُس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اُس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بند ہونے کے علاوہ اُس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ یک لخت باہر سڑک پر کسی تانگے والے کی "پہاڑی" کی تان اُس کے کان میں پڑی تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لئے پہاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اس کے سامنے سکول والی سڑک لہرا گئی۔ جب وہ آزاد تھی۔ جب وہ تانگے پر آیا جایا کرتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اُس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی۔ سلیم کی پہلی ٹکٹکی . . .

اس کے بند بند میں ایک نامعلوم سا درد ہو رہا تھا۔ سوَلی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ بے چارہ سوَلی بھی اس چار دیواری میں قید محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سویا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے ایک ٹوٹے ہوئے سٹول پر ٹیک رکھے تھے اس کا منہ عذرا کی طرف مڑا ہوا تھا جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک تبسم سا تھا جیسے کوئی خواب میں اُسے گدگدا رہا ہو۔ باہر فضا میں دھیمی اور روپہلی سی روشنی پھیل رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی۔ عذرا سمٹ کر چارپائی کے کونے پر ہو بیٹھی۔ "نذر! نذر!" نذر کی ماں بلا رہی تھی۔ نذر لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک اضطراب سا چھا گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں عذرا پر آن جمیں۔ پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے۔ "آیا ماں" کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر کسی کو عذرا کو دیکھنے کا شوق تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کے لئے جوانی کے دن چند ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے۔ عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ مگر کوئی دبی ہوئی آہ اس مسکراہٹ کو اُداس بنا دیتی۔ وہ شوق سے آتی مگر کھوئے ہوئے انداز سے لوٹتی جس طرح کوئی اپنے گزشتہ زندگی کے کسی رنگین واقعے کو یاد کرکے اپنی کھوئی ہوئی جوانیوں پر ایک کسک سی محسوس کرتا ہو اور اپنے گرد ایک اُداس اور لٹی ہوئی دنیا دیکھتا ہو۔ دو ایک جوانیوں سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں چھلکتی ہوئیں، بھٹکتی ہوئیں، مسکراتی ہوئیں۔ "سم جاتے ہیں" کی سی مسکراہٹیں بس یہ ظاہر داری رہنے دو" . . . ابھی تو اس نگری کی دہلیز پر بیٹھی ہو" کی سی نگاہیں اچھالتی ہوئیں۔ بنتی سنورتی ٹہلتی ہوئیں۔ مگر عذرا اپنی نگری میں گم صم تھی۔ جب کوئی نووارد اس کا منہ دیکھنے کے لئے اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی۔ پھر اُسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھتا۔ کبھی کبھار سوَلی کی چیخ اُسے اپنی لٹی ہوئی خوابوں سے بیدار کر دیتی اور اُسے احساس ہوتا کہ وہاں صرف سوَلی ہی ایک ایسا متنفس ہے جو اس کے دل کی کیفیتوں سے واقف ہے۔

سوَلی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اُسے از سر نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پر پھڑپھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کرکے بار بار چیختا۔

شام کے وقت نذر نے سوَلی کا پنجرا عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سوَلی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا۔ اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا۔ عذرا نے سوَلی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ میں ایک ہلکی سی چمک آگئی۔ صرف سوَلی ہی اس کا راز داں تھا جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی۔

نذر عذرا کے پاس آ بیٹھا اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی۔ "تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ عذرا! کچھ تو کھاؤ۔ اماں نے تمہاری اتنی منتیں کی ہیں"۔ اُس نے دھیمی سی منت بھری آواز میں کہا۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ عذرا . . . اور تم اس کی ملکہ ہو۔ اس کا حلق جذبات کی بھیڑ سے رک رہا تھا۔ اُس نے اپنے بھدے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "عذرا! عذرا تم چپ کیوں ہو؟" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی زبان کہنے والی زبان نہ تھی۔ مگر اس کا ہاتھ ایک خاموش اور مدھم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ بھدا سا گرم ہاتھ اس کی قوت گویائی سے زیادہ متکلم تھا۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے ذرے ذرے سے سنا اور اس کی تمام قوت شل ہوگئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کی مرضی کے خلاف اسے اپنا آپ حوالے کر دینے پر مجبور کر رہی تھی کوئی نامعلوم دلفریب لوری اس کے جسم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ اس کی نس نس میں ڈوب جانے کی خواہش

لہرا رہی تھی۔ صرف دماغ کا کوئی نحیف سا حصہ جسم کی اس غداری اور اپنی بے بسی پر پیچ و خم کھا رہا تھا جس طرح ڈراونا خواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھنا چاہتا ہے مگر جاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح عذرا بت سی بنی بیٹھی تھی۔ اس میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی قدرت نہ تھی۔ اس نے ایک مخمور وضاحت میں نذر کا ہاتھ دیکھا۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم سا تھا۔ ہاں سلیم کا ہاتھ شوخ تھا۔ بلا کا شوخ . . . اس کے دل میں خواہ مخواہ یہ آرزو پیدا ہوگئی کہ وہ بھدا ہاتھ متحرک ہوجائے۔ اس میں آرزو بھڑک اٹھی کہ اس کی اپنی تمام قوت، شوخی، زندگی اس گھڑی کے لئے اس بڑے بھدے سے ہاتھ اور ان مضبوط باہوں میں منتقل ہو جائے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ اس بھدے ہاتھ کے لئے منتظر تھا۔ بے تاب تھا اور وہ اپنی اس خواہش پر شرم سی محسوس کر رہی تھی اور پریشان سی تھی مگر وہ احساس شرم اور پریشانی کسی نقار خانے میں طوطی تھے . . . عذرا اپنا آپ سنبھال نہیں سکتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا ہو۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آکھڑا ہوا . . . "تم ہو سلیم! . . . مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کرسکتا۔" اس کے شانے جھک گئے۔ اس کا سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا۔ سلیم کی دو مضبوط باہیں اس کے گرد آپڑیں . . . وہ سلیم کے پاس تھی۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کے والد نذر کے لئے ایک معمولی سا مکان اور چند واجب الادا رقمیں چھوڑ مرے تھے۔ وہ عذرا کے بہت گہرے دوست تھے۔ نذر نے کچھ عرصہ پہلے کہیں اتفاقاً عذرا کو دیکھ لیا تھا اور عذرا کی نیچی نگاہوں اور اس کی الٹی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنی خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازہ ہستی پریشان کرنا ہے۔ ایک مرحوم دوست کے قلاش لڑکے کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ جب اس نے اپنی ماں سے سنا کہ عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو اسے یقین نہ پڑتا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ اٹھے گا اور اسے احساس ہوگا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدہوش کن خوابیں ان لاتعداد فائلوں کے سامنے کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ مگر خدا جانے یہ بھی فطرت کی ایک ستم ظریفی تھی کہ عذرا اب صریحاً اس کی تھی۔ نذر کے لئے عذرا کی آمد مسرت کی ایسی لہر تھی جو ہر غیر متوقع خوشی کی ہم رکاب ہوتی ہے۔

اس کی خواہشات میں جو صرف زندگی تک محدود تھیں۔ ساڑیاں جھلملانے لگیں۔ پھول مہک اٹھے اور طلائی چوڑیوں کی جھنکاریں نغمہ زن ہوگئیں۔ . . . عذرا کے لئے ایک حسین نازک سی چپلی ہو۔ عذرا کے لئے ایک قد آدم آئینہ ہو . . . عذرا کے لئے شربتی ریشم ہو۔ عذرا کے لئے . . . " عذرا اس کی خواہشات میں بھنور بن کر آئی تھی۔

اس نے ایک چھوٹا سا پرانا ٹائپ خرید لیا: تاکہ فرصت کے وقت ٹائپ کرکے اپنی آمدنی بڑھائے۔ یہ سب کچھ اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے اور اس کی خاموشی ایک حسرت بھری تشویش ہے۔

عذرا کو پہلی مرتبہ نیلی ساڑی میں دیکھ کر نذر کی آنکھوں میں ایک مخمور چمک سی آگئی۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کے تبسم کو محسوس کیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے غسل خانے میں یا کسی اور جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر وہ نذر کی جرابوں پر آن ٹھہریں۔ "بیٹا یہ جرابیں مجھے دے دو۔ اس نے کہا وہ دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں۔ لاؤ میں انہیں دھو دوں۔"

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں۔ ابھی پرسوں ہی تو پہنی تھیں۔" "نہیں بیٹا نہیں" ماں نے اصرار سے کہا "کیا حرج ہے۔" جرابیں لے کر ماں چلی گئی کچھ دور تک نذر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر عذرا کی طرف مڑ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عذرا یہ نیلی ساڑھی تو تمہیں بہت زیب دیتی ہے۔ میری طرف دیکھو نا۔ عذرا!"

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا منہ اپنی طرف پھیر دیا۔ عذرا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ "ہاں" اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ ان کو بھی یہ نیلی ساڑھی بہت پسند تھی۔ اس روز پارک میں کس شوق سے دیکھتے رہے تھے۔ کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں۔ کس قدر پیاری آواز تھی۔ عذرا تمہیں نیلی ساڑھی کیسی زیب دیتی ہے اور کس پیار سے اور منت سے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ عذرا وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ یہ نیلی ساڑھی پہنا کروگی۔ میرے لئے ہی۔ میری خوشی کے لئے۔ زندگی کے لئے اور وعدہ لے کر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ کس دیوانگی سے جھومے تھے . . .

اس نے اپنے ہاتھ پر دباؤ سا محسوس کیا۔ سوئی کی چبھن نے اسے

بیدار کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سوتی کے پنجرے کے قریب جا بیٹھی۔ وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی۔ "تم میرے ہو نا سولی"؟ وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سولی ہی ایک ایسی ہستی ہے جس سے بات کرنے کے لئے اس کو بولنے کی ضرورت نہیں۔

"انہیں نیلی پسند تھی نا سولی؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے۔ تم اس نیلی کو جانتے ہو نا!۔ اس میں ان کے ہاتھوں کی بو ہے۔ اُن کے پیار کی سلوٹیں ہیں۔

اُن پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لئے توڑ کر لایا کرتے تھے۔

اس نیلی کے ڈھیلے تاروں سے اُن کی نگاہیں گزرنے کی کوشش کیا کرتیں۔ کیوں سولی۔ تم جانتے ہو نا؟ . . . مگر تم نہیں جانتے تم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم صرف سمجھتے ہو۔ تم انہیں جانتے تو سمجھتے کہ نگاہیں کس طرح آغوش میں اٹھا لیتی ہیں . . . نگاہیں کتنی دور دیکھ سکتی ہیں۔

. . . یہ نیلی اُن کی نگاہوں میں حائل نہیں ہو سکتی تھی . . . اور سولی ان کے بجلے ہاتھ بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھیڑ دینے والی شوخ باہیں . . . اس کے کندھوں کے گذشتہ دباؤ تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی نیم وا آنکھوں نے اُس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے جھٹک دیا . . . وہ اپنے دل کی دنیا میں تھی۔

یوں ہی دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔ مہینے گزر گئے۔

یوں تو رہنے کو عذرا اُس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چار دیواری قید نہ کر سکی۔ یا شاید اُس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ آنکھیں دوربین ہو گئیں۔ وہ اپنے دل کی دنیا ان نیچی نگاہوں کی جھکی ہوئی مژگاں پر اٹھائے پھرتی اور شاید جھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ہی اُن نگاہوں نے نذر کی دنیا بدل ڈالی۔ گو نذر اُن کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا مگر کبھی کبھی اُن نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اُسے ایک ڈر سا محسوس ہوتا۔ مگر شاید وہ ہلکا سا ڈر اُن نگاہوں کو نذر کے لئے اور بھی جاذب بنا رہا تھا۔ عذرا جب کبھی اپنی دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ کالی کالی حیران آنکھوں کو ایک حیا بھرے تبسم سے نیچے جھکا لیتی۔ وہ ایک تبسم نذر کے لئے پیامِ حیات بن جاتا۔ اس کی نس نس میں محبت کا راگ گونج جاتا۔ وہ اُس حیا سے لبریز تبسم کے لئے اپنی زندگی اپنا آپ سبھی کچھ دے دینے کے لئے تیار تھا۔ پھر اس کی نظر نیلی ساڑھی پر جا پڑتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہننے کے ناقابل ہو رہی تھی۔ اُس میں وہ چمک نہ رہی تھی۔ وہ سوچتا دیکھو یہ کتنی جگہ سے پھٹ رہی ہے، بوسیدہ ہو چکی ہے، چمک نہیں، پھر بھی عذرا اُسے میرے لئے پہنے پھرتی ہے۔ اس لئے کہ میں اُسے نیلی ساڑھی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ صرف میری خوشی کے لئے۔ حالانکہ اُس کے پاس وہ سرخ ساڑھی بھی تو ہے۔ بلکہ وہ سرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ۔ عورت کو خاوند کی خوشی زیبائش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

. . . ہندوستانی عورتیں . . . وفا کی ننھی دیویاں . . .

اور اس کی جھکی جھکی آنکھیں کس قدر حیا سے لبریز ہیں۔ پیاری پیاری کالی کالی آنکھیں . . . دھیمی میٹھی سی نگاہیں۔ خوابیدہ سا انداز . . . کبھی میری طرف بھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا . . . پڑھی لکھی ہونے کے باوجود دنیا کی نام کو نہیں۔ کوئی زیبائش کوئی انداز نہیں . . . لٹک نہیں۔ مٹک نہیں . . . اور نیلی ساڑھی تو اُسے بہت ہی بھلی لگتی ہے۔

"مگر یہ ساڑھی تو بس اب پہننے کے قابل نہیں۔ گو ندارام کہہ رہا تھا۔ ایسی ساڑھی چالیس روپے کو ملے گی۔ چالیس روپے!! ساڑھیاں بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں . . ." اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ کے سامنے جا بیٹھتا۔ اُس کے صبح و شام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا، جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا۔ عذرا دیکھے گی۔ خوشی بھری، تعجب بھری، محبت بھری نگاہ، اُس لمحہ بھر کی نگاہ حاصل کرنے کے لئے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لئے تیار تھا۔

عذرا اُس کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا۔ بلکہ وہ نذر کی وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ تھی۔ وہ اس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی۔ صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی۔ باقی خط و خال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی۔ شاید اس لئے کہ نذر کی پیشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے، کوسوں۔ دن بھر وہ سولی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے پاس

پہنچنے کے لئے اُسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب عذرا اماں کے پاس بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ کوئی اجنبی عورت آکر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اماں جب اندر نماز پڑھنے کے لئے گئی تو اس عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں ایک لپٹا ہوا کاغذ کا گولا سا رکھ دیا اور اس کی مٹھی بند کر دی اُس نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "یہ انہوں نے دیا ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں"

پہلے تو عذرا حیرانی سے اُس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے لفافے کو غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی۔ اُس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر سا پیدا ہو گیا۔ مگر وہ عورت جا چکی تھی۔

غالبًا وہ اپنے خیالی سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی، اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھو چکی تھی کہ اُسے کسی جیتے جاگتے سلیم کا انتظار تک نہ رہا تھا۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا۔ شاید اگر سلیم بذاتِ خود اس وقت اُس کے سامنے آ موجود ہوتا تو اُسے بیگانہ سا محسوس ہوتا یا شاید اُسے سلیم پر کوئی توقع نہ رہی تھی۔ بہر صورت اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لفافہ کس کا تھا۔ بلکہ اُس کے دل میں اُس لفافے کو کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور وہ سخت پریشانی سی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ اٹھ بیٹھی اور اندر چلی گئی۔ پھر باورچی خانے میں گئی صحن میں آئی . . . . اُسے پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لئے یہاں وہاں گھوم رہی ہے جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر، کسی نامعلوم آنے والے ڈر کو محسوس کرتے ہوئے پرندے ان کالی کالی اُداس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔

وہ اپنی مٹھی میں اُس کاغذ کے گولے کو بھینچ بھینچ کر محسوس کر رہی تھی۔ اسے دبا رہی تھی مسل رہی تھی۔ شاید وہ اپنے موہوم خوف کے احساس کے جواز میں اسے بھینچ رہی تھی یا شاید اُس کی یہ خواہش تھی کہ اس کو بھینچ بھینچ کر نابید کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کر لے . . . . اس کا سر گھوم رہا تھا . . . اُس نے اپنے آپ کو اپنے ٹرنک کے سامنے بیٹھے ہوئے پایا۔ ٹرنک کھلا تھا۔ وہ لپٹا ہوا لفافہ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اُس نے کھوئے ہوئے انداز سے اُسے پھاڑ کر کھولا . . . اس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھسل رہی تھیں۔ جیسے کہ وہ مضمون کو دل سے سمجھنا نہ چاہتی ہو جیسے کہ وہ اس مضمون کو سمجھنے سے ڈرتی ہو اور اس مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو۔ اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اس کو ساتھ لے جانے پر مُصر ہیں اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو۔ "بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا" وہ بھاگتی بھاگتی پھر رہی تھی۔ مگر خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا اور بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا اُس پر غلبہ پا رہا تھا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اس کے سامنے ناچ گئی . . . جانا! چلے جانا! . . . اس کا دل کانپ اٹھا . . . اُس کے دماغ میں ایک خلا سا کھل پڑا۔ اُس کے ماحول میں کوئی مفہوم نہ رہا . . . اس وقت کائنات اس کے لئے ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس رات سلیم کی بجائے کوئی اور کئی خوفناک شکلیں اُس کی خوابوں میں گھس آئی تھیں۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی شکلیں ڈراونی۔ نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا۔ "کیا ہے عذرا؟" اُس کا چہرہ بگڑا اور خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ "آج تمہیں کیا ہے۔ تم بیمار تو نہیں"۔ عذرا کو ایسا محسوس ہوا جیسے میلوں دور کوئی کچھ کہہ رہا ہو۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی۔ "... ہاں وہ عورت . . . آئی تھی۔ دوپہر کو . . . اس نے وہ خط . . . اُن کا خط . . . سلیم کا . . . وہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں"۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ نذر کس سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ عذرا نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کا سر کسی کے شانوں پر جا ٹکا۔ آج پہلے دن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا۔ مگر وہ سر نذر کے شانوں پر بھی نہ تھا۔ خدا جانے تکیے پر تھا یا پتھر پر . . . مگر نذر کے شانوں پر عذرا کا سر تھا اور عذرا کے بالوں کی دھیمی دھیمی خوشبو نذر کو اور بھی فکر مند اور پریشان کر رہی تھی۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی

خواہشات ایک دوسری سے جھگڑ رہی تھی۔ ایک حصہ سوتی کی شکل میں کہہ رہا تھا تم ان کی ہو عذرا اور اب اُن سے تم کو کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ ایک فراخ پیشانی اور سفید سفید دانت کہہ رہے تھے۔ عذرا تم ہمارا تو نہیں۔ تمہیں کیا ہے عذرا" دو بھدے بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے، "تم آنکھیں جھکا لو عذرا تمہاری دنیا تو ہمارے پاس ہے"۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ "ڈراونی ہنسی۔ پیاری ہنسی ۔ ۔ ۔"

شام کو وہ سوتی سے کہہ رہی تھی۔ سوتی تم اکیلے رہ سکو گے؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کیا کرو گے؟ تجھے بُرا تو نہیں لگے گا سوتی؟ کیا سوتی میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟ وہ آج رات کو دو بجے شیشم کے درخت کے نیچے آئیں گے۔ وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر سامنے دکھائی دیتا ہے۔ کیوں سوتی میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟ دنیا کیا کہے گی؟ اباجان کیا کہیں گے؟ سوتی! تو تم جانتے ہونا! تم تو سمجھتے ہونا!"

شام کو اس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل سا بنا لیا اور اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس کا دل ہلکا سا درد محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ جلدی اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ اس روز وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے سے ڈر رہی تھی۔ اُس نے ایک پرانا رسالہ اٹھا لیا۔ اس نے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ اس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر گھوم جاتے ۔ ۔ ۔ اس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی اُس روز اس کی قوت سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی۔ اس نے نذر کو ماں کے کمرے میں جاتے ہوئے سنا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے ایک بوڑھا شیشم کا درخت تھا۔ سلیم آج وہاں آنے والا تھا۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کی نظر بار بار کھڑکی کے باہر درخت پر جا جمتی۔ کھڑکی اس وقت بند تھی۔ مگر شیشے میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ باہر سڑک پر کبھی کبھی کوئی راہ گیر گذرتا تو اس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ شیشم کا درخت متانت سے کھڑا تھا۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ درخت اس کے ہر راز سے واقف ہو۔ صحن والی کھڑکی میں سوتی کا پنجرا تھا۔ سوتی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سوتی تمام دنیا سے بیزار ہو چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا لپک کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے پارسل اٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے۔ دروازے کے قریب جا کر اُس نے سنا۔ ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

"تم نے تو اپنا ناس کر لیا ہے۔ صبح وشام کام۔ دن رات کام۔ ہر وقت کی ٹک ٹک ۔ ۔ ۔ ایک ساڑھی کے لئے اپنا آپ حلال کر دیا"۔

"نہیں اماں یہ نہ کہو" نذر بار بار کھانس رہا تھا۔ جب سے وہ آئی ہے۔ ہم نے اس کو دیا ہی کیا ہے۔ مگر اماں وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا۔ میں اُسے دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تنخواہ میں بمشکل گذارہ ہوتا ہے"۔ "مگر بیٹا اُس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں۔ وہ کیوں نہیں پہن لیتی۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لئے کیوں اس قدر بے تاب ہے۔ میں تو نہیں سمجھتی ۔ ۔ ۔ ہمارے زمانے میں ۔ ۔ ۔" "اماں تم بھولتی ہو۔ اُس نے تو مجھے نہیں کہا ۔ ۔ ۔ مگر یہ تو معمولی بخار ہے۔ تم فکر نہ کرو"۔

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔ اسے بہت بخار تھا۔ عذرا کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کسی گہری دبی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ کسی چھپے ہوئے ہنگامے کا حال کہہ رہے تھے۔ "تم سو جاؤ عذرا" نذر نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "تم کیوں میرے لئے بے آرام ہو۔ میرا فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ وہ بخار کی شدت میں وہ وہ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہا تھا جو وہ کبھی کہہ نہ سکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم نہ ہوتی عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی۔ تم میری زندگی ہو۔ میری قسمت ہو ۔ ۔ ۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا"۔ اس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں۔ پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا۔ اس قرب پر وہ خوشی سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے حسین پاؤں سے کھیل رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ کسی پیارے سے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ عذرا بُت سی بنی بیٹھی تھی۔ شاید وہ اس کی باتیں نہیں سُن رہی تھی یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یکلخت اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ چونک اٹھی۔ کانپ اٹھی اس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں۔ آج پہلی مرتبہ اس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے۔

نذر تمام رات بخار سے بے چین رہا۔ وہ بار بار بڑبڑا اٹھتا۔ چالیس

روپے نیلی۔ چالیس روپے وہ اکثر عذرا عذرا کہتا ہوا اٹھ بیٹھتا۔ پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا "تم میرے پاس ہونا عذرا . . . ہاں . . . تم میرے پاس ہو"۔ پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا "تم آرام کرو عذرا تم اب سو جاؤ . . . تم بیمار ہو جاؤ گی۔ میرا فکر نہ کرو۔ میں اب اچھا ہوں"۔ اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ وہ سوچ بچار کے ناقابل تھی۔ باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور کوئی دھندلی سی شکل اس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عذرا بڑبڑا رہی تھی۔ "وہ آئے ہیں، ہاں!" عذرا کا جی چاہتا تھا کہ سلیم سے جا ملے۔ مگر کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اٹھ بیٹھی۔ اُسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے یا کیا کرنا چاہتی ہے۔ باہر ہوا زور زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیاں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عذرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اٹھا لی۔ نذر بڑبڑا اٹھا۔ "نیلی نیلی چالیس روپے"۔ عذرا ڈر گئی۔ اس کا سر انگارے کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔ سوتی نے چیخ ماری۔ دردناک چیخ۔ عذرا نے اُسے دیکھا۔ غریب سوتی اپنے پنجرے میں یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لئے مضطرب ہو۔ میز پر پنسل پڑی تھی۔ دفعتہً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی۔ وہ پارسل پر لکھ رہی تھی "میں نہیں آ سکتی"۔ اس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی۔ شاید اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کاٹ نہ دے۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھنے کے بغیر ہی وہ پارسل سڑک پر پھینک کر جھٹ دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی۔ عذرا پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں اور اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اس کے کانوں میں ایک شورِ محشر سنائی دے رہا تھا . . . کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا۔ کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا . . . وہ چیخ مار کر اُسے بلا لینا چاہتی تھی . . . اس نے اپنے دل میں ایک شکست کی آواز سنی اور دھم سے کرسی میں گر گئی۔ "یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا"۔ اس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے . . . بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ ہچکی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا . . . کیوں عذرا . . . کیوں . . . ہیں . . . تم روتی ہو؟ تم کیوں رو رہی ہو۔ عذرا میں یہاں ہوں میں تمہیں چھوڑ نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں عذرا۔ تم فکر نہیں کرو۔ سو جاؤ۔ نذر نے عذرا کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رکتی نہ تھیں۔ "میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا۔" اس کے کانوں میں گونج اٹھا "سلیم تم نہ جاؤ۔ سلیم! سلیم!" اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا۔ "سلیم مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا"۔ . . . وہ سلیم کی دنیا میں تھی۔

پھر اس نے سنا جیسے کوئی میلوں دور کہہ رہا تھا "عذرا میری وفا کی دیوی"۔

ممتاز مفتی

شاعر

ہے میری نظر میں حسن کا سیل — پہنائے بہار سے زیادہ
بربط میں مری ہے نغمہ میرا — اندازۂ تار سے زیادہ

اعجاز

غزل

یہ کیف بارشوں کے یہ مستی سحاب کی
توفیق ہو تو نہر بہادوں شراب کی

وہ عشوہ کاریاں ترے حسنِ شباب کی
وہ تیر باریاں نگہِ بے حجاب کی

پھر جلوۂ جمال دکھا اور شاد کر
پھر داد دے مری نگہِ انتخاب کی

یہ کیوں نہ مان لوں مری قسمت خراب ہے
توجیہ کیا ضرور ترے اجتناب کی

دنیا کی راحتوں کی طرف کیا نظر کروں
دنیا کی راحتیں ہیں نمائش سراب کی

آزاد کا دل اور اسیری کی آرزو
تقدیر تیرے طرۂ پُرپیچ وتاب کی

ایضاً

کرے کسی کی محبت مجھے شکار کرے
کرے ہلاک ستم ہائے بے شمار کرے

قرارِ تام کی ساعت قریب آپہنچی
کسی کی یاد ذرا اور بے قرار کرے

قریب ہے کسی کافر ادا کی مست نگاہ
مقربانِ خدا تک کو مے گسار کرے

ستم شعار ستا لیکن اس قدر نہ ستا
کہ شکر شکلِ شکایات اختیار کرے

خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ
کہ یاس چارۂ تکلیف انتظار کرے

ہوا خلاف تلاطم شدید ساحل دور
خدا ہی ڈوبنے والے کی ناؤ پار کرے

حکیم آزاد انصاری

بنامِ یگانہ

کدھر چلا ہے اِدھر ایک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا!

دکھا دے خاک کے پُتلوں میں زور کتنا ہے
ہوا پہ تیر چکا اب زمیں میں دھنستا جا!

رُلا رُلا کے غریبوں کو ہنس چکا کل تک
مری طرف سے اب اپنی دسا پہ ہنستا جا

جفائے پنجۂ خونخوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا!

علاجِ اہلِ حسد، زہر خندِ مردانہ!
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

بقدرِ ذوق تماشائے حسن ناممکن
ترسنے میں بھی ہے اک کیفیت ترستا جا!

تو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پہ کستا جا

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

پنڈت جواہر لال نہرو

آباؤ اجداد | جواہر لال کے جد اعلیٰ راج کنول کشمیر کے مشاہیر میں سے تھے۔ اُن کی قابلیت سنسکرت اور فارسی میں بہت اچھی تھی۔ شہنشاہ فرخ سیر جب کشمیر آئے تو اُن کی لیاقت سے بہت متاثر ہوئے اور دہلی چلنے کے لئے کہا۔ یہ واقعہ ۱۷۱۶ء کا ہے۔ شہنشاہ نے جاگیر اور ایک عمدہ مکان نہر کے کنارے انہیں عطا کیا۔ اور اسی عطیہ کے بعد سے ان کے نام کے بعد نہرو (نہر سے) کا اضافہ کیا گیا۔ کنول خاندانی نام تھا اس لئے ان کی اولاد کنول نہرو پکاری گئی۔ لیکن ایک عرصہ بعد کنول حذف کر دیا گیا اور یہ خاندان نہرو کے نام سے شہرت پا گیا۔ مغلیہ شہنشاہی کا چراغ گل ہونے کے بعد اس خاندان نے انگریزی حکومت میں ملازمت کر لی۔ جواہر لال کے پردادا لکشمی نارائن نہرو "سرکار کمپنی" کے پہلے وکیل مقرر ہوئے۔ ان کے دادا گنگا دھر نہرو دہلی کے کوتوال ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ہنگامہ آرائیوں نے اس خاندان کا شیرازہ بکھیر دیا۔ سارے خاندانی اسناد تلف ہو گئے۔ اور دولت لوٹ کھسوٹ میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ جان بچی لاکھوں پائے سمجھ کر اکثر افراد نے بیک بینی و دوگوش آگرہ کا رُخ کیا۔ جواہر لال کے والد ابھی اس دنیا میں آئے نہ تھے لیکن ان کے دو چچا ہوش سنبھال چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مئی ۱۸۶۱ء میں آگرہ میں ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو پیدا ہوئے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ہندوستان کے شاعر اعظم ربندر ناتھ ٹیگور بھی اسی دن اسی مہینہ اور اسی سال پیدا ہوئے۔

چونکہ جواہر لال کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے اس بڑے خاندان کا بار ان کے دونوں چچاؤں پر پڑا۔ ایک چچا نے حکومت کے محکمۂ عدالت میں ملازمت کر لی اور دوسرے نے کھتری اسٹیٹ میں دیوانی کا عہدہ حاصل کر لیا۔ ہائیکورٹ آگرہ سے الہ آباد میں منتقل ہوا اور چونکہ ان کے چچا کا تعلق اسی سے تھا اس لئے ان کے چچا مع خاندان کے الہ آباد چلے آئے۔ الہ آباد پہنچ کر ان کے چچا نے وکالت شروع کر دی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں صف اول میں جگہ مل گئی۔ موتی لال نہرو کی تعلیم کا سلسلہ یہاں جاری رہا۔ لیکن وہ بحیثیت طالب علم کچھ زیادہ نہیں چمکے اور ہر امتحان میں بمشکل پاس ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ جب بی۔ اے کے امتحان کا وقت آیا تو بھی ان کی لاپرواہی باقی رہی اور اس امتحان کا ایک پرچہ کر کے وہ اس قدر بد دل ہوئے کہ انہوں نے باقی پرچوں میں بیٹھنا وقت ضائع کرنا خیال کیا۔ لیکن بعد کو ان کے پروفیسر کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا پہلا پرچہ اتنا خراب نہ تھا کہ امتحان کا خیال سرے ہی سے چھوڑ دیتے۔ بہر حال انہوں نے اپنی جامعاتی زندگی یہیں ختم کر دی اور کبھی بی۔ اے پاس کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اب انہیں اپنا پیشہ پسند کرنے کی فکر ہوئی۔ وکالت کی طرف ان کا بچپن سے رجحان تھا اور وہ اسے صد درجہ پسند کرتے تھے۔ علاوہ اس کے اپنے بھائی کی کامیابی بھی مدنظر تھی۔ اسی خیال سے وہ وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اور یہاں وہ پہلی دفعہ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ سارے امیدواروں میں اول آئے اور طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ کانپور میں انہوں نے اپنی وکالت کا آغاز کیا اور تین سال بعد وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں آ گئے اس اثنا میں ان کے بھائی کا انتقال ہو گیا اور ان کے مقدمے بھی ان کے ہاں آنے لگے۔ موتی لال نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور وہ تعطیلات اور فرصت کے لمحات بھی بن صحت کا خیال کئے مقدمات کی تیاری میں صرف کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ بہت جلد ان کا شمار الہ آباد کے چوٹی کے وکلاء میں ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ان کی آمدنی بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ طریق معاشرت بھی بدلتا گیا۔ مغربی طرز رہائش پر بیشمار دولت دل کھول کر صرف ہونے لگی۔

جواہر لال کی پیدائش اور بچپن | ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں جواہر لال پیدا ہوئے۔ ہندوستانی طرز معاشرت کے لحاظ سے نہرو کا سارا خاندان ایک ہی گھر میں رہتا تھا۔ لیکن جواہر لال سب بچوں سے چھوٹے تھے۔ اس لئے کوئی انہیں خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نہ ان کے ساتھ کوئی کھیلتا۔ نہ انہیں کسی تفریح میں شریک کرتے اور نہ شرارتوں میں ساتھ لیتے۔ انہی اسباب کی بنا پر جواہر لال کو تنہائی میں مجبوراً بیٹھنے کی کچھ عادت سی ہو گئی۔ اور گو کہ شروع شروع میں انہیں تکلیف ہوئی تھی لیکن بعد میں طبیعت کو تنہائی سے انس ہو گیا۔ مغربی معاشرت کی پیروی کے سلسلے میں ان پر ایک انگریز "گورنس" تھی۔ جواہر لال اپنی ماں سے جن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا زیادہ مانوس تھے بہ نسبت باپ کے

اس لئے نہیں کہ موتی لال اس زمانہ میں ذرا تند مزاج واقع ہوئے تھے۔ اور ایک دن جبکہ ان کی عمر ۵ یا ۶ سال کی ہوگی۔ باپ کا ایک فاؤنٹن پن چھپا لینے کے الزام میں خوب پٹے تھے اور اس سبب سے ڈرتے تھے بلکہ محض اس وجہ سے کہ ان کی ماں انہیں حد سے سوا چاہتی تھی۔ اور چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے سے انس زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنی ماں کے سوا جواہر لال کو اپنے باپ کے ملازم منشی مبارک علی سے بھی خاصا لگاؤ ہو گیا تھا۔ منشی جی ۱۸۵۷ء کے غدر کے ستائے ہوئے تھے۔ وہ اچھے خاندان کے فرد تھے لیکن غدر نے ان سے دولت۔ وجاہت اور حیثیت سب کچھ چھین لی تھی اور ان فلک کے ستائے ہوئے منشی جی کو موتی لال نے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کی سفید داڑھی نے جواہر لال کی نظروں میں ایک خاص وقعت پیدا کر لی تھی۔ ان کا خلوص جواہر لال کی کشش کا باعث ہوا اور ان کی شفقت نے جواہر لال کا دل موہ لیا۔ وہ اکثر الف لیلہ کے قصے بیان کرتے تھے اور جواہر لال انہیں حیرت و استعجاب کے عالم میں سنا کرتے تھے۔ ایک عرصہ بعد جبکہ جواہر لال ہوش سنبھال چکے تھے منشی جی نے انتقال کیا لیکن جواہر لال کے دل میں اب تک ان کی یاد باقی ہے۔

مذہبی تہواروں اور پوجا پاٹ کے فرائض میں عورتوں کی سرگرمی خصوصیت رکھتی ہے۔ جواہر لال کے خاندان میں بھی ان معاملات میں عورتوں ہی کا دخل تھا۔ مرد اور وہ بھی نوجوان مغربی طرز کے پیرو ان کی بجا آوری سے اکثر قاصر رہا کرتے تھے۔ لیکن عورتیں کمسن ہوں کہ مسن ادائی فرائض میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھیں۔ جواہر لال کی عمر ابھی اس قابل نہ ہوئی تھی کہ ان کے ساتھ سمجھ بوجھ کر حصہ لیتے۔ اس لئے وہ محض نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے۔ عید اور تہواروں کے موقع پر رنگ رلیاں منانا۔ مٹھائیاں کھانا اور نئی نئی پوشاکیں پہننا ہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہ جانتے تھے۔ اس خصوصیت میں وہ سب سے زیادہ اہمیت اپنی سالگرہ کو دیتے تھے۔ اس وجہ سے کہ وہی ایک تقریب ایسی ہوتی تھی جس کے وہ تنہا ہیرو ہوتے تھے۔ اور ہر شخص ان کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیتا اور ان کی آؤ بھگت کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ دل ہی دل میں ہمیشہ اور علی الاعلان بعض دفعہ کہا کرتے تھے کہ یہ تقریب سال میں صرف ایک دفعہ کیوں آتی ہے۔ جب کہ دوسری عیدیں اور تقاریب سال میں کئی کئی دفعہ آتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ یہ اتنے انتظار کے باوجود بھی دیر سے آئے۔

آنند بھون جواہر لال کی عمر دس سال کی تھی کہ ان کے والد نے ایک نیا مکان جو ان کے پچھلے مکان کی بہ نسبت بہت وسیع تھا بنایا اور نہرو خاندان اس میں منتقل ہو گیا۔ اس کا نام "آنند بھون" تھا۔ یہ مکان آج بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور غالباً اس کا چرچا کانگریسی کاروبار کے سلسلہ میں زیادہ ہوا۔ جواہر لال کو اس مکان کی دو چیزیں زیادہ پسند تھیں۔ ایک تو اس کا عمدہ باغیچہ اور دوسرا تیرنے کا بڑا حوض۔ آخر الذکر سے خصوصاً ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور بہت جلد انہوں نے اچھا تیرنا سیکھ لیا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ جب ان کا دل نہ لگتا تھا یہ فوراً اس میں غوطہ زن ہوتے تھے۔ ان کے والد گو اچھا تیرتے نہ تھے لیکن سہ پہر میں عموماً اپنے دوستوں کے ہمراہ ضرور تیرنے آتے۔ سر تیج بہادر سپرو بھی جو ان دنوں الہ آباد ہائی کورٹ میں جونیر تھے اکثر موتی لال کے ساتھ تیرنے چلے آتے۔ لیکن نہ انہیں تیرنا آتا تھا اور نہ سیکھنے کے خواہشمند تھے۔ گہرے پانی میں قدم رکھنے سے بہت گھبراتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کمر برابر پانی میں کھڑے ہو کر چھینٹے لڑا کرتے تھے۔

اساتذہ جواہر لال کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت جی مقرر تھے جو سنسکرت اور ہندی پڑھاتے تھے۔ اور موقع بے موقع مذہبی فرائض سے بھی آگاہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں سے جواہر لال نے بہت کم سیکھا۔ اس میں دراصل پنڈت جی کا زیادہ قصور نہ تھا بلکہ جواہر لال خود ہی لاپروا تھے۔ موتی لال کی ولائت سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی سفارش پر ایک انگریز استاد تعلیم کے لئے مقرر ہوا۔ اس کا نام فرڈینڈ ٹی بروکس تھا۔ تین سال تک جواہر لال اس کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ اسی زمانہ میں انہیں مطالعہ کا شوق ہوا۔ بچوں کے قصے کہانیاں ختم کر کے انہوں نے اس کے ساتھ ڈکنز۔ ٹھیکرے اور ویلز کی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔

تھیاسوفی چونکہ فرڈینڈ تھیاسوفسٹ تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھار اس کا ذکر جواہر لال سے کیا کرتا تھا اور بعض دفعہ اس کے کمرے میں اس سوسائٹی کے اجلاس ہوا کرتے تھے جن میں یہ بھی شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں اس سوسائٹی سے دلبستگی سی ہونے لگی اور حالانکہ وہ ابھی اس قابل نہ تھے کہ اس کے نشیب و فراز کو سمجھ سکیں مگر اس کی خاموشی اور جاذب نظر کارروائی نے انہیں اس کا طرفدار بنا لیا۔ ایک دن انہیں خواہش ہوئی کہ وہ بھی اس کے ممبر بنیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اپنے والد کے پاس پہنچے اور ان سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ہنسنے لگے شائد اس وجہ سے کہ جواہر لال کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی مگر پھر بھی انہوں نے اجازت دے دی۔ جواہر لال ممبر ہو گئے اور چونکہ ان دنوں ڈاکٹر اینی بیسنٹ الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے خود یہ رسم ادا کی۔ بعد میں جواہر لال کو معلوم ہوا کہ موتی لال بھی اس سوسائٹی کے قدیم ممبر ہیں۔ لیکن ان کی دلچسپیاں ختم ہو گئی ہیں۔

انگلستان کو روانگی مئی ۱۹۰۵ء میں جواہر لال کا پورا خاندان ماں باپ اور چھوٹی بہن سب کے سب انگلستان کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر انصاری مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی جو اس وقت لندن کے ہسپتال میں ہوس سرجن تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ "ہیرو" کے ممتاز اسکول میں انہیں فوراً ہی جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد ان کے والد انگلستان سے واپس ہو گئے۔ چونکہ اُن کی عمر ابھی پندرہ برس ہی کی تھی اور اب تک کبھی والدین سے علیحدہ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہ تنہائی شاق گزرنے لگی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی دلچسپیوں نے اس کو بھی کم کر ہی لیا۔ جواہر لال کو اس سال کے "عام انتخابات" سے دلچسپی ہونے لگی اور اس موقع پر انہوں نے اس کا کافی غور سے مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۶ء کی ابتدا میں ایک دن کسی مدرس نے پچھلے انتخابات کا حال لڑکوں سے دریافت کیا تو اس کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں سوائے جواہر لال کے کوئی بھی صحیح جوابات نہ دے سکا۔ مزید براں انہوں نے انتخابات کا تفصیلی حال سنایا اور اراکین کابینہ کے نام صحت کے ساتھ گنائے۔ دوسری دلچسپی ہوائی جہازوں کے متعلق تھی۔ ایک دفعہ تو انہوں نے موتی لال کو لکھا کہ وہ بہت جلد ہوائی جہاز کے ذریعہ مختصر سی چھٹیاں منانے گھر آنے والے ہیں۔

اس زمانہ میں "ہیرو" میں چار یا پانچ ہندوستانی طالب علم تھے۔ بڑودا کا ایک شہزادہ تھا۔ جو ان سے پہلے وہاں تھا۔ اور ان کے وہاں پہنچنے کے تھوڑے دن بعد واپس ہو گیا۔ اس کے بعد ہی مہاراجہ کپورتھلہ کا شہزادہ "پرمجیت سنگھ" آیا۔ یہ "ہیرو" کو ہندوستان بلکہ اپنی ریاست سمجھ رہے تھے اور اسی شان و شوکت، متانت اور وقار سے رہنا پسند تھا اس لئے ظاہر ہے کہ ہر طرف سے انگلیاں اٹھتی تھیں اور لڑکے چھیڑتے تھے۔

کیمبرج جواہر لال کو اپنے اسکول اور ساتھیوں سے اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ ۱۹۰۷ء میں جب انہیں ٹرینٹی کالج کیمبرج میں شریک ہونے کے لئے ہیرو چھوڑنا پڑا تو وہ بے حد مغموم نظر آنے لگے۔ کیمبرج کے ٹرائی پاس میں انہوں نے اپنے مضامین کیمیا، ارضیات اور نباتات لئے۔ اس زمانہ میں عام طور پر ان کے ساتھیوں میں نیٹشے، برنارڈ شا، ایوان بلاک، ہیولاک، ایلس، کرانٹ ابنگ وغیرہ پر تبصرے اور تنقیدیں ہوا کرتی تھیں اور جواہر لال بھی ان میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ آرٹ اور زندگی کے عام طرز کے متعلق آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے خیالات طلبہ کے دماغوں پر مسلط تھے۔ اور بڑی حد تک جواہر لال بھی ان ہی کے ساتھ تھے۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں نے ایک سوسائٹی "مجلس" کے نام سے قائم کی۔ اس میں ہندوستانی مسائل پر آزاد لہجہ میں تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ سوائے جواہر لال کے ہر ہندوستانی طالب علم بڑے زور و شور کی تقریریں کیا کرتا تھا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ لوگ وق کرتے تھے مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ یہ سنتے سب تھے لیکن کہتے کچھ نہ تھے۔ وجہ یہ تھی کہ پلیٹ فارم پر آنے سے بہت شرماتے تھے۔ کیمبرج کی انجمن اتحاد میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ ہر طالب علم اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے اور تقریر کرے۔ کم سے کم "ہر ٹرم" میں ایک دفعہ ورنہ اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ باوجود اس سختی کے جواہر لال تقریر کرنا پسند نہ کرتے تھے اور چپکے سے جرمانہ ادا کر دیتے تھے۔ مسٹر مانٹیگو (جو بعد میں سکرٹری آف اسٹیٹ ہوئے) اکثر انجمن کے مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ ان دنوں پارلیمنٹ میں کیمبرج کے نمائندے تھے۔ بعض مشہور ہندوستانی لیڈروں نے بھی ان دنوں کیمبرج کی انجمن اتحاد میں تقریریں کیں خصوصاً چندرا پال۔ لاجپت رائے اور گوکھلے کی تقریروں نے جواہر لال پر خاص اثر کیا۔

جواہر لال کے ہمعصروں میں سین گپتا، سیف الدین کچلو، سید محمود تصدق احمد شروانی اور محمد سلیمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ہی سے ہر شخص ہندوستانی مسائل میں برابر کی دلچسپی لیتا تھا۔ اور یہ معلوم کرنا اس وقت ناممکن تھا کہ بعد میں کون کانگریسی ہوگا اور کون حکومت کی ملازمت میں چلے گا۔

کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد مستقبل کا خیال جواہر لال کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ انڈین سول سروس کا مقناطیس ایک طرف انہیں کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف کسی آزاد پیشہ کے اختیار کرنے کا سوال جاذب نظر ہو رہا تھا۔ سول سروس کا خیال اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہ ابھی اپنی عمر کے لحاظ سے مقابلہ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ ان کی عمر کا بیسواں سال ابھی شروع ہی ہوا تھا اور مقابلہ کی شرکت کی عمر کم از کم بائیس تھی۔ اس لحاظ سے انہیں کم از کم دو سال ٹھیرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ موتی لال کا خیال تھا کہ سویلین ہو کر اُن کا اکلوتا بیٹا گھر سے دور رہے گا۔ اس لئے قرعۂ فال ان کے خاندانی پیشۂ وکالت پر پڑا۔

کیمبرج کے بعد ۱۹۱۰ء میں جواہر لال نے کیمبرج چھوڑا اور لندن میں وکالت کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں انہیں اپنا پورا وقت اس پر صرف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے اوقات فرصت میں مختلف مضامین پر مطالعہ شروع کیا۔ "فےبین" اشتراکیت کا ان دنوں زور تھا اور جواہر لال

بھی اس سے متاثر ہونے لگے۔ اشتراکیت کے علاوہ آئرلینڈ کا سیاسی انتشار اور عورتوں کا حق رائے دہی نوجوان جواہر لال کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ انہوں نے اسی سلسلہ میں آئرلینڈ کا سفر بھی کیا اور بچشم خود وہاں کے حالات کا معائنہ کیا۔

لندن کی سوسائٹی نے جواہر لال کو قدرے مسرف بنا دیا اور بعض بعض دفعہ جو کچھ ان کے والد بھیجتے تھے وہ ناکافی ہونے لگا۔ اکثر چھٹیوں کے موقع پر وہ یورپ کے سفر کو نکل جاتے۔ ایک دفعہ موتی لال بھی اُن کے ساتھ برلن میں تھے کہ کونٹ زیپن پہلی مرتبہ طویل ہوائی سفر سے واپس ہوئے۔ زیپن کے استقبال کے لئے برلن کی آبادی کا بڑا حصہ لوٹ پڑا۔ اور اژدحام کی حالت یہ تھی کہ بس جدھر دیکھتے انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔ خود قیصر بھی استقبال کے لئے آئے تھے۔ جس سے یہ واقعہ تاریخی یادگار ہوگیا۔ موتی لال اور جواہر لال جس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اس نے اسی رات کو اپنے سارے مسافروں کی خدمت میں کونٹ زیپن کی ایک خوبصورت تصویر بطور تحفہ پیش کی تھی جو ممکن ہے کہ جواہر لال کے ہاں اب بھی محفوظ ہو۔

۱۹۱۲ء میں جواہر لال نے قانونی ڈگری حاصل کرلی اور ہندوستان کا رُخ کیا۔

وکالت سے بیزاری | انگلستان سے واپس ہوکر جواہر لال الہ آباد ہائی کورٹ میں رجوع ہوگئے۔ کچھ دنوں تک انہوں نے دلچسپی سے کام کیا۔ جیسا کہ ہر شخص نئے پیشے میں داخل ہوتے وقت کرتا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کی طبیعت اُکتانے لگی۔ ان کے باپ کا اس وقت طوطی بولتا تھا۔ اور گھر میں آٹھوں پہر مقدموں کے چرچے رہتے۔ دوست احباب بھی اسی مذاق کے آتے جاتے اور کتب خانہ بھی قانونی کتب سے بھرا پڑا تھا۔ فضا کی اس یکسانیت نے انہیں وکالت کے پیشہ سے بیزار کردیا اسی سلسلہ میں ان کے کان کانگرس اور سیاست حاضرہ سے آشنا ہوئے۔ موتی لال بھی اس زمانہ میں وکالت کا بچا ہوا وقت قانون سازی، دستور سازی اور سیاست پر صرف کرتے تھے۔ لیکن جواہر لال نے دل ہی دل میں وکالت سے زیادہ سیاست کی ٹھان لی۔ اسی خیال سے کانگرس میں شرکت کی اور اس کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً آنے جاتے رہے۔ علاوہ اس کے طبیعت جب ذرا اچاٹ سی ہو جاتی تھی تو سیر و شکار کی بھی سوجھتی تھی۔ لیکن انہیں جانوروں کی جان لینے سے زیادہ لطف شکار کے سامان کی تیاری اور اس کی تلاش میں آتا تھا۔ سوائے ایک دفعہ کے جب کہ انہوں نے کشمیر میں ایک ریچھ کا شکار کیا تھا۔ اُن کا کارنامہ اس خصوص میں خون آلود نہیں ہوا۔

سر راش بہاری گھوش کا مشورہ | وکالت سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی جواہر لال اس سے بالکل کنارہ کش نہیں ہوگئے تھے۔ شائد اس لئے کہ کوئی اور کام انہیں نہ تھا۔ سر راش بہاری گھوش جو کلکتہ کے مشہور ترین وکیل تھے نہ جانے کیوں ان سے دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ قانون پر اپنی دلچسپی کے لحاظ سے کوئی موضوع پسند کریں اور اس پر ایک عمدہ کتاب لکھیں۔ گھوش کے خیال میں اس پیشہ میں منہمک ہونے کا یہ بھی ایک ذریعہ تھا مگر بدقسمتی سے جواہر لال کے بس کا یہ دھندا نہ تھا۔ گھوش اپنی عمر کے تقاضے کی بنا پر تند مزاج ہوگئے تھے اور اپنے "جونیرس" کو وقتاً فوقتاً ڈانٹتے تھے لیکن جواہر لال کے ساتھ کبھی بھی انہوں نے سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔

ستیاگرہ | "رولٹ بل" کے خلاف گاندھی جی نے جب احتجاج شروع کیا تو انہوں نے ساتھ ہی ایک ستیاگرہ سبھا قائم کی۔ جس کے شرکا کا فرض تھا کہ وہ "رولٹ ایکٹ" کی خلاف ورزی کریں۔ جواہر لال کی نظریں جو کسی مصروفیت کی متلاشی تھیں اس پر پڑیں اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اس ایکٹ کے ذریعہ حکومت ہند کسی شخص کو قانونی چارہ جوئی کے بغیر گرفتار کرلے اور قید کردے۔ اس لئے انہوں نے تہیا کرلیا کہ اس سبھا میں شریک ہوں گے۔ جب اس کی اطلاع موتی لال کو ہوئی تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ کیونکہ ان کے خیال میں حکومت سے اس قسم کا مقابلہ ایک بے معنی اور لغو فعل تھا۔ اور سوائے اپنے آپ کو قید کرانے کے کوئی اور مفید نتیجہ برآمد نہیں کراسکتا تھا۔ علاوہ اس کے اپنے چہیتے لڑکے کو قید خانہ میں دیکھنا ان کے لئے ایک مستقل عذاب تھا جس کے خیال ہی سے وہ لرزہ براندام ہوجاتے تھے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے گاندھی جی کو الہ آباد بلایا اور سارے واقعات بتائے جس کی بنا پر گاندھی جی نے جواہر لال کو سمجھایا کہ وہ اپنے والد کو تکلیف نہ پہنچائے مگر جواہر لال جتنا سوچتے تھے اتنا ہی اپنے ارادہ میں مضبوط ہوتے جاتے تھے۔ موتی لال کی حالت یہ تھی کہ خواب و خور حرام تھا۔ اور وہ مستقبل کے خیال سے دل گرفتہ ہوئے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے عمدہ غذا نرم بستر اور آسائش سے کنارہ کشی اختیار کرلی محض یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ عنقریب جواہر لال کو قید خانہ میں کسی قسم کی تکالیف کا سابقہ پڑیگا۔

خدا نے موتی لال کی سُن لی اور ستیاگرہ سبھا کو بعض واقعات کی وجہ سے اپنی کارروائی موقوف کرنی پڑی۔

نان کوآپریشن | ۱۹۲۰ء میں کانگرس کا اسپیشل سشن کلکتہ میں ہوا۔ گاندھی جی کی تحریک نان کوآپریشن پیش ہوئی۔ انتہا پسندوں کے سوا سبھوں نے مخالفت کی

لاجپت رائے اور سی۔ آر داس نے بھی اس تحریک کی مخالفت کی۔ جناح جو سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں "ہندو مسلم اتحاد کے پیغامبر" ہیں علیحدہ ہو گئے۔ لیکن یہ تحریک عوام میں بے حد مقبول ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے طرفداروں کی ایک کثیر جماعت کمربستہ نظر آنے لگی۔ جواہر لال نے اس میں نمایاں حصّہ لیا اور گاندھی جی کے ساتھ مختلف مقامات کا دورہ کیا اور تبادلۂ خیال کیا۔ گاؤں اور قصبوں کا دورہ کرنا اور تقریروں کا ایک سلسلہ باندھنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔

پرنس آف ویلز کی آمد ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے اور کانگریس نے تصفیہ کیا کہ ان کا خیر مقدم نہ کیا جائے۔ کانگریس کو ان کی ذات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بلکہ حکومت ہند کے خلاف مظاہرہ مقصود تھا۔ بہرحال یہ موقع ایسا تھا کہ حکومت سخت پریشان اور انتشار کے عالم میں تھی۔ ہندوستان کے ہر طبقہ کے افراد نان کوآپریشن میں شریک تھے۔ علی برادران کی کوششوں کی وجہ سے مسلمان علماء اور قائدوں کی ایک بڑی جماعت اس میں شریک ہو گئی اور اُن کے ساتھ عوام جوق در جوق اس میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔

جواہر لال کی پہلی گرفتاری حکومت نے نان کوآپریشن کا جواب گرفتاری سے دیا۔ ہر طرف گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ایک دن جواہر لال کانگریس کے دفتر میں تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ پولیس دفتر کی تلاشی کے لئے آئی ہے۔ جواہر لال کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سراسیمہ ضرور تھے۔ لیکن وضع داری کے مدنظر انہوں نے دفتر کے کارکنوں کو احکام دیئے کہ وہ بدستور کام میں مشغول رہیں اور پولیس کی کارروائی سے اپنی لاپروائی کا اظہار کریں۔ اسی اثناء میں انہیں اطلاع ملی کہ ان کا ایک دوست گرفتار ہو چکا ہے۔ اور وہ انہیں خداحافظ کہنے کے لئے کمرے کے باہر منتظر ہے۔ انتہائی متانت کا اظہار کرتے ہوئے گویا کہ یہ روز کا واقعہ ہے۔ انہوں نے پولیس اور دوست دونوں سے کہا کہ وہ ان کے خط ختم کرنے تک انتظار کریں۔ دفتر سے اٹھ کر جواہر لال گھر پہنچے تو انہیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہاں بھی خانہ تلاشی ہو رہی ہے اور نہ صرف ان کی قید کے احکام آ چکے ہیں۔ بلکہ ان کے والد کی گرفتاری بھی عمل میں آنے والی ہے۔ موتی لال نے کچھ ہی دن قبل نان کوآپریشن کے والنٹیروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرایا تھا۔ اس لئے انہیں بھی خمیازہ بھگتنا پڑا۔

دسمبر ۱۹۲۱ء اور جنوری ۱۹۲۲ء میں گرفتاریوں کی تعداد تقریباً تیس ہزار ہو چکی تھی۔ مگر گاندھی جی ابھی گرفتار نہیں کئے گئے تھے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں قید خانے میں یہ خبر نہایت بددلی کے ساتھ سنی گئی کہ گاندھی جی نے اپنی تحریک بند کر دی خواہ وہ کتنی ہی قلیل مدت اور کسی خاص مصلحتِ وقت کے لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن قیدیوں کو اس سے روحانی صدمہ پہنچا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گاندھی جی کو بھی ایک طویل مدت کے لئے قید کر لیا گیا۔

دوسری گرفتاری جواہر لال کو تعجب ہوا کہ چھ مہینہ کی سزا سنا کر تین مہینہ بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ مارچ میں چھٹکارا ملا تو یہ فوراً گاندھی جی کے ہاں پہنچے مگر وہ اس وقت گرفتار ہو چکے تھے۔ چھ ہفتہ بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں انہیں دوبارہ قید کر لیا گیا۔ آٹھ مہینہ تک لکھنؤ جیل میں انہیں رکھا گیا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ جیل کے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی اور اسی سلسلہ میں جواہر لال بھی رہا ہوئے۔

مولانا محمد علی کے ساتھ دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سیشن "کوکاناڈا" میں ہوا۔ مولانا محمد علی پریزیڈنٹ مقرر ہوئے اور انہوں نے جواہر لال کو معتمد بننے کے لئے اکسایا۔ ان دنوں محمد علی اور جواہر لال کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور مولانا کا خیال تھا کہ دوسرا معتمد ان کے ساتھ اس عمدگی سے اتحادِ عمل نہ کر سکے گا جیسا کہ جواہر لال کریں گے۔ جواہر لال مولانا کی تحریک کو رد نہ کر سکے اور یہ ذمہ دارانہ عہدہ انہوں نے پہلی دفعہ قبول کر لیا۔

جواہر لال نے محمد علی کے مشورہ کے بغیر اپنی معتمدی کے زمانہ میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ کسی کانگرسی کو پنڈت۔ مہاتما۔ مولانا۔ مولوی۔ مسٹر۔ اسکوائر یا اسی قسم کے کسی لفظ سے مخاطب نہ کیا جائے۔ لیکن محمد علی نے فوراً بحیثیت صدر انہیں حکم دیا کہ وہ گاندھی کو مہاتما لکھا کریں۔ اس کے علاوہ محمد علی سے مذہب کے بارے میں بھی کبھی کبھار بحث ہو جاتی تھی۔ مولانا کی عادت تھی کہ ہمیشہ لکھنے۔ پڑھنے۔ بولنے میں ہر وقت خدا کے نام سے شروع کرتے خواہ دوسروں کے نقطۂ نظر سے اس کا موقع ہو یا نہ ہو۔ اس کے برخلاف جواہر لال کو اس قسم کی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی مولانا سے مذہبی بحث کرنا نہ چاہتے تھے۔ کیونکہ مولانا کا جوش و خروش دیکھ کر انہیں اندیشہ تھا کہ اس قسم کی بحث سے کہیں فائدہ کی بجائے نقصان نہ ہو۔

مولانا بھارت ماتا کی سیوا میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خطرے کے وقت لوگوں کو آگے کر کے خود پیچھے رہیں۔ ۱۹۲۹ء میں نامزد کانگرس پریزیڈنٹ کی حیثیت سے جب لاہور میں جواہر لال نے خطبہ پڑھا اور اس میں کئی مقامات پر انتہاپسندی کا اظہار کیا تو مولانا نے اس پر سخت

تنقید کی۔ "میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں جواہر"۔ انہوں نے کہا۔ "کہ تمہارے موجودہ کانگرس کے ساتھی تم سے وفا نہ کریں گے۔ پریشانی کے وقت وہ تم سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ تمہارے کانگرس کے ساتھی ہی تمہیں سولی پر چڑھائیں گے۔" یہ اُن کی آخری نصیحت تھی کیونکہ اس کے بعد وہ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے اور پھر واپس نہ آئے۔

برسیلز کانگرس | ۱۹۲۶ء کے اواخر میں جب جواہرلال یورپ میں تھے۔ انہیں اطلاع ملی کہ فروری ۱۹۲۷ء میں "مظلوم اقوام کی کانگرس" برسیلز میں ہونے والی ہے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کو لکھا کہ اس موقع پر کوئی ان کا نمائندہ بھی شریک ہو تو اچھا ہوگا۔ کانگرس نے جواہرلال ہی کو اپنی نمائندگی کے اختیارات دیئے۔ میکسیکو، جاوا، انڈوچائنا، فلسطین، شام، مصر، شمالی افریقہ کے عرب اور حبشی اس کانگرس میں شریک ہوئے اور مباحثے سرگرمی کے ساتھ چھیڑے گئے۔ ملانسبری نے اس کی صدارت کی۔

اس کانگرس کے علاوہ ایک لیگ شہنشاہیت کے خلاف بھی قائم ہوئی اور اس میں آئن سٹائن، رومن، رولان اور مادام سن یت سن قابل ہستیاں شریک ہوئیں۔

جواہرلال ان دونوں انجمنوں کے جلسوں میں متعدد مقامات پر شریک ہوئے اور ۱۹۲۷ء کے موسم گرما میں موتی لال بھی یورپ پہنچے۔ جواہرلال۔ ان کے والد۔ ان کی بیوی اور ان کی بہن سب کچھ دنوں تک یورپ میں ساتھ رہے۔ پھر سب مل کر ماسکو گئے جہاں سوویٹ کی دہ سالہ سالگرہ ہونے والی تھی۔ موتی لال کی عمر دستور سازی اور قانون سازی میں گزری تھی۔ اور انہیں انقلابات پر کچھ زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ باوجود اس کے ماسکو کے حالات سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ یہاں جواہرلال کو پہلی دفعہ سائمن کمیشن کے قیام کا علم ہوا۔ کچھ دنوں بعد موتی لال کو ایک پرانے زمینداری مقدمہ میں پریوی کونسل لندن میں پیروی کرنی تھی۔ سرجان سائمن بھی اس مقدمہ میں ان کے شریک کار تھے۔ اس لئے جب سرجان سائمن کے مکان پر وہ اور موتی لال باہم مشورہ کے لئے جمع ہوئے تو گو کہ جواہرلال کو اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن سائمن کے کہنے پر وہ بھی شریک ہوئے۔

۱۹۲۷ء کا سال قریب الختم تھا اور جواہرلال کو کانگرس کے اجلاس میں شریک ہونا تھا۔ اس لئے وہ اپنے والد کو چھوڑ کر مع اپنی بہن اور بیوی کے ہندوستان چلے آئے۔

کانگریس کی صدارت | ۱۹۳۶ء میں جواہرلال کانگریس کے صدر دوسری مرتبہ منتخب ہوئے۔ عوام میں گاندھی جی کے بعد شائد سب سے زیادہ ہر دل عزیز جواہرلال نہرو ہیں۔ اُنکی مقناطیسی شخصیت، جادو بیانی اور آہنی عزم واستقلال نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے طرفدار پیدا کر دیئے۔ لیکن ان کے خیالات انتہا پسندانہ ہیں اور انتہائی آزادی کے سوا کوئی دوسری چیز لینے پر آمادہ نہیں۔ حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ خواہ اس سے ملک کا کوئی فائدہ ہی کیوں نہ حاصل کیا جا سکتا ہو۔ ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اور حالیہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے اس کا جس طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ کچھ زیادہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتا۔ خود کانگریس کے سنجیدہ طبقہ میں اشتراکیت پسندانہ خیالات ناقابلِ عمل قرار دیئے گئے اور اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔

کملا نہرو کی وفات | ۱۹۱۶ء میں جواہرلال کی شادی کملا دیوی سے ہوئی تھی۔ اس وقت سے کملا کے انتقال تک دونو میں غیر معمولی محبت تھی۔ حالانکہ جواہرلال نے ۱۹۲۱ء کے بعد سے اپنی زندگی کے زیادہ دن جیل میں گزارے۔ دراصل ان کی ایک رہائی دوسری گرفتاری کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ اور دونو کے درمیان اتنا کم وقفہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے گھریلو کام کاج کے لئے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ موتی لال ۱۹۳۱ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد سے جواہرلال کی والدہ کی صحت خراب ہونے لگی۔ لیکن ان کی حالت درست ہوئی تو کملا کی صحت بگڑنے لگی۔ کئی دفعہ انہوں نے سخت بیماریاں جھیلیں۔ لیکن آخری دفعہ ۱۹۳۵ء میں جب جواہرلال المورا جیل میں تھے انکی حالت متغیر ہوئی۔ بمبئی میں علاج کے لئے وہ یورپ چلی گئیں۔ مگر جواہرلال کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے مرض میں کسی طرح افاقہ نہ ہوتا تھا۔ آخر جب حالت غیر ہوئی تو حکومت نے جواہرلال کو ۴ ستمبر کو قید سے رہا کیا اور وہ فوراً یورپ پہنچے۔ لیکن افسوس کہ کچھ عرصہ بعد کملا انہیں داغِ مفارقت دے گئیں اور اپنی اکلوتی لڑکی اندرا کو تنہا چھوڑ گئیں۔

تصانیف | چونکہ جواہرلال کی زندگی ۱۹۲۱ء کے بعد سے زیادہ تر قید میں گزری اور قیدخانہ میں سیاسی قیدیوں کو بعض خاص حالات کے سوا لکھنے پڑھنے کی ممانعت نہیں ہوتی۔ اس لئے ان ہی ایام میں جواہرلال نے تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ وہ خطوط جو انہوں نے قیدخانہ سے بیٹی کے نام لکھے ہیں۔ کتابی صورت میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئے۔ "ودھر انڈیا" ان مضامین کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ جو اس وقت اخباروں میں شائع ہوئے۔

اسی سال ۱۹۳۶ء میں انہوں نے اپنے خودنوشتہ سوانح شائع کئے۔ جس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپریل سے جولائی تک اس کے پانچ اڈیشن شائع ہوئے۔

سید بادشاہ حسین

اے ابنِ آدم

جرأت سے عبارت ہے ترا قلب و جگر دیکھ
آدم کی جسارت کو ذرا بھر کے نظر دیکھ
لغزش نہیں جنبش ہے تری اصل سفر دیکھ
تو عزمِ سفر لے کے اٹھا تھا تو بڑھا چل

منظر ہیں جو دلچسپ تو دیکھ اور گزر جا
ہر راہ پر انوار سے فی الفور گزر جا
گزراں ہے جہاں اس سے بہر طور گزر جا
کچھ غم نہیں محروم تماشا ہی چلا چل

جنت کو جو چھوڑا ہے تو دوزخ میں سکوں کیا
یہ شیوۂ ہوش و خرد و خبط و جنوں کیا
یہ دائرۂ خیر و شر و زشت و زبوں کیا
اس سلسلۂ وہم سے دامن کو بچا چل

یہ حسن و محبت کے فسانے ہیں پرانے
یہ عشرت و کلفت کے خزانے ہیں پرانے
یہ نغمہ نواز اور یہ ترانے ہیں پرانے
اب ان کی نہ سُن، اپنی سنا اور بڑھا چل

یہ قوم و وطن "مظہرِ تزویرِ سکوں" ہے
یہ "مذہب و مقصد" نہیں تدبیرِ سکوں ہے
یہ "نفع و ضرر" حلقۂ زنجیرِ سکوں ہے
زنجیرِ سکوں توڑ دے چل اور اُڑا چل

پنہاں تری منزل ہے نہ پیدا تری منزل
منزل ہے تری دیر نہ کعبہ تری منزل
دنیا تری منزل ہے نہ عقبیٰ تری منزل
نظروں سے دو عالم کے تماشے کو گرا چل!

ماحول کو الہامِ نظر دے کے بدل دے
ادیان کو اک تازہ خبر دے کے بدل دے
امکان کو امکانِ اثر دے کے بدل دے
ہمرہ نہیں کوئی تو اکیلا ہی چلا چل

پیغمبری و شعر کی حامل ہے تری ذات
ہر پہلو سے اے آدمی! کامل ہے تری ذات
ہر جادۂ کونین کی منزل ہے تری ذات
ہر راہ کو منزل میں کھپا اور بڑھا چل

ہر گام پہ اک جنتِ گم گشتہ بسا دے
ہر موت پہ اک زیست کا عنوان جما دے
انساں ہے تو انسان کو انسان بنا دے
ٹھہرا ہے بہت روز اب اے مردِ خدا چل

وقار
انبالوی

بھیڑیا

افرادِ تمثیل

جلال ۔۔۔ ڈاکوؤں کا سردار

اکبر
عبداللہ
ناصر
اکرم
} ۔۔۔ ڈاکو

مبارک ۔۔۔ مُلّا

عباس ۔۔۔ شاگرد

منظر:۔ ایک سنسان اور دشوار گذار پہاڑی سلسلہ۔ بلندیوں پر پہاڑ کی دراڑوں میں خار دار جھاڑیاں اور چیل کے درخت اُگے ہوئے ہیں زمین پر ایک خشک شدہ برساتی نالے کا پتھریلا راستہ ہے جس میں چٹانوں کے بڑے بڑے تودے بھی بکھرے پڑے ہیں۔ داہنے طرف ایک گہرا غار ہے جس میں سے پانی ایک نالے کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ اوپر والی جھاڑیوں کے نیچے سے ایک بھیڑ کی پشت اور لمبے لمبے سینگوں والا سر نظر آرہا ہے۔ جونہی اکبر ہانپتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اوپر چڑھتا ہے بھیڑ کا سر اس کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ اکبر ٹھیر جاتا ہے۔ اور اپنے دائیں بائیں نظریں دوڑا کر اپنے ہاتھ منہ کے ساتھ لگا کر بھیڑیے کی طرح چلاتا ہے۔

اکبر۔ واؤو، واؤو! ۔۔ واؤو، واؤو!

عبداللہ (اوپر سے) آآ!

اکبر۔ او اکبر! دوسرے کہاں ہیں؟

عبداللہ کہاں ہیں! مجھے کیا خبر۔ میں موجود ہوں

اکبر۔ ان کو سنانے کے لئے تازہ خبریں لایا ہوں۔

(وہ بیٹھ جاتا ہے اور اپنے تھیلے میں سے ایک خربوزہ نکال کر زانو پر رکھ لیتا ہے)

عبداللہ۔ (بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے نیچے جھانکتا ہے) ارے! یہ کہاں سے آگیا؟

اکبر۔ بڑی دُور سے۔ غزنی کے بازار سے۔ لو!

(آدھا خربوزہ کاٹ کر اوپر کی طرف پھینکتا ہے۔ عبداللہ اُچک کر کھانا شروع کر دیتا ہے)

عبداللہ تازہ خبریں؟ ہاں! سناؤ۔

اکبر۔ انسان کے لئے ایک دفعہ کہنا کافی ہوتا ہے۔ جلال کو بلاؤ اور کہو کہ فوراً آئے۔

عبداللہ۔ (پہلے چیختا ہے اور پھر بھونکتا ہے) آؤوؤ۔ واؤو! واؤو!

آواز۔ (دور سے) آؤوو۔ واؤو! واؤو!

(اکبر اپنے تھیلے کو خالی کرنا شروع کرتا ہے۔ اس میں زیادہ تر فولاد اور چمڑے کے ٹکڑے ہیں۔ انہی میں ملی ہوئی چند ایک خوب صورت پتلیاں ہیں)

اکبر۔ او خدا! دنیا میں کیسے کیسے بے وقوف ہیں۔ اگر میں چاہتا تو اس سے دگنا مال جمع کر سکتا تھا۔

عبداللہ۔ ہاں اتنی بڑی بھیڑوں میں بالکل آسان بات ہے۔ [illegible] انہیں

دیکھو۔ وہ نیچے، چیونٹیوں کی طرح اُس دروازے میں سے نکل رہے ہیں۔ (سامنے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اکبر۔ اچھا! معلوم ہوتا ہے خرید وفروخت بند ہو چکی ہے۔ ان میں آج ایک واعظ مُلا بھی آیا ہوا ہے۔ جب اس نے وعظ شروع کیا تو لوگ مسحور سے ہو گئے . . . میرا کام بن گیا۔

عبداللہ۔ کیا وہی نہیں، مُلا مبارک؟

اکبر۔ فاقہ زدہ شکل وصورت ـــــ تمام چہرے پر صرف آنکھیں اور منہ نظر آتا ہے۔ اوہ! بالکل دیوانہ! تم اس کی باتیں سنتے!

آواز۔ (قریب سے) واؤ و! •

عبداللہ۔ باآ آ، ناصر؟ جلال سے کہو اکبر واپس آگیا ہے۔"

(ناصر اور اکرم داخل ہوتے ہیں)

اکرم۔ سناؤ، کچھ قسمت نے یاوری کی؟

اکبر۔ ارے بھیڑیا کہاں ہے۔ اسے جلدی بلاؤ، مجھے اس سے ضروری کام ہے۔

(جلال ظاہر ہوتا ہے، مضبوط جسم اور وحشیانہ بانکپن کا حامل۔ کانوں میں مرکیاں اور گلے میں اشرفیوں کا ہار پہنے ہوئے۔ چٹان پر کھڑا ہو کر شہر کی طرف دیکھتا ہے)

ناصر۔ لو! اپنے پیچھے دیکھو، بھائی!

جلال۔ ذلیل کیڑو! دیکھنا ان کی طرف! لعنت، لعنت ہو تم پر!

اکبر۔ سردار! دیکھو، عقلمند بھیڑیا بننے کی کوشش کرو۔

جلال۔ ارے؟ یہ کون ہے؟

اکبر۔ "پاگل"۔ اس کے متعلق مجھے اتنا ہی معلوم ہے۔

عبداللہ۔ یہ مبارک ہے، مُلا!

(ایک ہموار سی چٹان پر بیٹھ کر تمام ڈاکو اکبر کے مالِ غنیمت کو تقسیم کرتے ہیں)

جلال۔ کیا دیوانگی اُسے اِدھر لا رہی ہے؟

اکبر۔ ہاں، سردار وہ تمہیں گرفتار کرنے آرہا ہے۔ اس نے تمام شہر کو اکٹھا کر کے قسم کھائی ہے۔ اور جس بلند آہنگی سے وہ بول رہا تھا تم تک بھی پہنچنی چاہیئے تھی۔

جلال۔ ہاں، ہاں اکبر! اپنی بکواس کو مختصر کرو اور جلدی بتاؤ۔

اکبر۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں سردار! وہ آب زمزم لئے آرہا ہے جس سے تم پر خوف طاری کر دے گا پہلے تمہیں اندھا کرے گا، پھر بہرا کرے گا، پھر تمہاری عقل سلب کرے گا اور جب تمہارے تمام حواس سلب کر کے تمہیں قابو میں کرے گا۔ تو تمہارے ٹکڑے اڑا دے گا۔ تمہیں ایک تھیلے میں ڈال لے گا۔ تمہارے گوشت کو نمک لگائے گا اور شہر میں لے جا کر اذان دے گا اُس نے لوگوں سے کہا تھا "تم اذان دینا" پھر وہ ایک دعوت کریں گے اور مزے لے لے کر تمہیں کھائیں گے۔

جلال۔ کمینے چور! تم نشہ پی کر آئے ہو!

اکبر۔ میں کمینہ چور ہوں؟ ہاں میں نے بھنگ پی تھی ـــــ لیکن میرے کان کھلے تھے، اور اگر میں بھنگ نہ پیتا تو یہ خبریں تم تک نہ پہنچ سکتیں۔ جہاں میں نے بھنگ پی اسی قہوہ خانے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور جو کچھ میں نے کہا ہے سچ ہے۔ اور سنو بڈھے "واؤ و، واؤ و!" یہی تمہارا حشر ہونے والا ہے، جو میں بتا چکا ہوں۔

جلال۔ (غصے سے) کھڑے ہو جاؤ، ہاتھ اٹھاؤ!!

(اکبر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اس کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے)

اب جو کچھ باقی ہے اُگل ڈالو، بولو!

اکبر۔ (خوف سے ہکلاتے ہوئے) سردار، جو کچھ میں نے بیان کیا ہے بالکل حقیقت ہے اور اس کے عین مطابق جو کچھ میں نے سنا، اور اس کے بعد مُلا خود بازار میں آگیا اور کہنے . . . (رکتا ہے)

جلال۔ کہنے لگا، ہاں، ہاں، کیا کہنے لگا؟

اکبر۔ میں ـــ میں نہیں جانتا، سردار! مجھے تمام باتیں بھول گئی ہیں وہ بڑی دیوانگی کی باتیں کرتا تھا۔ کوئی عقلمند آدمی کس طرح ان باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ کچھ اس طرح تھا۔ "ہمارا بھائی بھیڑیا" اور "ہمارا بھائی بھیڑیا" اور اگر تم اسے کھانے کی کوشش کرو گے تو وہ تمہیں پھاڑ کھائے گا۔ لیکن ہم اسے قابو کر لیں گے، اور پھر وہ کسی کو گزند نہ پہنچا سکے گا" اور لوگوں کا ایک انبوہ اس کے گرد کھڑا ہوا ہنس رہا تھا اور چیخیں مار رہا تھا، بے وقوفوں کے ایک گروہ کی طرح اور وہ اُن سے کہہ رہا

تھا کہ اگر میں اسے قابو کر کے دست بستہ لے آؤں تو کیا تم لوگ اسے میرے حوالے کر دو گے تاکہ جیسا میں چاہوں اس کے ساتھ برتاؤ کروں؟ اور وہ سب کہتے تھے "ہاں ہاں" اور پھر اس نے کہا اُس کی جان میرے حوالے کر دو۔ تم امن میں رہو گے"
وہ سب رضامند ہو گئے اور ــــ (رک جاتا ہے) بس اتنی ہی بات تھی سردار! کیونکہ اس وقت میرا قبیلہ بکھر گیا اور مصلحت اسی میں تھی کہ میں رفوچکر ہو جاؤں۔

جلال۔ چہ خوب! قابو میں اور "دست بستہ" اور میری جان لیں گے؟

ناصر۔ سردار! تم نے بھی تو ان کی بے شمار جانیں لی ہیں۔

جلال۔ اور زیادہ لوں گا اندھی چمگادڑو! (گھونسہ تان کر شہر کی طرف ہلاتا ہے) ذرا صبر کرو اور میرے بچوں کو جوان ہونے دو! . . . عبداللہ! اپنے پہرے پر کھڑے ہو جاؤ!

(عبداللہ بھیڑیے کی کھال پہن لیتا ہے اور اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے)

اکبر۔ جلال! وہ تم سے بہت ڈرتے ہیں۔

جلال۔ یہ ان کے لئے اچھی بات ہے۔

اکبر۔ اب کوئی شخص اکیلے دکیلے اور بغیر ہتھیار کے شہر سے باہر نہیں نکلتا۔

جلال۔ اس کے باوجود وہ میرے قہر و غضب سے محفوظ نہیں۔

ناصر۔ اور نہ اُن کے بھیڑوں کے گلّے۔

اکبر۔ اور اگر تم کسانوں کو اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں اور بکریوں کا ذکر کرتے سنو، ایک کی بجائے وہ دس کی تہمت لگاتے ہیں اور اب جبکہ ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، انہوں نے ہماری تعداد کا اندازہ پچاس لگا رکھا ہے۔

جلال۔ اور ہم انہیں پچاس ہی بن کر دکھائیں گے۔ اوہ، کتو، کتو! مجھے اپنا غول اکٹھا کر لینے دو، میں تمہیں حقیقی کتوں کی طرح بھونکنے پر مجبور کر دوں گا۔

تمام۔ باقی کہاں ہیں؟ سردار ہمارے باقی دوست کہاں ہیں؟

جلال۔ وہ آ رہے ہیں، آ رہے ہیں بھائیو، صبر کرو۔ تم پہلے آ گئے ہو وہ بھی تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ پھر ہم خون پئیں گے!

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ اور آگ اور تلوار لے کر چڑھیں گے۔

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ اور چشم زدن میں غزنی، آشوب زدہ آنکھوں اور بے چھت کی دیواروں کے ساتھ خوفناک تاریکی میں چمک رہا ہوگا۔

سب۔ غزنی، غزنی کو تباہ کر دو، واؤو، واؤو!

جلال۔ لوگو سنو، تم نے مجھے مارا، تم نے مجھے سنگسار کیا، تم نے مجھے پھینک دیا۔ ہاں تم نے مجھے جانوروں کی طرح شکار کیا۔ میں نے انصاف کے لئے درخواست کی تم نے انکار کر دیا۔ تم نے میرا مضحکہ اڑایا۔ تم سنتے ہی نہ تھے۔

سب۔ آووو، واؤو، واؤو۔

(جلال اپنا خنجر بے نیام کر لیتا ہے)

جلال۔ میں نے جھونپڑ کے گھر کو اس کے اوپر جلا دیا۔ میں اپنے تیز دانتوں کے ساتھ کاٹتا ہوا ان کے درمیان جا پہنچا۔ "بھیڑیا، بھیڑیا" چلاتے ہوئے لوگ جاگ اٹھے اور میرے تعاقب میں دوڑے۔

سب۔ واؤو، واؤو، واؤو، واؤو۔

جلال۔ انہوں نے دروازے بند کر دیئے لیکن میں دیوار پھاند کر باہر جا چکا تھا۔ "بھیڑیا، بھیڑیا" وہ چلاتے رہے، لیکن اب موقع نکل چکا تھا میں باہر نکل گیا تھا اور آزاد تھا۔

سب۔ واؤو، واؤو۔

جلال۔ پھر تم آ گئے، بھائیو۔ کیونکہ تمہارے ساتھ بھی انہوں نے برا سلوک کیا تھا اور اب ہم نے مل کر انہیں ڈرنا سکھایا ہے۔ چیخو، چیخو، انہیں بھیڑیئے کی آواز سننے دو!

سب۔ واؤو، واؤو!

جلال۔ کتے!

عبداللہ۔ آآآ (اس آواز سے سب چونکتے ہو جاتے ہیں اور جلال چٹان پر چڑھ کر دیکھتا ہے)

جلال۔ ہٹو، ہٹو، سب اوٹ میں ہو جاؤ۔

(تمام ڈاکو غائب ہو جاتے ہیں۔ جلال اور ناصر غار میں داخل ہو جاتے ہیں اکبر ایک درخت کی جڑوں میں اور اکرم ایک چٹان کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ عبداللہ اپنی کھال میں لپٹا پڑا ہے۔ مقابل کی اوٹ کے پیچھے عباس ایک تھیلا اٹھائے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

عباس۔ اتنا تیز نہ چلو چچا، خدا کے لئے اتنا تیز نہ چلو۔

مبارک۔ تم [illegible] ہو بھائی؟

عباس۔ نہیں بابا تھکا تو نہیں۔ لیکن یہ جگہ جہاں ہم آئے ہیں اچھی نہیں ہے۔

مبارک۔ کیوں بیٹا؟

عباس۔ میرا مطلب ہے، تاریک ہے۔

مبارک۔ ابھی آگے اور زیادہ تاریکی ہے بیٹا۔

عباس۔ ہاں، اور بابا ناہموار پتھر جن سے ٹھوکر لگنے کا امکان ہے اور گڑھے گرنے کے لئے اور پانی کے دھارے ڈبانے کے لئے اور غار ——— (وہ مڑ کر مبارک کی طرف دیکھتا ہے جو غار میں داخل ہو رہا ہے) اوہ! خدا کے لئے بابا اس کے اندر نہ جانا اس کے اندر کوئی ہے۔

مبارک۔ میرا بھائی ہے پانی۔ اگر وہ مجھ سے نہیں ڈرتا تو میں اس سے کیوں ڈروں؟

عباس۔ لیکن بابا وہ بھی تو اپنی پوری قوت سے دوڑتا ہوا باہر آرہا ہے

مبارک۔ وہ رحمدل ہے بیٹا، اور وہ ہمارے ہی خیال سے دوڑتا ہوا آرہا ہے کیونکہ ہم پیاسے ہیں۔

(جھک کر پانی پیتے ہیں)

عباس۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) لیکن بابا اس میں تو خون ہے (ایک بھاری پتھر اور اس کے بعد کنکر اوپر سے گرتے ہیں) اوخدایا، یہ کیا؟

مبارک۔ آؤ بیٹا پانی پیو۔ یہ پانی ٹھنڈا اور صاف ہے۔ نہیں ضرور تفریح ہوگی۔ اس کے بعد شاید نہیں نہ ملے۔

عباس۔ کیا ہم اور آگے جائیں گے؟ آگے؟ ہم آگے کیوں جائیں گے بابا؟

مبارک۔ اپنے بھائی بھیڑیے کو ڈھونڈنے۔

عباس۔ خدا ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اس فیصلے میں کیا ہے بابا؟

مبارک۔ کھانا میرے بیٹے! اور دودھ اور ٹکڑے۔

(وہ ایک سطح چٹان پر کھانا رکھ دیتا ہے۔ جلال اور ناصر غار کے منہ پر نمودار ہوتے ہیں۔ باقی ڈاکو سننے کے لئے آہستہ سے اپنے ہاتھ کانوں تک لے جاتے ہیں)

عباس۔ ڈاکو کو ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟

مبارک۔ اس کے جسم کے لئے اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

عباس۔ میں تم سے متفق نہیں ہوں بابا۔ اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، وہ خون، خوف، جبر اور ظلم جیسی چیزوں کا شیدا ہے۔ وہ انسانوں کو گرفتار کرتا ہے وہ ان کی کھال ادھیڑتا ہے، ان کے دانت نکالتا ہے، ان کے کان کاٹتا ہے اور ان کے دل پھاڑ نکالتا ہے۔ اوہ!

مبارک۔ میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کروں گا۔

عباس۔ تم، بابا!

مبارک۔ آج دن ڈوبنے سے پہلے تم بھائی جلال کو گرفتار پاؤ گے۔ ہاں، میں اس کی کھال اتار دوں گا، اور اس کے دانت مجھے کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے۔ میں اس کے ناک اور کان پکڑ لوں گا اور اس کا دل باہر نکال دوں گا۔

(یہ سن کر جلال اور اس کے ساتھی دانت پیستے ہیں۔ وہ مبارک کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں جو عباس سے تھیلے کر کھانا چن رہا ہے۔ وہ آرام لینے کے لئے چٹان پر بیٹھ جاتے ہیں)

عباس۔ اچھا بابا، اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو ہم جلد ہی رسیوں سے لٹک رہے ہوں گے۔

مبارک۔ عباس تم ایک بھیڑیے کو بھیڑ کی شکل میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھو گے۔

اکبر۔ ہا آ آ آ

عباس۔ دیکھو بابا، ایک سمجھدار بھیڑ تمہاری بات کا جواب دے رہی ہے

(مبارک روٹی، دودھ اور گوشت چٹان پر چن دیتا ہے)

مبارک۔ دیکھو بیٹا، کیا یہ پُرتکلف دعوت نہیں ہے؟ کیا اسے دیکھ کر ہمارے بھائی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے گا؟

(جلال کھانے کی طرف دیکھتا بھی نہیں)

عباس۔ اس کی کیا حقیقت ہے بابا۔ وہ تو سفر پر جاکر ڈاکہ ڈال کر یہ کیا، اس سے بھی اچھی نعمتیں حاصل کر سکتا ہے۔

مبارک۔ میرا بھیڑیا بھائی بے وقوف نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکہ ڈالتے وقت اس کا دل نہیں دکھتا؟ انسان اگر خود دھتکارا ہوا نہ ہو تو وہ دوسرے سے کبھی نہیں چھینتا۔

عباس۔ صحیح ہے بابا۔ میں بھی کسی سے نہیں چھینتا۔

مبارک۔ اور کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں تم سے بھی زیادہ بے وقوف کوئی ہستی ہے؟ بھائی بھیڑیے کی بھی آنکھیں میری تمہاری طرح ہیں، کیا

وہ تاریکی کے مقابلے میں روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے بھی کان ہیں، کیا اسے طعن و تشنیع کے مقابلے میں محبت بھرے الفاظ بھلے معلوم نہیں ہوتے، اس کا ایک دل بھی ہے بیٹا، کیا وہ دُکھ دینے کے مقابلے میں رحم دلی کو تفوق نہ دے گا؟ اگر اس کے پاس اپنے لئے کافی خوراک ہوتی تو کیا وہ تم سے چھیننے کی کوشش کبھی کرتا؟

عباس۔ کیا معلوم بابا۔

مبارک۔ کیوں نہیں۔ اگر کوئی ڈاکو ہو تو لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔ تنہائی اسے دُکھ دیتی ہے — لوگ اسے مارنے دوڑتے ہیں۔ اسے بھاگنا اور چھپنا پڑتا ہے وہ تنہا رہ جاتا ہے اور بے گھر ہو کر اس کا کوئی رشتہ دار، عزیز یا دوست نہیں رہتا۔ جس کی وہ کچھ خدمت کر سکے اور اگر یہ نعمت تمہارے پاس نہ ہو تو پھر وہ تمام دولت جو دوسروں سے جبراً چھینی گئی ہو کس کام کی؟

عباس۔ بابا میرا بھی کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں لیکن میرے پاس دولت بھی نہیں۔

مبارک۔ تمہارے تو خزانے بھرے ہیں بیٹا، رحم و کرم کے خزانے۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے تم دیتے ہو۔ اپنے بھیڑیے بھائی کو بھی دو اور اس پر رحم کرو۔ دیکھو وہ کس قدر پشیمان ہے۔

(جلال کے زور زور سے دانت پیسنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی جو ذہنی طور پر چند ھیائے ہوئے سے ہیں اپنے طور پر کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے اور اسی کے اتباع میں دانت پیسنے لگ جاتے ہیں)

عباس۔ حقیقت کو چھپانے سے کیا فایدہ؟ بابا!

مبارک۔ کچھ بھی نہیں بیٹا۔

عباس۔ کیا میں اپنے خیال کو صاف صاف بیان کر دوں؟

مبارک۔ ضرور، بیٹا!

عباس۔ تمہارے جذبات خواہ کتنے ہی پاکیزہ ہوں بابا، لیکن ان میں ایک دیوانہ پن ضرور ہے، اور اس کا کوئی علاج میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے دعائیں مانگیں، بابا کئی دفعہ خدا سے التجائیں کیں کہ تمہارے عقل و حواس تمہیں واپس دے دے لیکن انہیں شرف قبولیت حاصل ہونے کے بجائے میرے حواس بھی چھین لئے گئے اور اب ہم دونوں، جن میں مچھر پکڑنے تک کا وقوف بھی نہیں —— ایک ڈاکو کو پکڑنے آئے ہیں اور اگر میرے عقل و خرد کلیتہً زائل نہیں ہو گئے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس وقت ہم خطرے میں ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ صرف میرے منہ پھیر کر دیکھنے کی دیر ہے اور سامنے کوئی کھڑا ہو گا۔

مبارک۔ بیٹا عباس، میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔

عباس۔ ہاں، بابا!

مبارک۔ ایک شاہین کا بچہ زخمی ہو کر اپنے گھونسلے سے نیچے گر پڑا وہ اڑ بھی نہ سکتا تھا۔ جب میں نے اُسے ہاتھ میں اٹھایا تو اس نے میرے ہاتھ کو کاٹ کر خون نکال دیا۔ میں نے اُسے مارا نہیں کیونکہ وہ مجبور تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ ہاں، اس کی چونچ بہت ہی تیز تھی۔

عباس۔ مجھے یاد ہے وہ نہایت خوب صورت پرندہ تھا اور تمہارے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔

مبارک۔ میں نے اس کے لئے ایک گھونسلہ بنایا اور اس کے لئے خوراک لے آیا۔ ہاں بیٹا، وہ چوہے، گوشت اور مرے ہوئے کیڑے کھایا کرتا تھا اور جب اسے اور کچھ نہ ملتا تو وہ میرا گوشت کھانا شروع کر دیتا اور اگرچہ میرا گوشت اسے پسند تھا لیکن میری ذات کے لئے اس کے دل میں کوئی محبت نہ تھی۔ چنانچہ جب اس کے بازو کا زخم مندمل ہو گیا اور وہ اڑنے کے قابل ہو گیا تو فوراً رخصت ہو گیا۔

عباس۔ نابکار پرندہ!

مبارک۔ شاہین، شاہین ہوتا ہے بیٹا۔ جب خدا شاہین کی تخلیق کر رہا تھا اُس وقت انسان اس کے پیش نظر نہ تھے اور جب وہ بھیڑیے پیدا کرنے لگا تو اُس وقت بھی اس نے انسانی جذبات کو مدِنظر نہیں رکھا اور یقین رکھو کہ بھیڑیا کبھی انسان نہ بنے گا تو پھر انسان کس طرح بھیڑیا بن سکتا ہے۔

عباس۔ لیکن بابا شاہین نے بُرا کیا، تم نے تو اس کی جان بچائی تھی۔

مبارک۔ اسی طرح خدا نے مجھے بھی بچایا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں۔ اب جس طرح وہ محبت کے باوجود ہم پر ہماری بیچارگی واضح کرتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کی بے چارگی بھی ظاہر کرتا ہے اور اگر میں نے اس شاہین سے محبت

کی، اس کے باوجود کہ وہ میرا گوشت کاٹ کھاتا تھا کیا میں اپنے بھائی بھیڑیے سے محبت نہ کرونگا؟

(یہ تمام باتیں جلال اور اس کے ساتھیوں کے فہم سے بالاتر ہیں لیکن چونکہ وہ اس کا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ جلال اشارہ کرتا ہے اور خادم ڈاکو ہاتھوں میں رسیاں لئے ہوئے اپنے شکار سے نزدیک تر ہو جاتے ہیں لیکن مبارک اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتا ہے)

ہاں۔ خواہ وہ مجھے رسیوں سے جکڑ لے اور میرے دانت نکال دے اور خواہ وہ میری کھال ——

(عباس ڈاکوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو مبارک پر یک دم حملہ کیا چاہتے ہیں)

عباس۔ بابا! بابا!!

مبارک۔ خواہ میرے کان کاٹ لے اور میری زبان کھینچ لے اور میری آنکھیں ——

(جلال کے ایک اشارے پر ڈاکو یکدم ٹوٹ پڑتے ہیں اور انہیں رسیوں سے جکڑ لیتے ہیں۔ عباس بتقاضائے فطرت کچھ جارحانہ جنبش کرتا ہے لیکن مبارک بلا اظہار تعجب اسے قبول کرتا ہے)

مبارک۔ تم ہو بھائی بھیڑیے؟

جلال۔ ہاں، ملانے! میرے دانت تمہارے گوشت میں پیوست ہیں اور تم نہایت عمدگی سے جکڑے ہوئے ہو۔

مبارک۔ تم نے ابتدا تو بہت اچھی کی ہے۔ ذرا ٹھیرو! دیکھو عباس، بھائی بھیڑیا اپنے دانت میرے گوشت میں پیوست کر چکا ہے اور تمہارے میں بھی اور اس کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے پرخچے اڑا دے گا لیکن اس کے باوجود ہم اس سے محبت کریں گے اور وہ ہمیں اپنے سخت سے سخت برتاؤ کے باوجود بھی محبت سے باز نہیں رکھ سکتا۔

جلال۔ (خنجر نکالتے ہوئے) اور اگر میں تمہیں قتل کر دوں؟ پھر؟

عباس۔ بابا، خدا کے لئے قرآن کی آیات پڑھئے۔ یہ ہمیں مارنے لگے ہیں

(ڈاکو عباس کو دو تین مکے رسید کر کے خاموش کر دیتے ہیں)

مبارک۔ بھائی تم بھیڑیے سے بہت کچھ مماثلت رکھتے ہو لیکن بھیڑیا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہوتا۔

جلال بے وقوف بڈھے، خاموش۔

مبارک۔ خدا تمہیں خوش رکھے بھائی!

جلال۔ (عباس کی طرف مخاطب ہو کر) کیا یہ شخص پاگل ہے؟

عباس۔ ہاں بھائی، مجھ سے بھی زیادہ پاگل۔ مجھے تو کبھی کبھی دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے لیکن یہ آٹھوں پہر یکساں رہتا ہے۔

مبارک۔ تمہارے چہرے سے کس قدر رحمدلی ٹپکتی ہے۔ تمہارا اصلی نام کیا ہے، بھائی!

(جلال اور چڑ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے)

عباس۔ (مبارک کی مثال سے حوصلہ پکڑتے ہوئے) بھائی بھیڑیے، اسے کاٹو، اور کاٹو! یہ تم سے اور زیادہ محبت کرے گا۔

جلال۔ چپ رہو، ورنہ میں تمہاری زبان کاٹ لوں گا۔

مبارک۔ بھائی پہلے میری زبان کاٹو، یہ اُس سے زیادہ لمبی ہے اور جتنی زیادہ کاٹو گے۔ تمہارے لئے اتنا ہی مفید ہوگا۔

جلال۔ یہ شخص صحیح الدماغ معلوم نہیں ہوتے۔

عباس۔ (یقین دلاتے ہوئے) ہاں بھائی ہم دیوانے ہیں۔

مبارک۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا دل پہلے حاصل کر لو۔ میری ہڈیوں پر کافی گوشت نہیں ہے لیکن میرا دل گداز ہے۔

ناصر۔ سردار، یہ لوگ تمہارا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

جلال۔ ممکن ہے۔ لیکن ذرا صبر کرو، میں ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ ہاں جی، تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟

مبارک۔ وہ سامنے نیچے سے —— غزنی سے۔

جلال۔ کیوں؟

مبارک۔ تم سے ملنے کے لئے بھائی۔

جلال۔ کس غرض سے؟

مبارک۔ تمہاری مدد کے لئے کیونکہ تم دکھ میں ہو۔

جلال۔ (اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے) اچھا!

مبارک۔ تمہارے جسم کے لئے (جو ایک حقیر سی چیز ہے) کھانا لایا ہوں۔

اکبر۔ سردار ہوشیار رہنا۔ اس نے کھانے پر جادو کر رکھا ہے۔

مبارک۔ تمہاری روح کے لئے جو ایک عظیم الشان چیز ہے! آہ بھائی، تمہاری روح، تمہاری روح خطرے میں ہے

اکبر۔ اور تمہاری زندگی بھی۔

(اپنا خنجر بلند کرتا ہے)

مبارک۔ بھائی بھیڑیے تمہارے اعمال اچھے نہیں۔ تم نے بہت ظلم کئے

ہیں۔

(اکبر حیرت زدہ ساہو کر اپنا خنجر جھکا لیتا ہے)

ملزم کرو بھائی ۔ملزم کرو۔

ناصر۔ سردار، اسے قتل کیوں نہیں کرتے؟

اکبر۔ خاموش، ناصر!

مبارک۔ تم نے بے دریغ ظلم کئے ہیں اور خون کی ندیاں بہائی ہیں۔ تم نے لوگوں کے مال چھین لئے اور اُن کی بستیوں کو نذر آتش کیا ہے، تم نے ہر چیز کو پامال اور ضائع کر دیا اور وہ نعمتیں جو خدا نے تمہیں عطا کیں تم نے بے پروائی سے ٹھکرا دیں۔

جلال۔ خدا نے مجھے نعمتیں عطا کیں؟

مبارک۔ کیا اس نے تمہیں دل جیسی نعمت عطا نہیں کی، اور آنکھیں اور دماغ۔ کیا اس نے تمہیں رحم وکرم اور عقل عطا نہیں کی؟ کیا اس نے تمہیں بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے قوت عطا نہیں کی اور اس کے بجائے ـــــ تمہارے دل میں نفرت ہے، تمہاری آنکھوں میں کوری ہے۔ تمہارے دماغ میں جہنم جل رہا ہے اور تمہارے ہاتھ خون سے آلودہ ہیں اور کیا اس تمام دکھ میں تمہیں دیکھ کر میرا دل رنجیدہ نہ ہو؟

جلال۔ ملا، تم کتنے نڈر ہو، کیا تمہیں جان کا خوف بھی نہیں؟

مبارک۔ اپنے بجائے تمہاری جان کا خوف ہے بھائی، تمہارے سامنے گڑھا ہے اور اس میں آگ جل رہی ہے اور اس کے شعلے اُس روح کو لپیٹ رہے ہیں جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ آہ بھائی یہ آتشیں گڑھا اپنا خوفناک منہ کھولے ہوئے جہاں کہیں تم جاتے ہو تمہارے پیچھے پیچھے بھاگتا ہے (جلال اور اس کے ساتھی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں) دیکھو اس کے شعلے تمہارے پاؤں کو چھو رہے ہیں، اور اب تمہارے ہاتھوں کو اور اب تمہارے گلے کو اور تمہارے دل کو۔

سب ڈاکو۔ سردار خدا کے لئے ہمیں اس عذاب کے فرشتے سے بچاؤ۔

مبارک۔ اور اب ـــ اور اب ـــ اور اب

(ایک زبردست گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ بلندی سے ایک چٹان ٹوٹ کر گرتی ہے اور اس کے ساتھ کنکروں کا ایک انبار عظیم لڑھکتا ہوا اور اپنے ساتھ درختوں کو اکھیڑ کر بہاتا ہوا غار کے منہ پر سے گذرتا ہے)

سب ڈاکو۔ اوہ، اوہ، اوہ، پہاڑ ہم پر گر رہا ہے۔

(ڈاکو ادھر اُدھر چھپتے پھرتے ہیں۔ عباس، بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ لڑھکتا ہوا مبارک کے قدموں پر آن گرتا ہے، اور کانپ رہا ہے)

عباس۔ بابا، بابا، مجھے اپنے آغوش میں چھپالو ورنہ میں بھی لڑھک جاؤں گا۔

مبارک۔ بیٹا ڈرو نہیں۔ یہ تو صرف میرے بھائی پہاڑ نے اپنے آپ کو ذرا جھنجھوڑا ہے۔

عباس۔ کاش یہ پہاڑ کے بجائے کوئی اور بھائی ہوتا۔ اوہ، پھر وہی طوفان۔

(ایک اور چٹان ٹوٹ کر گرتی ہے، ڈاکو حالتِ اضطرار میں بھاگ نکلتے ہیں لیکن جلال اپنی جگہ پر گھٹنوں کے بل پڑا ہے۔ وہ مبارک کی طرف دیکھ رہا ہے جس کے ساتھ عباس اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے چمٹا ہوا ہے)

مبارک۔ لو ختم ہو گیا بیٹا۔

عباس۔ تو چلو بابا اب ڈاکوؤں کی واپسی سے پہلے بھاگ جائیں۔ میں تمہارے بند کھول دیتا ہوں اور پھر تم میرے کھول دینا۔

مبارک۔ لیکن بیٹا ہم بھاگیں کیوں؟ بھائی بھیڑئیے کو ہماری ضرورت ہے

عباس۔ واقعی بابا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام دانت جھڑ گئے ہیں

(عباس کا اندازہ صحیح نکلتا ہے کیونکہ جلال بڑھ کر دونوں کی رسیاں کاٹ دیتا ہے)

جلال۔ بابا، خدا کے لئے اپنی بددعا مجھ پر سے ہٹا لو اور اپنے قہر وغضب کا مورد مجھے نہ بناؤ۔ میں ابھی مرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

مبارک۔ بھائی میں نے تم پر کون سا غضب نازل کیا ہے۔

جلال۔ تو پھر یہ قیامت کیوں برپا ہوئی؟

مبارک۔ بھائی یہ تو تھوڑی سی مٹی گری ہے۔ مادرِ ارض نے ذرا مٹھی کھولی تھی لیکن پھر اسے رحم آگیا اور اس نے کسی کو گزند نہیں پہنچایا۔

جلال۔ تو پھر یہ کیوں گری۔

مبارک۔ مجھے کیا خبر بھائی۔ آؤ اب اپنے آدمیوں کو بلاؤ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

جلال۔ وہ سب بھاگ گئے ہیں بابا، اب میں اکیلا ہوں۔

مبارک۔ نہیں بھائی تم اکیلے نہیں ہو۔

حلال۔ بابا، تم کس قدر عجیب انسان ہو۔

مبارک۔ میں غزنی کا ایک بے وقوف باشندہ ہوں۔ میرا نام جلال ہے۔ کیا تم نے کبھی میرا نام نہیں سنا۔ لوگ میرا ذکر کرتے ہوئے ہنستے ہیں۔

حلال۔ کیا تم غزنی کے باشندے ہو،

مبارک۔ ہاں غزنی میری مادرِ وطن ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔

حلال۔ میری ماں بھی یہی ہے لیکن اس نے مجھے باہر نکال دیا۔ اس نے میرے لئے انصاف کے دروازے بند کر دئیے، اس نے میرے ہی گھر میں مجھے لوٹ لیا، بازاروں میں میرا مضحکہ اڑایا، گلیوں میں مجھ پر پتھر پھینکے، اس نے مجھ پر لعنت اور نفرین بھیجی اور پھر میرے قتل کے درپے ہو گئی اور اب کیا میں اپنا انتقام نہ لوں؟

مبارک۔ ہاں پوری طرح انتقام لو بھائی —— رحم و کرم کے ذریعے سے!

حلال۔ میں رحم کروں؟

(حیرت سے اس پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے)

مبارک۔ ادھر آؤ بھائی، میرے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھو کیا وہ حسین نہیں ہے؟

(حلال دیکھتا ہے لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک نفرت اور غصہ ٹپک رہا ہے۔ اس کا ہاتھ خنجر کے قبضے پہ ہے)

اس کے چہرے کی طرف دیکھو۔ وہ سورج کی روشنی میں تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کے میناروں کی طرف دیکھو جو چوکیداروں کی طرح اس کی دیواروں پہ کھڑے ہیں، اور اس کے چھت جو پروں کی طرح اس پر چھائے ہوئے ہیں اور اس کی کھڑکیاں متعدد آنکھوں کی طرح، اس کے کان بھی ہیں، اور ہاتھ اور پاؤں اور ان سب کے علاوہ اس کا ایک دل بھی ہے اور اس دل میں تمہارا خوف۔ وہ نیچے دیکھو، گلیاں، دروازے اور بازار اور گھر امیر اور غریب دونوں کے لئے۔ اور ان گھروں میں مردوں کی آواز کی موسیقی اور بچوں کے قہقہے گونج رہے ہیں اور پھر آنسو، غمناک چیخیں اور غصہ۔ لیکن اس کے حسن کو دوبالا کرنے والا غم و غصہ نہیں اور نہ ان پر اس کے میناروں کی طاقت منحصر ہے اور تمہارا خوف اس کے دل کو سرد نہیں کر سکتا۔

آؤ بھائی میرے دل کے ساتھ اپنے دل کو بھی اس شہر میں بھیجو۔ اس مکان میں ایک عورت ہے جو اپنے ننھے بچے کو دودھ پلا رہی ہے، بچہ اپنی ماں سے محبت کرتا ہے اگرچہ وہ اس بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ایک مکان ہے جس میں ایک نوجوان اپنی دلہن کو لایا ہے۔ وہ دروازہ بند کر کے مڑتا اور اپنی دلہن کا منہ چوم لیتا ہے۔ ان کے لبوں پر محبت کی چاشنی کتنی شیریں ہے اس مکان میں ایک آدمی بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔ وہ کسی وقت تنومند اور رہا دربھا لیکن اب کمزور اور بے چارہ ہے اس نے اپنے ہاتھوں سے کئی افعال کئے۔ اکثر بُرے لیکن کبھی کبھی اچھے۔ اب موت آپہنچی ہے مگر اُسے کچھ نہیں سوجھتا لیکن اس کے اچھے اعمال اسے کسی قدر تسلی دے رہے ہیں۔

(حلال کے چہرے پر رحم کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں اور اس کا ہاتھ خنجر کے قبضے سے علیحدہ ہو جاتا ہے)

لیکن اس کے دل میں نفرت کے بجائے محبت تھی اس لئے وہ تنہا نہیں ہے۔

(مبارک اپنا ہاتھ جلال کے سینے پر رکھ دیتا ہے)

آہ۔ بھائی تیرے دل کو کون سی چیز حرکت دے رہی ہے کہ یہ اچھل رہا ہے۔ آ میں تجھے بتاؤں —— ایک شخص ایک دفعہ بلندی پر کھڑا ہوا شہر کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس شہر میں بہت سے گناہ ہوئے تھے۔ اس شخص کے ساتھ خدا کا ایک فرشتہ بھی کھڑا تھا جو شہر پر عذاب نازل کرنے آیا تھا۔ اس نے فرشتے سے کہا "اگر اس شہر میں صرف پچاس نکوکار مل جائیں تو کیا تم پچاس کے لئے درگذر نہ کرو گے؟" اس نے کہا "ہاں میں پچاس کے لئے معاف کر دوں گا۔" پھر اس نے کہا "اور اگر اس میں سے پانچ کم ہوئے تو؟" "تو میں پانچ کی کمی کے لئے شہر کو برباد نہ کروں گا" "اور اگر چالیس ہی ہوئے تو؟" "تو میں دس کی کمی کے لئے تباہ نہ کروں گا۔" "اور اگر تیس ہی نکلے تو؟" "تب بھی نہیں" فرشتے نے کہا۔ "اور اگر بیس ہی نکلے تو؟" "تو بیس کے لئے بھی معاف کر دوں گا۔"

(حلال اپنی کمر سے خنجر اتارتا ہے)

پھر اس نے کہا "خدا بڑا ہی رحیم و کریم ہے، مجھے ایک دفعہ اور کہنے دو کہ اگر دس آدمی نکوکار نکل آئیں؟" فرشتے نے کہا "میں دس کے لئے بھی عذاب نازل نہ کروں گا۔"

(جلال کی بیٹی اور خنجر زمین پر گر جاتا ہے۔ عباس دبی آواز میں دعائیں کر رہا ہے)

بھائی بھیڑیے تم گناہ گار ہو، میں بھی گناہگار ہوں — کیا اتنے گناہوں کے باوجود تم دوسروں کے گناہ معاف نہیں کر سکتے۔ دیکھو خدا بے گناہ ہونے کے باوجود دوسروں سے درگذر کرتا ہے۔

(جلال دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتا ہے — دور سے اذانوں کی آواز آتی ہے)

عباس۔ سنو بابا! اذان کی آواز آتی ہے۔

مبارک۔ ہاں، ہاں غزنی میں اذانیں دی جا رہی ہیں۔ تمہارے لئے۔ آؤ میں تمہیں دس آدمی اس شہر میں ایسے دکھاؤں گا جو تمہارا خوف اٹھ جانے سے خوش ہوں گے، دس نہیں، بیس، چالیس، پچاس، سو . . . بھائی بھیڑیے!

(جلال سسکیاں لیتا ہوا اپنے ہاتھ مبارک کی طرف اٹھاتا ہے)

جلال۔ میں اندھا ہوں بابا، مجھے راستہ دکھاؤ — میری زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا، ہاں، ہاں جاؤں گا۔

عباس۔ بابا میں کتنا بے وقوف ہوں۔ میں یہاں آتے ہوئے ڈرتا تھا۔

(مبارک خاموشی سے سنتا ہے اور کچھ جواب نہیں دے سکتا)

مظفر احمد

شعر

آپ کا اعتبار کون کرے
رات دن انتظار کون کرے

کون؟

شمیم زلف معنبر سنگھا رہا ہے کون؟
یہ جسم و روح کو بے خود بنا رہا ہے کون؟
یہ شکل نور مرے دل میں آ رہا ہے کون!
سیاہ خانے کو ایمن بنا رہا ہے کون؟
دل و دماغ میں میرے سما رہا ہے کون؟
حواس و ہوش پہ قبضہ جما رہا ہے کون؟
یہ میری لاش پہ پھر مسکرا رہا ہے کون!
یہ میرے جسم میں پھر جان لا رہا ہے کون؟
یہ کس کا درد مجھے بے قرار رکھتا ہے
یہ میرے سینے میں نشتر چبھا رہا ہے کون!
الٰہی شب کی سکوں آفریں خموشی میں
یہ بار بار تصور میں آ رہا ہے کون؟
جو تھک کے بیٹھ گیا ہوں رہِ محبت میں
تو میرے عزم کو ہمت دلا رہا ہے کون
یہ اپنی دشمن صبر و سکون نگاہوں سے
دل و دماغ پہ بجلی گرا رہا ہے کون
یہ کون نظم میں شاہد کی کیف بھرتا ہے
یہ شعر بن کے تخیل میں آ رہا ہے کون!

شاہد رام پوری

مناظرِ فطرت

برسات

برسات کی دلفریبیاں عام ہوئیں
سورج کی گردشیں بھی ناکام ہوئیں
بادل کبھی کھل کے کبھی گھر آئے
دن بھر میں کئی صبح کئی شام ہوئیں

بھونرا

بھونرے سے پُر درد راگ گانے آئے
جذبات کے طوفان اٹھانے آئے
کلیوں نے حجاب سے جھکا لی گردن
کس جوش سے دردِ دل سنانے آئے

پپیہا

آئی پھر پی کہاں کی آواز آئی
تسکین ہوئی صدائے دمساز آئی
مجھ کو بھی بری عادتِ فریادِ مدام
اس کی بھی طبیعت نہ کبھی باز آئی

تتلی

نازک خوش رنگ لرزاں ہیں کچھ پھول
نیلے کچھ پھول ارغواں ہیں کچھ پھول
گلزار میں تتلیاں نہیں رقصاں ہیں
آغوشِ نسیم میں رواں ہیں کچھ پھول

جگنو

جگنو یہ نہیں، فلک سے ہے بارشِ نور
یا دوشِ نسیم پر رواں شعلۂ طور
یا ساغرِ ماہ سے ہیں یہ چھلکے قطرے
یا برق کے ذروں سے فضا ہے معمور

کنول

پھولوں سے کنول کے بھر گئے ہیں تالاب
یہ حسن، یہ صبح اور یہ رنگِ شباب
ہاتھوں سے کسی مست کے پھیلا دی ہے
بلور کی پیالیوں میں کچھ سرخ شراب

مور

نظارے کے واسطے ہیں زریں جلوے
یہ روح نواز حسن آگیں جلوے
سائے میں درختوں کے ہیں یہ وصالِ طاؤس
یا ابر میں قوس کے ہیں رنگیں جلوے

ہنس

موجوں پہ ندی کی حکمراں ہوتے ہیں
سینے ملے ہوئے رواں ہوتے ہیں
ہنسوں کی خوشی دید کے قابل ہے جب
جھنکار سے پر کی گہرفشاں ہوتے ہیں

مرزا عباس بیگ

نواب حسین نواز جنگ مرحوم

اور

اُن کی شاعری

نواب حسین نواز جنگ بہادر مرحوم کا نام ان کے والد خان بہادر تاج الدین صاحب مرحوم جج لکھنؤ نے محمدؐ معراج الدین رکھا تھا۔ مگر اُن کے نانا مولوی محمدؐ اکرام اللہ خان المخاطب بہ نواب یار جنگ مرحوم نے حسین یاور خاں نام رکھ دیا۔ اور یہ دونو نام مشہور ہوگئے۔ ابتدائے طغیانی رودِ موسیٰ (۱۹۰۸ء) سے پہلے یہ حیدر آباد آئے تو معراج الدین ہی تھے مگر اس کے بعد جب وطن جا کر دوبارہ حیدر آباد آئے تو حسین یاور خاں رہے۔ چنانچہ اسی نام نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مرحوم کاکوری کے مشہور اور ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے نانا نواب یار جنگ بہادر ابتداءً گورنمنٹ آف انڈیا کے ملازم تھے۔ مگر بعد کو پنشن لے کر حیدر آباد آگئے اور یہاں صوبیداری پر تقرر ہوا۔ مدت تک صوبہ گلبرگہ شریف پر رہے۔ گلبرگہ کی موجودہ آبادی گلزار حوض۔ چاروں کمانیں۔ دو دو تالاب اوّل تعلق داری اور صوبہ داری کا دفتر نواب یار جنگ مرحوم ہی کی حسن توجہ سے بنے ہیں۔

حسین نواز جنگ بہادر کی ولادت بھی لکھنؤ ہی میں ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی۔ فارسی اچھی جانتے تھے۔ عربی بھی پڑھی تھی۔ انگریزی کی استعداد بھی اچھی تھی۔ لکھتے تو بالکل نہ تھے۔ مگر بولتے خوب تھے۔ اردو کے کیا کہنے پہلے تو مادری زبان پھر کاکوری کے ذی علم اور شریف گھرانے کی پیدائش چونکہ کاکوری لکھنؤ ہی کا ایک محلہ کہلا سکتی ہے۔ اس لئے مرحوم کی زبان بالکل لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی۔ مطالعہ کا شوق بہت تھا۔ تفریحی ادب (لائٹ لٹریچر) کا مطالعہ بہت کرتے تھے۔ اخبارات اور رسائل بھی دیکھتے رہتے۔ شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی شعر لکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ ذوق شعر بڑا اچھا تھا۔ خود اتنے اچھے شاعر نہ تھے۔ جتنے اچھے کہ نقاد تھے۔ اساتذہ کے چوٹی کے شعر نوک زباں تھے۔

ابتداءً (۱۹۰۸ء) تحصیلدار ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد مستعفی ہو کر وطن چلے گئے اور پھر دوبارہ ۱۹۱۶ء کے بعد آ کر پھر تحصیلدار ہوئے اور مددگار ناظم کورٹ آف وارڈز بھی رہے۔ اور دوم تعلقدار ہو کر مومن آباد پہنچے چونکہ گلبرگہ سے ایک قسم کا انس تھا اس لئے کوشش کر کے ڈویژن شوراپور پر تبادلہ کرا لیا۔ اور مدت تک وہیں رہے۔ شوراپور کو ممالک محروسۂ سرکارِ عالی کا "ارضِ نغمہ" کہا جائے تو بے جا نہیں۔ "بلدۃ الموسیقی" نہ صرف فردوسِ گوش ہی ہے۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ جنتِ نگاہ بھی ہے۔ اس کی لطافتوں نے مرحوم کو ایسا لبھا لیا کہ گلبرگہ کے اول تعلقدار بھی ہوگئے تو شوراپور سے غافل نہ ہو سکے دورہ کے پروگرام میں شوراپور ہمیشہ نمایاں رہتا تھا اور جب وہاں پہنچتے تو واپسی مشکل ہو جاتی تھی۔ ان کے شاعرانہ جوہر اور لطائفِ طبع کچھ شوراپور ہی میں ظاہر ہوتے اس نغمہ زار میں وہ بُری طرح گم ہو جاتے تھے ——————

چونکہ امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے کھانے۔ کھلانے۔ پہننے پہنانے کا شوق بھی بہت تھا۔ نہائت کم خوراک تھے مگر زبان ذرا چٹوری تھی۔ دو ہی نوالے کھاتے مگر لذیذ سے لذیذ اور عمدہ سے عمدہ۔ دنیا میں ان کے محبوب مشغلے دو ہی تھے۔ "کھانا اور گانا" بہترین کھانے پکواتے۔ خود کھاتے۔ دوسروں کو کھلاتے اور گانا سنتے۔ محض قسم قسم کے کھانے پکوانے اور لوگوں کو مدعو کرنے کی خاطر نیازیں ہوتیں فاتحہ ہوتے۔ بعض دفعہ لوگوں کو کسی نہ کسی نیاز کا نام لے کر مدعو کر لیا جاتا مگر نہ تو نیاز دلوائی جاتی اور نہ فاتحہ۔ نیت ہی کافی سمجھی جاتی تھی۔ ہمیشہ دسترخوان پر دس بارہ آدمی رہتے۔ تنہا کھانے کے عادی نہ تھے۔ اکیلے میں ایک نوالہ بھی ان کے حلق سے نہ اترتا تھا۔ یہی حال گانے کا تھا۔ خود گاتے نہ تھے اور نہ گانا جانتے تھے مگر طبیعت کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ اچھے بُرے کی تمیز فوراً کر لیتے تھے۔ کسی نے گاتے ہوئے ذرا لغزش کی اور انہوں نے ٹوکا۔ اچھی چیز کی داد بھی خوب دیتے تھے۔ اس

خصوصیت کی وجہ سے لوگ انہیں بھی بڑا ماہر موسیقی سمجھتے تھے۔ مگر دراصل ایسا نہ تھا۔ اُردو بڑی اچھی لکھتے تھے اور برداشتہ قلم لکھنے کے عادی تھے۔ مگر لکھنے سے بہت جی چراتے تھے۔ لکھواتے بہت تھے۔ خط بڑا پاکیزہ اور خاصہ پختہ تھا حروف بڑے بڑے اور پھیلا کر لکھا کرتے اور شکستہ خط کے جوڑ پورے لکھتے تھے۔

کپڑوں کا شوق بھی بہت تھا۔ مگر طبیعت شوخ رنگوں کی طرف زیادہ راغب تھی بیل بوٹی اور پھولدار کپڑوں کی رنگین شیروانیاں۔ دھاری دار ریشمی قمیص بہت پہنتے تھے۔ مگر سلوائی کے معاملہ میں کچھ زیادہ شوقین نہ تھے کبھی بہترین درزی کے پاس شیروانیاں سلوائی جاتیں تو کبھی معمولی درزی کے پاس، مگر کپڑوں کے پہننے سے زیادہ تقسیم کرنے کا شوق تھا۔

اپنے ملنے والے دوستوں اور خاص خاص ماتحتوں سے سلوک کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ تحفے دینے کا بھی بہت شوق تھا۔ کتابیں، قلم سگریٹ کیس۔ ڈبیاں۔ پان دان غرض مختلف قسم کے تحائف اپنے احباب اور ماتحتوں کو ہمیشہ دیا کرتے تھے۔

میزبانی کا شوق بھی تھا۔ لوگوں کو بلا بلا کر مہمان رکھتے اور مہمانوں کی ہر قسم کی تکلیف کا خیال رکھتے تھے۔ باہر سے آنے والوں کو گلبرگہ کی مصنوعات اگر بڑیاں مصالحہ۔ اگربتیاں۔ نواڑ، شطرنجیاں وغیرہ منگوا کر ساتھ کر دیتے تھے۔

پان کا شوق کچھ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ پان اور اس کے لوازمات میں خاصا تکلف بلکہ مبالغہ کرتے تھے۔ پان بھی لکھنؤ سے منگوائے جاتے اور قوام اور کتھا بھی لکھنؤ ہی سے آتا۔ دن بھر پان ہی کا شوق ہوتا تھا۔ پندرہ بیس چھوٹے چھوٹے پتلے پانوں کی تین چار گلوریاں۔ آدھی چھٹانک چھالیہ۔ اتنی ہی چکنی ڈلی۔ دس بارہ الائچیاں اور آدھا تولہ مشکی قوام ——— یہ منہ میں ٹھونس لیتے اور تقریباً آدھے گھنٹہ تک چباتے ——— غالباً اسی پان خوری کی وجہ سے تقریباً سامنے کے دانت پورے نکل گئے تھے۔ اس لئے مصنوعی دانت استعمال کرتے تھے۔

طبیعت میں نفاست اور صفائی بہت زیادہ تھی کھانا، کپڑا، مکان ہر چیز نفیس رہتی تھی۔ عطر اور پھول بھی بہت پسند تھے۔ ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا عطر استعمال کرتے تھے، اور عموماً عطر اصغر علی محمد علی کے پاس سے منگوایا کرتے تھے۔

خود تو وقت کے پابند نہ تھے مگر ماتحتوں کو ہمیشہ پابندِ وقت اور چست و چالاک دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے نوجوان ماتحتوں اور ملازموں کا انتخاب کرتے تھے۔

دفتری کام سے تفصیلی طور پر واقف تھے۔ مال کے کام کا تجربہ بھی خاصا تھا۔ مگر لکھنے سے جی چراتے تھے۔ اسی لئے لوگ انہیں ناواقف خیال کرتے تھے۔ صفحوں کے صفحے اور لمبے لمبے فیصلے کہہ کر لکھوایا کرتے تھے۔

اخلاق نہائت اچھے تھے۔ نماز کے پابند نہ تھے۔ مگر پڑھتے رہتے تھے بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت تھی۔ خواجۂ دکن حضرت گیسو دراز کی بارگاہ میں ہر ہفتہ حاضری دیتے تھے۔ ہر مہینے بزرگانِ دین کی نذر و نیاز ہوتی تھی۔ قلندریہ گھرانے میں بیعت تھی، اور اس سلسلہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کیرکٹر نہائت مضبوط تھا، میں نے تین ایک سال تک ماتحتی کی چونکہ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے اور تقریباً تین ساڑھے تین سال تک مجھے مرحوم کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا مگر میں نے ان میں کوئی اخلاقی کمزوری نہیں پائی۔ اپنی وضعداری خاندانی وجاہت اور نسبی وقار کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اور حد درجہ کے پاکباز تھے۔

جہاں اتنی خوبیاں تھیں۔ وہاں چند عیب بھی تھے۔ سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ کانوں کے کچے تھے۔ چونکہ بھولے بھالے سیدھے سادے مسلمان تھے۔ اس لئے ہر ایک پر اعتماد کر لیتے تھے۔ مردم شناسی نام کو نہ تھی۔ آج اس نے اُس کی شکائت کی اُس سے خفا ہو گئے۔ کل اُس نے اس کی شکائت کی اسے نکال باہر کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مستقر کے عہدہ داروں سے اور اُن سے صفائی نہ تھی اور ماتحت اور احباب بھی اس تلوّن اور ہنگامہ پسندی کی وجہ سے مشوش رہتے تھے۔ آخر میں طبیعت بہت زیادہ مائل بہ خوشامد ہو گئی تھی۔ بعض زمانہ سازوں نے جھوٹی شکائتیں اور خوشامد کر کے اس طرح شیشہ میں اتار لیا تھا کہ دنیا بھر سے برائی مول لی۔ آخر میں اُنہی خوشامدیوں نے دغا کی اور انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ قدرت منتقم حقیقی ہے وہ بھلا ایسے لوگوں کو کہاں چین لینے دیتی۔ ایک شخص تو بلدہ آ کر نہائت بُری حالت سے صلح سرائے میں سپردِ اجل ہوا مگر اب بھی دو ایک باقی ہیں۔ خدا اُن پر رحم کرے۔ بہر حال بعض ناسپاس گزاروں نے انہیں خاصا نقصان پہنچایا اور وہ وظیفہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر وطن گئے اور وہاں تقریباً نو سال رہ کر کاکوری ہی میں ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو بعارضہ سکتۂ قلب انتقال کیا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضور بندگانِ عالی متعالی مدظلہٗ سے بڑی عقیدت اور دکن سے بہت محبت تھی۔ آخر وقت تک مجھ سے خط و کتابت رہی، ہر وقت یہی لکھتے کہ قریب میں حیدر آباد آؤں گا۔ ممکن تھا کہ وہ پھر حیدر آباد آتے مگر موت سر پر کھڑی تھی۔ یہ تھے مرحوم کے مختصر حالات۔ اب شاعری کا حال سنئے۔ انہیں بچپن

سے شعر و سخن کا چسکا تھا۔ اور کہتے تھے کہ بچپن ہی میں انہوں نے شاعری شروع کی تھی خسرو تخلص کرتے تھے۔ غزل، قصیدہ، قطعہ سبھی کہتے تھے۔ مگر ان اصناف سخن میں سے غزل ہی ان کی اچھی ہوتی تھی۔ بعض دفعہ فلسفیہ رنگ میں بھی نظم یا غزل کہہ ڈالتے مگر اس میں کوئی خاص بات نہ ہوتی تھی۔ چونکہ طبیعت حاضر اور رگ رگ میں زندہ دلی بھری تھی۔ اس لئے بے اعتدالی بھی کر گزرتے مگر فحش اور پھکڑپن پھر بھی پاس نہیں پھٹکنے پاتا تھا۔ شعر گوئی کا یہ حال تھا کہ بعض دفعہ ایک ایک نشست میں دو دو غزلیں کہہ ڈالتے اور بعض دفعہ مہینوں کچھ نہیں کہتے تھے۔ عروض اور قافیہ پر عبور نہ تھا۔ مگر فطری موزونیت اور اساتذہ کے کلام کے غائر مطالعے اور ذوق کی وجہ سے عروض اور قافیہ کی غلطی شاذ ہی کرتے تھے۔ تین مجلد کتابوں میں غزلیں، قصیدے وغیرہ تھے۔ جنہیں میں نے مدوّن اور مرتب کرکے ایک جگہ دیوان کی صورت میں خوش نویس سے صاف کرا دیا تھا۔ کم و بیش تین ہزار غزلیں دو چار سو قصائد اور ساقی نامے اور مخمس اور مسدس اور ترجیع بند اور قطعات ہوں گے۔ چند فارسی غزلیں بھی تھیں مگر فارسی کلام میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میرے پاس اس وقت مرحوم کی ڈیڑھ دو سو غزلیں ہیں۔ جن میں سے کچھ انتخاب پیش ہے۔ سنا ہے کہ مرحوم کے کوئی عزیز دیوان طبع کرانے والے ہیں۔ خدا کرے اُن کا ارادہ پورا ہو۔ اگر وہ دیوان چھپوانے سے پہلے مجھ سے بھی تبادلۂ خیال کر لیتے تو بہتر تھا۔ مرحوم کے کلام کا معتدبہ حصہ افسوس ہے کہ ناقابلِ اشاعت ہے ———

گو نواب حسین نواز جنگ خسرو لکھنؤ اسکول کے شاعر اور لکھنوی شاعری کے متبع تھے مگر اور شعرائے لکھنؤ کی طرح چولی، انگیا، مسی، دھڑی تک اُن کی شاعری محدود نہ تھی بلکہ شعر میں کچھ وزن بھی ہوتا تھا۔ ان کے تخیل کی وسعت سننے والے کو دعوتِ فکر و تعمق بھی دیتی تھی۔ چنانچہ اس رنگ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

ہر دل کو ہے آرزو تمہاری ✦ ہر پاؤں کو جستجو تمہاری

وہ تو یوں ہی تھے غش بھی ہوئے ہوش آ بھی گیا ✦ ہم تری آنکھ سے گرتے تو سنبھلتے کیونکر

بعض شعر اس قدر بلند کہے ہیں کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

کیا چیز ساتھ لائے ہیں کوئے حبیب سے ✦ ہاتھ آ گئی ہے درد کی دولت نصیب سے

زندگی مجسم امید ہے۔ یہی ایک چیز ہے جو زندگی کا سہارا ہے مگر یہ جب مبدل بہ یاس ہو جاتی ہے۔ تو پھر انسان میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ خسرو کی امید یاس بن کر باقی رہ جاتی ہے۔ اور اس یاس آمیز ناامیدی کو وہ زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

یاس سی باقی ہے جو کچھ کچھ امید ✦ زندگی شاید اسی کا نام ہے

زندگی کا دار و مدار صرف نفس کی آمد و شد پر ہے۔ مگر یہ نفس شماری انسان کب کرنے لگتا ہے۔ بمقصدِ حیات کی عدم تکمیل ناامیدی اور نامرادی یاس و حرماں اور دل شکستگی کے بعد آرزوؤں۔ ارمانوں کو چھوڑ کر ——— ان دنوں جب کہ وہ اس آلام کدۂ عالم سے بالکل کنارہ کش ہونا چاہتا ہے تو پھر کہتا ہے۔

صرف اک تارِ نفس پر ہے مدار ✦ سچ تو یہ ہے کچھ نہیں انسان میں

انسان کی شوخی اور شرارت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہیں آنکھ نہیں لگتی۔ ادھر آنکھ لگی اور اُدھر زندہ دلی۔ شوخی۔ شرارت سب غائب۔ ہائے، یہ سب کرتوت ہیں شباب کے، اس کے آتے ہی آنکھ بھی لڑ جاتی ہے شوخی بھی چلی جاتی ہے۔

شباب اس کو کیا ساتھ لیتا گیا؟ ✦ میرے دل میں شوخی تھی کیا ہو گئی؟

شاعری واقعہ یہ ہے کہ خاصی مصوری ہے۔ مصور اپنے مُو قلم سے لکیریں کھینچ کر آنکھوں کے سامنے ایک ہیولا پیش کر دیتا ہے۔ جو دعوتِ چشم کا سامان ضرور پیدا کر دیتا ہے مگر لذتِ تخیل سے کم مصور کسی کو فیض یاب کر سکتے ہیں۔ یہ کام کسی شاعر ہی کا ہوتا ہے جو اپنے مُو قلم سے انہیں مانوس الفاظ میں ایک آدھ شعر ایسا لکھ دیتا ہے کہ آپ کا تخیل اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ آپ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو اس شعر کے کہتے وقت اس شاعر پر تھی۔ اور آپ بھی وہی منظر دیکھنے لگتے ہیں۔ جو اس نے دیکھا۔ دیکھئے حسین صیاد نظریں ملا کر بھنویں تان کر کس طرح ع

مرغِ دل کا شکار کرتا ہے

شکار اس کو منظور ہے مرغِ دل کا ✦ ملا کر نظر وہ بھنویں تانتا ہے

ہجر کی بے کسی سے لحد کو غنیمت وہی جانتا ہے جو ہجر کے آلام میں مبتلا ہو کر مجبور اور ناامید ہو چکا ہے۔

لحد ہجر کی بے بسی سے ہے اچھی ✦ ارے موت اس زندگی سے ہے اچھی

مصرع ثانی کو پڑھئے ایک دیوان کا دیوان اس میں ہے ہائے۔

ارے! موت اس زندگی سے ہے اچھی!!

زندگی کے وہ دلدادہ جو زندگی کا دم بھر کر تھک چکے ہیں۔ یہی تو کہتے ہیں۔ اور انہیں پر کیا منحصر ہے۔ ہر سمجھ دار یہی کہتا ہے۔

قیدی قفس سے چھوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کا دھیان نہیں رہتا کہ قفس سے نکل کر جائیں گے کہاں۔ اگر کوئی کہے بھی کہ آشیاں نذرِ

اصل ہوچکا تو وہ مانتا نہیں اور اپنے دل کو یہی کہہ کہہ کر سمجھاتا ہے ۔

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مگر جب قفس سے چھوٹتے ہی آشیاں کے لئے تنکے چننے پڑتے ہیں تو قدرِ قفس معلوم ہوتی ہے ۔

یہ خبر یارب نہ تھی کنجِ قفس سے چھوٹ کر ٭ تنکے ہم چنتے پھریں گے آشیانے کے لئے

حرماں نصیب اور ہجر زدہ طالب کا وصل بھی ہوتا ہے تو اُسے یقین نہیں آتا کہ واقعی وصل ہی ہوا یا خواب تھا ۔

کیا اور کہوں میں وصل کا حال ٭ رات ایک مرے کا خواب دیکھا

باتیں ہزاروں ہوتی ہیں مگر کہنے کی کونسی ہوتی ہیں اور نہ کہنے کی کونسی، یہ وہی جانتا ہے جو آدابِ عاشقی سے واقف ہو۔ ہر بوالہوس اس کو نہیں جان سکتا ۔

جسے تم سن نہیں سکتے جسے ہم کہہ نہیں سکتے ٭ وہی سننے کی باتیں ہیں وہی کہنے کی باتیں ہیں

یہ سچ ہے کہ انسان عاشق ہوتے ہی صاحبِ دل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شب بیداری اور سحر خیزی کی دولت بیک وقت اسے نصیب ہو جاتی ہے ۔

دل جب سے پرایا ہے کسی بے درد کے پلے ٭ ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کے کیا کرتے ہیں نالے

پھر وہی امید کا رونا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی "دھوکے" میں انسان اپنی عمر گزار دیتا ہے۔

یونہی امید میں عمر تمام ہوگئی ٭ شام سے صبح ہوگئی صبح سے شام ہوگئی

زبان کے شعر خسرو بہت صاف کہتے تھے ۔ روزمرہ نہایت فصیح تھا تیور تو بس بلا کے ہوتے تھے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بت اپنے آپ کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں ٭ خدا کی مار سمجھ پر خدا سمجھتے ہیں
ادا پہ جو نہیں مرتے وہ کیا سمجھتے ہیں ٭ وہ اور کچھ ہے جسے سب قضا سمجھتے ہیں

بنے جو راحتِ جاں پھر وہی آزارِ جاں کیوں ہو ٭ الٰہی مہرباں ہو کر کوئی نامہرباں کیوں ہو
نہ مہندی ہے نہ افشاں ہے نہ مستی ہے نہ کاجل ہے ٭ جب ایسی سادگی ہو تم سے کوئی بدگماں کیوں ہو

دو قدم چلنا تمہارا ناز سے ٭ لاکھ چالیں جیسے چرخِ نیلی فام کی
ہے وہی جنت یہاں مل جائے آج ٭ ایک بوتل بادۂ گل فام کی

جب تم نہ ہو تو عیش میں کیا خاک مزا ہو ٭ جنت بھی مرے واسطے دوزخ سے سوا ہو
غیروں کے سنانے کو مجھے کوس رہے ہیں ٭ اور دل میں یہ کہتے ہیں کہ مر جائے تو کیا ہو

جب سے پہلو میں وہ دلدار نہیں ٭ چین دل کو نہیں قرار نہیں
مر کے بھی انتظارِ محشر ہے ٭ قبر میں بھی مجھے قرار نہیں

بڑھایا باغباں نے ربط پھر صیاد گلچیں سے ٭ بہار آئی چمن میں پھر شگوفے کھلنے والے ہیں

گلے میں باہیں باتیں پیار کی تیور خوشامد کے ٭ بغیر از دل لئے پہلو سے وہ کب اٹھنے والے ہیں

بلا سے گالیاں دیتے ہیں وہ دعا نہ سہی ٭ زباں سے نام تو لیتے ہیں بار بار مرا

بات دل کی کہہ گئے وہ کان میں ٭ اب ذری جان آئی میری جان میں

عاشقوں کے لئے منزل کی ضرورت کیا ہے ٭ پاؤں پھیلا کے جہاں سو گئے منزل ہو وہی
نہ آنسو پھر رکیں گے صورتِ شمع ٭ مجھے چھیڑو سرِ محفل سمجھ کر
حسینوں کا زیور ہے یہ بے نیازی ٭ تری تمکنت عاجزی سے ہے اچھی
اک نالہ ترا اے دلِ ناکام بہت ہے ٭ خاموش کہ نازک وہ گل اندام بہت ہے
شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہے ساتھ ٭ کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں

اس شعر کو پڑھئے اور غور کیجئے کہ کیا کہا ہے ۔

کل اپنی سرِ عرش تھی منزلت ٭ تجھے لے زمیں آج دوبھر ہیں ہم

محبت سے معشوق چھوڑ دیں خسرو ٭ خطا معاف یہ ہم سے تو ہو نہیں سکتا

یہ بجا غیر سے ملے جھک کر ٭ یہ غلط آپ ہیں خلیق بہت
مرا مکتوب سہل طولانی ٭ ان کا خط مختصر دقیق بہت
ایک کیا سو ملیں تمہارے سے ٭ تم سلامت رہو رفیق بہت

مرحوم کی یہ غزل غالباً شورا پور کی طوائفوں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی، مدت ہوئی کہ ریکارڈوں میں بھی آچکی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پہلو سے اٹھ گئے ہیں وہ جی مرا مانتا نہیں ٭ صبر و قرار کیسے ہو درد و جگر کو کیا کروں
باغ و بہار ہے تو کیا ساقی و لالہ رو نہیں ٭ جام و سبو سے کیا غرض شمس و قمر کو کیا کروں

رات دن رہتی ہے دشنام کی مجھ پہ بھرمار ٭ اسی انداز کو کیا کم سخنی کہتے ہیں

صدہا مجھ ایسے جن کو ہزاروں بُرا کہیں + ایسا ہے ایک تو کہ سب اچھا کہیں جسے

اسی کے ساتھ ساتھ ہم بعض ایسے شعر بھی نقل کئے دیتے ہیں جن سے مرحوم کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

خدا کرے کہیں موقع سے مجھ کو مل جائیں + مجھے حسین بہت پارسا سمجھتے ہیں

مرے پہلو میں جب تک وہ حسیں ہے + غم کونین کا خدشہ نہیں ہے

وہ اور ہی کچھ لطف ہے کچھ اور ہی لذت + صحبت میں حسینوں کی مزا اور ہی کچھ ہے

ہم نے دیکھے ہیں بہت ناز و ادا کے پُتلے + لے بتو اپنے یہ انداز و ادا رہنے دو

خوبرویوں نے بگاڑا ہے ہمارا بھی مزاج + چار پریوں میں جہاں بیٹھے سلیماں ہوگئے

خسروؔ کو بحر طویل میں شعر لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ افسوس ہے کہ اس وقت مرحوم کا جس قدر کلام میرے پاس ہے۔ ان میں طویل البحر اشعار نہیں ہیں حافظہ کی مدد سے چند شعر نقل کئے دیتا ہوں۔

یونہی جو اے دلستانِ عالم ادا تری جاں ستاں رہیگی
قضا کو پوچھے گا کون آخر اجل کہاں میہماں رہیگی

اگر یونہی کروٹیں بدلتا رہے گا تا حشر یہ زمانہ
نہ انقلابِ زمیں رہے گا نہ گردشِ آسماں رہے گی
ہزار مرجھائے غنچۂ دل رہیں گے گلہائے داغ تازہ
یہ وہ چمن ہے ہمیشہ جس میں بہار بن کر خزاں رہیگی
نہ پوچھ صبا دفصلِ گل میں کہ کیا اسیروں کا حال ہوگا
تڑپ تڑپ جائیں گے قفس میں نظر سوئے آسماں رہیگی

ہے آج بُلبُل کا پوچھنا کیا غضب سرِ شاخسار باتیں
ادھر لب غنچہ وا ہوا کیا نکل پڑیں بس ہزار باتیں
کسی کی حوریں کسی کی جنت ہمیں کسی اور سے محبت
سمجھ میں واعظ کے کیسی آئیں ہماری پروردگار باتیں
یہ چوری چوری نگاہ کرنا یہ دل میں چھپ چھپ کے راہ کرنا
یہ چپکے چپکے تباہ کرنا یہی تو ہیں ہونہار باتیں
عجب مزے کی یہ زندگی ہے کہ میری قسمت سنور گئی ہے
ہوئی ہیں ان سے جو چار باتیں تو دل میں ہیں بیشمار باتیں
صبا ہو گلزار پُر فضا ہو شراب کا دَور چل رہا ہو
چمن ہو خسروؔ ہو مہ لقا ہو سناؤں پھر خوشگوار باتیں

سید تمکین کاظمی

رباعی

اخلاص و وفا کو عام کر دے یارب
ہر ایک کے دل میں اس کو بھر دے یارب
ہر چیز میں دیکھے جو تیرا جلوہ
ہر دیدہ و دل کو وہ نظر دے یارب

اثر صہبائی

جامِ صہبائی

(۱)

فطرت کا رباب ہو گیا ہے خاموش
نغموں سے مگر ابھی فضا ہے مدہوش
الہام کی کیفیت سی طاری دل پر
خاموشیٔ شام ہے کہ پیغامِ سروش

(۲)

دوشیزۂ کائنات اے حورِ سیر
آئی ہے کہاں سے تو صبوحی پی کر
ہر سانس تری ہزار مستی بر دوش
ہر جلوہ ترا ہزار جنت در بر

(۳)

جو انجم و ماہ میں ہے تابان و خموش
کہسار میں بھی وہی ہے حیران و خموش
انساں کے وجود میں ہے جو نغمہ و نور
ہے پیکرِ دہر میں وہ پنہان و خموش

(۴)

ساغر مے حسن سے ہیں گلہائے بہار
اک قطرۂ مے سے ہے روئے زیبائے بہار
ہے اک خیالِ رنگیں
شاید قدم ہے سادگی بھولی سی عذرائے بہار

اثر صہبائی

خوشبودار خط

لاہور سے اُن دنوں ایک ہفت روزہ اخبار "ماہتاب" نکلتا تھا اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ اپنی رہائش کا انتظام میں نے مغلپورہ میں کر رکھا تھا۔ میرے ایک عزیز بسلسلۂ ملازمت وہاں مقیم تھے اور میں اور وہ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ لاہور میں مکانوں کے خوفناک کرائے، قیام و طعام کے بے اندازہ مصارف اور دیگر اسباب معیشت کی گرانی نے ہم ایسے کم استطاعت لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ کام کے مقررہ اوقات تو لاہور میں بسر کریں اور سر چھپانے کے لئے لاہور کے مضافات میں کوئی گوشہ تلاش کیا جائے۔ صبح ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے میں لاہور آجاتا اور شام کو چار، پانچ بجے واپس چلا جاتا تھا۔ ڈیڑھ سال تک یہی معمول جاری رہا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مغلپورہ سے گاڑی کے جس ڈبے میں میں سوار ہوتا تھا اُس میں باقی مسافروں کے علاوہ ایک نوجوان ہر روز موجود ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے خیال نہ کیا لیکن چند ہفتوں کے بعد ہم ایک دوسرے کی شکل و صورت سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ یہ نوجوان لاہور کے اسٹیشن پر اتر جاتا تھا اور شام کو غالباً واپس چلا جاتا ہوگا۔ آہستہ آہستہ رُوشناسی بڑھتی گئی اور پھر خود بخود علیک سلیک شروع ہو گئی۔ دفتر جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت میرے پاس مختلف اخبارات و رسائل کا ایک پلندہ ہوتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے کبھی کوئی مسافر گھڑی بھر کے لئے اخبار مانگ لیتا تھا۔ اسی طرح یہ نوجوان بھی گاہے گاہے ایک آدھ پرچہ اٹھا کر پڑھ لیتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ہمارے درمیان ملک کے سیاسی حالات اور عام اقتصادی مسائل کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ ہماری ملاقات کی میعاد ہر روز صرف دس منٹ ہوتی تھی۔ ادھر گاڑی لاہور کے اسٹیشن پہنچی اور ہم خدا حافظ کہہ کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ پھر یہ صورت ہو گئی کہ جس طرح روزمرہ معینہ پروگرام کے مطابق بعض باتیں اپنے وقت پر ہوتی ہیں اور ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کا منتظر رہتا ہے، ہم بھی ہر روز صبح ساڑھے نو بجے ایک دوسرے کی ملاقات کے منتظر رہنے لگ گئے لیکن لاہور آیا اور پھر نہ ملاقات کی یاد باقی رہی اور نہ انتظار۔ میرے نام سے وہ واقف ہو چکا تھا اور میرے مشاغل کی نوعیت بھی اُسے معلوم تھی لیکن میں نہ اس کے نام سے واقف تھا اور نہ کام سے۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ہر روز امرتسر سے آتا اور شام کو واپس چلا جاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ کئی روز تک نظر نہ آیا اور میں نے اپنی غلطی کا احساس کیا کہ کم از کم اُس کے نام اور پتے سے تو آگاہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ پانچ، سات روز غائب رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ ملا تو معلوم ہوا کہ اُسے بخار کی شکائت تھی۔ اس کا نام اشفاق تھا اور وہ ایک بیمہ کمپنی کے دفتر میں کسی اچھی جگہ ملازم تھا۔ چار بجے کام سے فارغ ہو کر واپس امرتسر چلا جاتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی تھا جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے اُس کے خد و خال میں کوئی موزونی نہ تھی لیکن اس کے بشرے کا مجموعی اثر بہت دلپذیر تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش کو اگر الگ الگ دیکھا جائے تو شائد اُسے خوبصورت کہنا روا نہ ہوگا لیکن اُس کی شکل میں ایک ایسی نرمی اور اس کے چہرے پر ایک ایسی ملائمت تھی کہ دل خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ ایسا عزلت پسند اور خاموش انسان تو نہ تھا لیکن اس کی آنکھوں سے جس کیفیت کا اظہار ہوتا تھا اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تصوّر و تخیل کی دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بعض اوقات یونہی فضا میں حرکت کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اُس کے اندرونی اضطراب کا عکس اُس کے چہرے پر پڑتا تو اُس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی اور پھر فوراً ہی اُس کے ہونٹوں پر تبسّم اور اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ شائد اُس کے دل کی لحظہ بہ لحظہ بدلنے والی حالت کے اثرات تھے۔ وہ علیگڑھ کا تعلیم یافتہ تھا اور شائد یہی وجہ تھی کہ اُس کے لب و لہجہ میں کرختگی نام کو نہ تھی۔ ادبیات سے اُسے بہت شغف تھا اور ہمارے درمیان جلد ربط و ضبط قائم ہو جانے کا باعث بھی یہ تھا کہ ہماری گفتگو سیاسی اور اقتصادی مسائل سے ہٹ کر ادبیات پر آٹھیری تھی۔ وہ علیگڑھ کی روشن خیالی اور تجدد پسندی کے باوجود شعر و سخن کے معاملے میں کسی حد تک قدامت پرست واقع ہوا تھا اور پنجاب کے شعراء کی خیال آرائیوں کو چنداں استحسان کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ میں اکثر مذاق کے طور پر اُس سے کہتا کہ "جدید تحریکِ ادب کو یو۔پی میں کبھی فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

وہ حیران ہو کر پوچھتا "کیوں؟"

مَیں جواب دیتا "جب آپ کے مذاق کا یہ عالم ہے کہ علیگڈھ جیسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی درس گاہ میں چار سال بسر کرنے کے بعد بھی آپ اسی روش کو سراہتے ہیں۔ جو لکھنؤ میں ناسخ اور دہلی میں ذوقؔ قائم کر گیا ہے تو پھر اُن لوگوں کا ذکر ہی جانے دیجئے جن کا خمیر سراسر یو۔پی کی سرزمین سے اٹھا ہے۔"

وہ ناسخ کا نام سن کر ہنس دیتا۔ "آپ خواہ مخواہ مجھے ناسخ کا مداح بنا رہے ہیں۔ مَیں تو اُس رنگِ سخن کا سخت مخالف ہوں جس نے لکھنؤ کی شاعری کو اساتذۂ دہلی کے کلام سے الگ کیا ہے لیکن میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ زبان کے مسئلے کو پسِ پُشت ڈال دیا جائے۔ نظم ہو یا نثر صحتِ زبان ہر صورت مقدم ہے۔ اور جو شخص زبان پر قدرتِ کاملہ نہیں رکھتا وہ نہ اچھا شاعر بن سکتا ہے اور نہ اچھا ادیب۔ آج یہ حالت ہے کہ ہر مبتدی محاورے کی خلاف ورزی اور اصولِ زبان سے انحراف کو ادبی اجتہاد کے نام سے پکارتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عہدِ حاضر کا لکھنؤ عہدِ انیس کا لکھنؤ نہیں اور موجودہ زمانے کی دِلّی بھی میرؔ و غالبؔ کے وقت کی دِلّی نہیں لیکن زبان کے وہ محاورے اور ادب و انشاء کے وہ قواعد جو ہمارے اُن بزرگوں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کا وجود آج بھی ہمارے ادب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے کیونکر نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔ مرکزیّت کے مٹ جانے سے یہ مراد نہیں کہ اب زبان کے مروّجہ و مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہر بغاوت کو اصلاح پسندی اور روشن خیالی سے تعبیر کیا جائے۔ اگر یہ رَوِش چل نکلی تو نا اہل لوگ اپنی بے مائگی کو چھپانے کے لئے زبان پر ہر قسم کے ظلم روا رکھیں گے۔"

ایک دن وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر سہ پہر کے وقت میرے دفتر میں آ گیا اور کہنے لگا۔ "کل اتوار ہے چھٹی کا روز ہے۔ میری صلاح ہے آج امرتسر نہ جاؤں۔ رات کو سنیما دیکھیں اور کل تمام دن سَیر و تفریح کی نذر کیا جائے۔ کیا رائے ہے آپ کی؟"

میں نے کہا۔ "مجھے اتفاق ہے۔ رات سنیما دیکھ کر مغلپورے چلئے۔ وہاں غریب خانہ حاضر ہے اور کل دن بھر سیر سپاٹا کیا جائے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ ہفتے بھر کی کوفت رفع کرنے کے لئے اتوار کو مکمل تفریح ہونی چاہیئے۔"

ہم رات کو ۹ بجے سنیما سے فارغ ہو کر جب گھر کی طرف چلے تو فلم کے حسن و قبح پر بحث شروع ہو گئی۔ اشفاق کہنے لگا۔ "میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ایک عورت محبت کے معاملہ میں مرد کو کیونکر بے وقوف بنا سکتی ہے۔ مانا کہ دورِ حاضر کی ہندوستانی عورت نے تہذیبِ مغرب سے متاثر ہو کر کسی حد تک متلوّن مزاجی، وفا نا آشنائی اور ظاہر پرستی سیکھ لی ہے لیکن ہندوستان کے مردنے بھی تو یہ خصوصیات حاصل کرنے میں کمی نہیں کی۔ پھر جب فریقین کی حالت یکساں ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ عورت مرد کو فریب دے جاتی ہے۔ اس فلم میں بھی عورت کے مزاج کا یہی پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورت اور مرد دونو تعلیم یافتہ ہیں۔ دونو جدید معاشرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور دونو نے مشرق و مغرب کے اتصال سے جو خوبیاں یا برائیاں پیدا ہوئی ہیں اختیار کر رکھی ہیں۔ مرد سب کچھ جان بوجھ کر، دیکھ بھال کر، عورت سے محبت کرتا ہے۔ اور عورت اُسے دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتی ہے۔ کیا مرد ایسا ہی معصوم اور عورت ایسی ہی فریب کار ہے"؟

میں نے کہا۔ "عورتیں نیک بھی ہوتی ہیں اور بد بھی۔ اسی طرح مرد شریف بھی ہوتے ہیں اور مکّار بھی۔ افسانہ نگار نے فلم میں اپنے ذاتی خیالات و تجربات کا اظہار کیا ہے اور ہم غلطی سے اُسے ایک عالمگیر صداقت سمجھ رہے ہیں۔ عشق و محبت کی دنیا میں ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اور جب اُس تجربے کو رنگ آمیزی کے ساتھ ایک کہانی کی شکل میں بیان کیا جائے تو لوگ اُسے اِس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے کہ وہ محض ایک شخص کی ذاتی روئداد ہے بلکہ وہ اُسے ایک مسلّمہ حقیقت یقین کر لیتے ہیں۔"

ارادہ تو یہی تھا کہ اتوار کو جی بھر کر آوارہ گردی کریں گے لیکن ہوا یہ کہ صبح اٹھے، ناشتہ کیا اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو ایک نہیں، دو نہیں اکٹھے پانچ گھنٹے ہم نے اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا اور گفتگو جاری رہی۔ دو بجے سے چار بجے تک ہم نے چھاؤنی کی سڑکوں اور صدر بازار کا ایک چکر لگایا اور ساڑھے چار بجے کی گاڑی سے اشفاق صاحب واپس امرتسر چلے گئے۔ آج اشفاق نے اپنے متعلق بہت سی باتیں بتائیں اُس کے والدین کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کے بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا۔ امرتسر میں اس کا ایک جدّی مکان تھا جس میں وہ اپنے چند قرابت داروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسکول کی تعلیم اُس نے لدھیانہ میں ختم کی تھی جہاں سے وہ علیگڈھ چلا گیا اور بی۔ اے تک وہیں رہا۔ لاہور میں اس [illegible]یت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اپنے دفتر کے آدمیوں کے سوا اور کسی سے [illegible] کی راہ و رسم نہ تھی۔ سالہا سال سے ایک ہی قسم کے ماحول میں رہنے کی وجہ [illegible] تنہائی کا عادی ہو گیا تھا۔ تاہم وہ اپنی بے آب و رنگ زندگی میں کیف [illegible] پیدا کرنے پر آمادہ تھا اور کیف و تنوّع کی اس سے بہتر صورت کیا ہو سکت[illegible] متا[illegible]

زندگی اختیار کرلی جائے۔ شادی کے متعلق اس کے خیالات مبہم، غیر معین اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ چونکہ تنہا تھا اور خاندانی علائق اور گھر بار کی پابندیوں سے بے نیاز تھا اس لئے شادی کے رسم و رواج سے بھی بے خبر تھا، معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنی شادی کے متعلق کچھ فیصلہ کرچکا ہے لیکن اُس کے اظہار سے گریز کرتا ہے۔ میرے استفسار پر کہ آیا شادی کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اُس نے کہا "ہماری معاشرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کر ہر زن و مرد کو سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہیئے ورنہ اُس حدِ عمر کے بعد نا کتخدا رہنے والوں کو سوسائٹی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کنواروں پر ٹیکس عائد کیا جا رہا ہے اُن کے اخلاق اور چال چلن کو خواہ مخواہ متشبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ انہیں شہر کے آباد محلوں اور گلی کوچوں میں رہنے کو مکان نہیں دیئے جاتے بھلے آدمیوں کے ہاں اُن کی آمد و رفت معیوب خیال کی جاتی ہے۔ اِن باتوں سے تنگ آکر لوگ شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور پھر ستم ظریفی دیکھو کہ ہر شادی شدہ شخص کو دنیا بڑی فراخ دلی سے نیک چلنی کا پروانہ دے دیتی ہے۔ اعمال و افعال کی چھان بین ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کے ماضی اور ماضی کے ساتھ تعلق رکھنے والے عیب و ثواب کی پوچھ گچھ بھی ترک کردی جاتی ہے۔ گویا عزت و اعتبار اور قدر و منزلت کے حصول کا بہترین ذریعہ شادی ہے۔"

میں نے کہا "جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ شادی کا رسمی پہلو ہے۔ لیکن اُس شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو عشق و محبت کا کامیاب ثمر ہوتی ہے۔"

اشفاق خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

اُس نے آبدیدہ ہو کر کہا "یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جو ہندوستان میں کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔"

ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔ ایک آدھ مرتبہ میں بھی امرتسر گیا اور اشفاق کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ گاڑی میں ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ اشفاق کی جیب میں چمڑے کا ایک نہائت خوبصورت بڑا سا بٹوا رہتا تھا جس میں روپے پیسے کی بجائے وہ کچھ کاغذات رکھتا تھا۔ ایک روز اتفاقیہ وہ بٹوا جیب سے گر گیا اور تمام کاغذات زمین پر بکھر گئے۔ اُن میں چند گلابی رنگ کے نرم و نازک حسین لفافے بھی تھے جن کے کونوں پر بہت خوشنما پھول بنے ہوئے تھے۔ ہر لفافے پر خوبصورت زنانہ خط سے اشفاق کا پتہ مرقوم تھا اور اندر سے عطر کی خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں میں نے وہ لفافے اٹھا کر اشفاق کو دیئے تو اُس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا "ان لفافوں کا لکھنے والا بھی ایسا ہی معطر و حسین شخص ہو گا؟"

اشفاق جھینپ سا گیا اور بٹوا اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر مجھ سے رازداری کے لہجے میں کہنے لگا "میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے کا ہر روز ارادہ کرتا ہوں لیکن جرأت نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "فرمائیے۔ وہ کیا ضروری بات ہے؟"

اشفاق نے کہا "انہی لفافوں کے متعلق۔" اور پھر احتیاط سے ایک لفافہ جیب سے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے کھولا تو وہ ایک خط تھا، کسی عورت کی طرف سے، جس نے اپنا پورا نام لکھنے کی بجائے صرف "س" لکھا ہوا تھا۔ میں نے خط پڑھا تو معلوم ہوا کہ حسن و عشق کی ایک عجیب داستان ہے۔ فراق کی کاہشیں، فلکِ کج رفتار کے مظالم، جورِ اعدا کے گلے، دلِ غم نصیب کے سنبھلنے کی دعائیں، غرضکہ صحیفۂ عشق کے تمام باب قلمبند کئے گئے تھے۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ "مجھ پر آپ نے جو اعتماد فرمایا ہے اُس کا بے حد شکریہ لیکن یہ بتائیے کہ یہ خاتون کون ہیں؟"

اشفاق نے پھر بٹوا کھولا اور تمام خطوط نکال کر میرے حوالے کر دیئے۔ بھینی بھینی، مست کر دینے والی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "عورتوں کو خوشبو استعمال کرنے میں بھی غضب کا سلیقہ حاصل ہے۔ ہم چاہے پوری شیشی خالی کر ڈالیں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔"

اشفاق کے چہرے پر خوشی اور کامیابی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

میں نے وہ تمام خطوط پڑھے۔ وارداتِ عشق کی ایک رنگین روداد تھی لیکن میں نے ایک نامعلوم طریقے سے محسوس کیا کہ خطوں میں محبت کی حقیقی گرمی موجود نہیں۔ جگہ جگہ اشعار استعمال کئے گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جذبات کی کمی ہے اور لکھنے والی اپنی سرد مہری کو اشعار کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"اب ان خطوں کی تفسیر بھی کر دیجئے۔"

اُس نے ہنس کر جواب دیا "ہر تصنیف کا بہتر شارح خود اُس کا مصنف ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اس تصنیفِ لطیف کے مصنف کی بارگاہِ ناز تک مجھے اپنے ہمراہ چلنے کے لئے آپ تیار ہیں؟"

اشفاق نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "فکر نہ کیجیے۔

وہ دن بھی قریب آ رہا ہے"۔ اور پھر اس نے مزے لے لے کر کہنا شروع کیا "س" سے مراد سکینہ ہے۔ یہ ایک نہایت حسین وجمیل اور شائستہ خاتون ہیں۔ اپنی والدہ کے ہمراہ لاہور میں رہتی ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اُن کی خدمت میں شرف نیازمندی حاصل ہے اور میں کس منہ سے کہوں کہ عنقریب میری ان سے شادی ہونے والی ہے"۔

میں نے متعجب ہو کر کہا "خوب۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ چپکے چپکے شکار مار لیا۔ لیکن اگر آپ میری جرأت کو قابلِ مواخذہ تصور نہ فرمائیں تو کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خاتون کس خاندان سے ہیں؟"

اشفاق گھبرا سا گیا اور قدرے توقف کے بعد بولا "مجھے اس سوال کا جواب دینے کی ممانعت ہے اور یوں بھی یہ معیوب سی بات ہے کہ میں اس وقت ان کے گھر بار کا پتہ آپ کو بتا دوں تاہم آپ کی تشفی کے لئے اتنا کہے دیتا ہوں کہ وہ ایک نہایت ذی عزت گھرانے کی چشم وچراغ ہیں اور اُن کے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے پوری شفقت ومحبت اور بے حد حزم واحتیاط سے اُن کی پرورش کی ہے"۔ پھر وہ مجھے اپنی شادی کے اہتمام والنصرام کی تفصیلات سنانے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ "میں تنہا ہوں اور رسم ورواج سے ناواقف ہوں۔ اس لئے میں نے سکینہ کی والدہ سے کہہ دیا ہے کہ میری طرف سے بھی شادی کا انتظام وہی مکمل کر دیں۔ میں نے سردست آٹھ سو روپیہ انہیں دیا ہے اور اب ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے ستر روپے ان کو اور بھیج دیتا ہوں۔ وہ خود ہی زیور اور کپڑے وغیرہ تیار کر رہی ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ نکاح جلد ہو جائے لیکن سکینہ کی والدہ نہیں مانتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں اپنی لڑکی کا رخصتانہ دھوم دھام سے کروں گی"۔

اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے روز اشفاق نے پھر وہ بٹوا جیب سے نکالا اور کہنے لگا "اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ میں آپ کو سکینہ کی تصویر دکھاتا ہوں"۔ اس نے بٹوا کھول کر ایک باریک سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر نکالی اور میں نے سخت اضطراب سے وہ تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی میرا رنگ فق ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا چند لمحوں کے لئے میرے دل کی حرکت رُک گئی ہے۔ اشفاق حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر میرے شانے کو ہلا کر بولا "کیا ہوا آپ کو؟ خیر تو ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ مجھے دل کا عارضہ ہے۔ کبھی کبھی یک لخت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دل ڈوب رہا ہے"۔

یہ تصویر شمشاد کی تھی جو اس سے قبل کم از کم چھ نوجوانوں کو تباہ کر چکی تھی۔ اُس کی ماں زینت ایک سخت عیار اور آوارہ عورت تھی جس کا پیشہ ہی یہ تھا کہ اپنی لڑکی کے ذریعے سے سادہ لوح نوجوانوں کو لوٹے۔ ان کے ترکش کا زخم خوردہ میرا ایک دوست لطیف احمد بھی تھا لیکن اُس وقت یہ دونو ماں بیٹیاں راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ لطیف کو شمشاد کی شادی کا چکمہ دے کر انہوں نے مختلف بہانوں سے اُس سے بارہ سو روپیہ وصول کیا اور پھر راولپنڈی سے غائب ہو گئیں۔ میں لطیف سے کہتا رہا کہ پولیس میں اطلاع کر دو لیکن اُس نے اپنی رُسوائی کے ڈر سے اور کچھ اس خیال سے کہ اس کے پاس ثبوت نہیں تھا۔ پولیس میں خبر نہ کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ شمشاد نے اپنی ایک تصویر لطیف کو دی تھی اور وہ تصویر مدت سے میرے پاس پڑی تھی۔ میں گھر آ کر سوچتا رہا کہ اشفاق کو اس خطرناک سازش کی خبر کس طرح کروں تاکہ اُس کی حساس طبیعت کو زیادہ صدمہ نہ پہنچے۔ وہ بچارا خوشبودار خطوں، شمشاد کے حسن وجمال کی دلفریبیوں اور زینت کی طرحدار باتوں کے جال میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔ اور اب اگر اُسے معلوم ہوا کہ یہ سب فریب تھا تو خدا جانے وہ اپنا کیا حال کر بیٹھے۔ میں نے اُسے ایک مفصل خط لکھا جس میں شمشاد اور زینت کی عیاری کی تمام داستان درج کی اور اپنے بیان کو زیادہ موثق بنانے کے لئے شمشاد کی تصویر بھی اُسے بھیج دی۔ دوسرے روز خط پہنچتے ہی وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور وہ خود سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا "کیا آپ نے یہ خط لکھا تھا؟"

میں نے جواب دیا "ہاں"۔

"کیا یہ ساری داستان صحیح ہے؟"

میں نے عرض کیا "اس کا ایک ایک لفظ درست ہے"۔

"تو پھر میں اب کیا کروں؟"

میں نے جواب دیا "میری رائے ہے کہ آپ اس واقعہ کی پولیس میں اطلاع کر دیں"۔

وہ کہنے لگا "میں پولیس میں اطلاع نہیں کروں گا۔ دنیا میں اس طرح اپنی تشہیر کرنا مجھے گوارا نہیں۔ میرے پاس روپے کا کوئی ثبوت نہیں۔ لے دے کے یہ چند خطوط ہیں۔ ان سے بھی کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مجھ سے اتنی رقم وصول کی ہے"۔

آدھ پون گھنٹہ ہمارے درمیان گفتگو ہوتی رہی اور اشفاق آئندہ طرز کار کے متعلق کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد وہ روز بروز مسلسل

وہ مجھے گاڑی میں نظر نہ آیا۔ میں نے اُس کے دفتر سے خبر منگوائی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہے۔ میں خود اُسے دیکھنے کے لئے امرتسر گیا۔ اُس کو بہت تیز بخار تھا اور ساتھ ہی تمام بدن میں شدید درد تھا۔ میں نے کہا "آپ بیمار کیونکر ہو گئے؟"

اُس نے بہت کمزور آواز میں جواب دیا "اُس روز آپ سے مل کر جب میں واپس آیا تو سر میں سخت درد تھا۔ رات بھر ایسی بے چینی رہی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ صبح ہوئی تو بخار ہو گیا۔"

میں نے اُس کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ آپ کے اعصاب میں کچھ ایسی ذکاوتِ حِس ہے کہ ہر ناگوار واقعہ آپ پر غیر معمولی گہرا اثر ڈالتا ہے۔"

اُس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا اور خاموش ہو گیا۔

اشفاق کا بخار تپ محرقہ کی صورت اختیار کر گیا اور غریب پورے اکیس روز چارپائی پر پڑا رہا۔

عاشق بٹالوی



طلسمِ گفتار

افسانہ چاہتے تھے وہ، افسانہ بن گیا
میں حُسنِ اتفّاق سے دیوانہ بن گیا

وہ اِک نگاہ دیکھ کے خود بھی ہیں شرمسار
ناآگہی میں یُونہی اِک افسانہ بن گیا

موجِ ہوا سے زُلف جو لہرا گئی تری
میرا شعور لغزشِ مستانہ بن گیا

حسن ایک اختیارِ مکمّل ہے آپ نے
دیوانہ کر دیا جسے، دیوانہ بن گیا

ذِکر اُس کا گفتگو میں جو شامل ہُوا عدمؔ
جو شعر کہہ دیا وہ پری خانہ بن گیا

سیّد عبدالحمید عدمؔ

سرودِ ہندی

کیا راہ ہے راہِ محبت کی سانس آتے آتے ٹوٹ گئی
کیا بار ہے بارِ محبت کا دو گام میں ہمت چھوٹ گئی

وہ درد وہ چوکھٹ کیا چھوٹی اے ہمدم قسمت پھوٹ گئی
چاہا تھا دل کو سمجھا لیں کچھ سوچ کے ہمت چھوٹ گئی

زنداں کی حقیقت ہی کیا تھی ہمت ہی یکایک ٹوٹ گئی
دل بجھ گیا جی چھوٹ گیا، دیوانوں کی قسمت پھوٹ گئی

تسکین کی باتیں کرتے ہو ہم جانتے ہیں جو ہونا ہے
جب عشق کے ہاتھوں جینا ہے تو یارو قسمت پھوٹ گئی

تم نزع میں دیکھ کے آئے ہو ہم دفن کیے آتے ہیں اسے
کچھ تم کو خبر ہے کتنی دور اک جاتی دنیا چھوٹ گئی

اے دوست ترے جلنے والے جلتے ہیں جیسی مصیبت سے
دوزخ کی بھڑکتی آگ اس پر سو مرتبہ چھاتی کوٹ گئی

انصاف کسی کا کیا چاہیں کیا عشق کی رسم نرالی تھی
جو اپنے ساتھ کسی نے کیا اے مالک قسمت پھوٹ گئی

ہمراز نہیں دمساز نہیں اللہ کوئی آواز نہیں
کیا عشق کی دنیا میں آتے ہی رہتی دنیا چھوٹ گئی

ہے درد سا دردِ محبت کا ہے چوٹ سی چوٹ محبت کی
دیکھا بھی نہیں جانا بھی نہیں ورنہ یہ ہوائی چھوٹ گئی

متوالے ہوش میں رہتے ہیں یہ بھید اس وقت کھلا ہم پہ
ارمان بھرے دل کی محفل وہ مست آنکھ جب لوٹ گئی

محشر کا دن جب ڈوب چلا انگڑائی لے لے کے اٹھے
ان آنکھوں کے اے متوالو نیند اتنی جلدی ٹوٹ گئی

آگے شاید پڑتا ہے عدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں
یہ درد کی حد ہے فراقؔ یہیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

فراقؔ گورکھپوری ایم اے

مسرت

سمندر کے کنارے بلند جگہ پر وہ مکان کھڑا تھا۔

چائے کا وقت تھا۔ چراغ ابھی روشن نہیں ہوئے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ افق مغرب کی سنہری روشنی نے آسمان کو لالہ گوں بنا رکھا تھا۔ بحیرۂ روم کا پانی بالکل ساکن تھا اور ڈوبتے ہوئے دن کی سرخی میں چمکیلی دھات کی ایک چادر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

دُور دائیں جانب پست و بلند پہاڑیاں افق مغرب کی ارغوانی جھلک کے سامنے اپنی کالی کالی چوٹیاں اٹھائے کھڑی تھیں۔

وہ محبت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور ان ہی پرانی باتوں کو بار بار دُہرا رہے تھے جو پہلے کئی بار کہی جا چکی تھیں۔ بڑھتی ہوئی اداس تاریکی ان پر مسلط ہو رہی تھی اور ان کے دلوں پر ایک خوش گوار اثر پیدا کر رہی تھی "محبت" کا لفظ کبھی مرد کی مضبوط آواز سے اور کبھی عورت کے دل کش صاف لہجے سے بلند ہوتا ہوا اس چھوٹے سے کمرے کی فضا میں گونج رہا تھا۔

"کیا مسلسل کئی سالوں تک کوئی محبت کر سکتا ہے؟" یہ تھا زیر بحث سوال!

کچھ کہنے لگے "ہاں"

کچھ بولے "نہیں"

کئی کئی مثالیں پیش ہوئیں اور سب مرد اور عورتیں، خون کو کھولا دینے والے وہ وہ واقعات سن و عن کہہ ڈالنے پر آمادہ ہو گئے جن کے بیان سے وہ ہمیشہ گریز کرتے تھے اور جو ان کے ہونٹوں تک کئی دفعہ آ آ کر رہ گئے تھے۔

غرض کہ انھوں نے اس عام مگر ارفع چیز کو ——— یہی دو روحوں کی پُراسرار قرابت ——— بڑے جوش اور بے حد دلچسپی کے ساتھ بیان کیا۔

ان میں سے ایک جس کی آنکھیں دور کے ایک منظر پر جمی تھیں یکایک بول اٹھا۔

"بخدا! دیکھو وہ اس طرف کیا چیز ہے؟"

سمندر کے اُس جانب دُھندلی فضا میں ہلکے سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا بے ڈول تودا سر نکالے کھڑا تھا۔

عورتیں اٹھ اٹھ کر اس مبہم سی چیز کی طرف دیکھ رہی تھیں جو اس سے پہلے انھیں کبھی دکھائی نہ دی تھی۔ ایک نے کہا "یہ کورسکا ہے۔ یہ سال بھر میں صرف دو یا تین مرتبہ۔ خاص خاص فضائی کیفیتوں میں نظر آتا ہے یعنی جب ہوا انتہا درجہ شفاف ہو اور کُہرا اُسے دھندلا نہ کر سکے۔"

اب وہ کسی حد تک پہاڑ کی چوٹیاں بھی دیکھ سکتے تھے اور یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ان کی بلندیوں پر برف کے بڑے بڑے تودے جمے ہیں ہر ایک اس نئی دنیا کے اچانک ظاہر ہو جانے پر حیران و مبہوت ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے وہی حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے جس نے کولمبس کو عجیب و غریب سمندروں میں پریشان کیا تھا۔

ایک بوڑھا امیر جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا:۔ "خوب تو اسی جزیرے میں جو ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا مجھے ایسی حقیقی محبت کا ایک واقعہ پیش آیا جو حیرت انگیز طور پر کامیاب تھی۔

پانچ سال گزرے، میں نے کورسکا کا سفر کیا۔ یہ ویران جزیرہ ہم سے بہت دور واقع ہے اور ہمیں اس کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں، گو آج کی طرح بعض اوقات فرانس کے ساحلوں سے یہ نظر آتا ہے۔

کورسکا کو دنیا کی ابتدائی حالت فرض کیجئے۔ جہاں بہت سی ایسی گھاٹیاں پہاڑیوں کے وسیع سلسلے کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں جنہیں کف انگیز ندیاں بہتی ہیں۔ وہاں زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو ہموار ہو۔ ہر طرف ٹھر بھرے پتھروں کی چٹانیں اور خوفناک نشیب و فراز جھاڑیوں یا اونچے اونچے شاہ بلوط کے جنگلوں سے گھرے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک بے کاشت زمین ہے جو ابتدا ہی سے ویران پڑی ہے۔ چوٹیوں پر کہیں کہیں کوئی گاؤں دیکھنے میں آتا ہے جو دور سے چٹانوں کے ایک انبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ وہاں نہ تہذیب کا کوئی نشان ہے۔ نہ دستکاری ہے اور نہ کوئی فن۔ زمین کا چپہ چپہ

جھان مار وتم کو نہ کہیں تراشیدہ لکڑی ملے گی۔ اور نہ کندہ کئے ہوئے پتھر کا کوئی ٹکڑا جس سے کسی ادنےٰ یا اعلےٰ پرانے مذاق کا پتہ چل سکے۔ یہاں اس "طلسمی حسن" کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ جسے آرٹ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور شاید یہی اس سرزمین کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اٹلی "شاہکاروں کا شہر" جہاں کا ایک ایک محل بجائے خود ایک شاہکار ہے۔ جہاں سنگِ مرمر، لکڑی، پیتل۔ لوہا غرض کہ ہر دھات اور پتھر کا ایک ایک ٹکڑا انسانی آرٹ کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ جہاں پرانے گھروں کا حقیر سے حقیر ترکہ بھی لوگوں کے حسن مذاق پر شاہد ہے۔ ہماری نظروں میں ایک مقدس اور محبوب سرزمین ہے۔ کیونکہ اسی کے کارناموں سے ہم وہ تحریک۔ قوت اور مسرت محسوس کرتے ہیں جو اختراع وایجاد کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس کے سامنے کورسکا کا جزیرہ اسی طرح ویران پڑا ہے جس طرح وہ پرانے زمانے میں تھا۔ وہاں انسان انھیں کچے مکانوں میں رہتے ہیں انھیں صرف ان ہی امور سے غرض ہے جو ان کی بے کیف زندگی اور اس کی محدود ضروریات سے متعلق ہوں۔ مگر ان میں جہاں غیر متمدن اقوام کے نقائص ——— بے رحمی، فتنہ انگیزی۔ خوں آشامی ——— پائے جاتے ہیں وہاں ——— مہمان نوازی۔ فیاضی۔ رحم دلی جیسی خوبیاں بھی موجود ہیں اور ان کے دروازے ہر مسافر کے لئے کھلے رہتے ہیں اور ذرا سی ہمدردی کے صلے میں وہ حقیقی دوستی کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

تو ایک ماہ تک میں اس عالی شان جزیرے میں سیر کرتا رہا۔ اس عرصے میں مجھے یوں محسوس ہوتا رہا۔ جیسے میں دنیا کے آخری کنارے پر پہنچ گیا ہوں وہاں نہ کوئی سرائے تھی نہ شراب خانہ اور نہ کوئی سڑک۔ پگڈنڈیاں ان گاؤں تک چلی گئی تھیں جو پہاڑیوں کے دونوں طرف آباد تھے۔ ندیوں کا پانی پیچ در پیچ خلیجوں کی گہرائیوں میں گرتے وقت شام کے سکوت میں ایک مسلسل شور برپا کرتا رہتا تھا۔ مسافر وہاں مکان کا دروازہ کھٹکھٹا کر اگلی صبح تک رات بسر کرنے یا کھانے کے لئے اہلِ خانہ سے بے تکلف درخواست کرتا ہے۔ وہ ایک غریبانہ میز کے سامنے بیٹھتا ہے اور غریبانہ چھت کے نیچے رات بسر کرتا ہے۔ صبح ہوتے ہی اپنے میزبان کے گرم جوش ہاتھ سے ہاتھ ملا کر چل پڑتا ہے۔ میزبان عزت افزائی کے لئے اسے گاؤں کے باہر تک چھوڑنے جاتا ہے۔

دس گھنٹوں کی مسلسل سیر کے بعد ایک شام میں ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ جو ایک تنگ وادی کی گہرائی میں تنہا کھڑا تھا۔ یہ وادی ایک لیگ کے فاصلے پر سمندر سے جا ملی تھی۔ پہاڑیوں کی دو گہری ڈھلانوں سے جن پر جھاڑیاں

اور اونچے اونچے درخت اُگے تھے۔ یہ افسردہ جگہ گھری ہوئی تھی۔

مکان کے گرد انگور کی چند بیلیں اور ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ دُور فاصلے پر شاہ بلوط کے بلند درخت کھڑے تھے۔ جو اس برہنہ غریب جزیرے کی دولت شمار کئے جاتے ہیں۔

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا جس کے چہرے کے نقوش کو بڑھاپے نے بدنما کر دیا تھا۔ لیکن جو غیر معمولی طور پر صاف اور اجلی تھی۔ اندر بید کی کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سلام کو اٹھا اور کچھ کہے بغیر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی نے مجھ سے کہا "اسے معاف فرمائیے یہ بہرہ ہے۔ اس کی عمر بیاسی سال ہے۔"

وہ نہایت خوبی سے فرانسیسی بول سکتی تھی اور میں اس بات سے حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم کورسکا کی رہنے والی ہو؟"

اس نے جواب دیا "نہیں ہم براعظم سے یہاں آئے ہیں اور پچاس برس سے یہاں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

پچاس سال کے خیال نے مجھ پر ایک خوفناک احساس طاری کر دیا ——— پچاس سال جو انھوں نے اس تاریک جگہ میں آبادی اور شہروں سے دور رہ کر گزار دیئے تھے ——— ! بوڑھا گڈریا اندر داخل ہوا اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانا نہایت سادہ تھا یعنی گوبھی اور گوشت اور گاڑھا سا شوربا!

جب یہ مختصر سا کھانا ختم ہو چکا تو میں باہر جا کر دروازے کے قریب جا بیٹھا۔ میرا دل اس افسردگی سے بیٹھا جاتا تھا جو اس سرزمین کے مناظر سے ٹپک رہی تھی۔ اس وقت میں کچھ ایسی وحشت میں گرفتار تھا جیسی ویران جگہوں میں شام کے وقت ایک مسافر پر مسلط ہو جاتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام چیزیں حتیٰ کہ زندگی اور سارا جہان ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہا ہے۔ زندگی کے خوفناک مصائب۔ عناصر کا انتشار اور بالآخر ان کا معدوم ہو جانا اور ہمارے دلوں کی تاریکی جسے ہمارے دلنواز خواب زندگی کے آخری لمحوں تک خوشگوار بنائے رہتے ہیں ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہو رہے تھے۔

بڑھیا میرے پاس آ بیٹھی اور تحقیق کے ایک [illegible] جذبے کے ماتحت جو تسلیم و رضا اختیار کئے ہوئے لوگوں کے دلوں میں بھی [illegible] رہتا ہے مجھ سے پوچھنے لگی۔ "تو آپ فرانس سے آئے ہیں؟"

"ہاں میں تفریح کی خاطر سفر کر رہا ہوں۔"

"شاید پیرس سے تشریف لائے ہوں۔"

"نہیں ننیسی سے !"

مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میرے آخری فقرے نے اس پر ایک غیر معمولی اضطراب طاری کر دیا ہے۔ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ یہ تغیر میں نے کس طرح دیکھا یا محسوس کیا۔

اس نے آہستگی سے پھر دہرایا: "اچھا تو آپ ننیسی سے آرہے ہیں"۔

اس کا شوہر دروازے میں کچھ اس طرح بے خیال سا ہو کر کھڑا تھا جس طرح بہرے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔

وہ بولی "کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ سن نہیں رہا"

پھر کچھ منٹوں کے بعد وہ مجھ سے دریافت کرنے لگی: "تو آپ ننیسی کے باشندوں کو جانتے ہوں گے ؟"

"ہاں تو تقریباً ہر ایک کو"

"سینٹ لالینز کے خاندان کو بھی"

"کیوں نہیں، اچھی طرح۔ وہ میرے باپ کے دوست تھے"

"آپ کا نام کیا ہے ؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اور صاف آواز سے جس میں پرانی یاد کے جذبے نے ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ پوچھنے لگی "اور برسن کا خاندان۔ ان کے متعلق کچھ کہئے"

وہ تمام مر چکے ہیں۔

"اور سرتوں، ان کی بابت کچھ بتائیے"

"ہاں سب سے چھوٹا جرنیل ہے"

چنانچہ وہ فرط اشتیاق سے کانپنے لگی مجھے معلوم نہیں کہ وہ کونسا بے چین کر دینے والا گہرا جذبہ تھا۔ وہ کونسا پراسرار خیال تھا جس نے اس وقت وہ تمام راز بے نقاب کر دینے پر مجبور کیا۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں اب تک مقفل تھے۔ جانے ان لوگوں سے اس کا کیا تعلق تھا جو ان کے ناموں نے اس کے دل کو اتنی اذیت پہنچائی۔

وہ بولی "ہاں ہنری سرتوں۔ میں اسے خوب جانتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہی تو ہے"

میں نے وحشت کے عالم میں غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یکایک مجھے یاد آگیا کہ ان کے علاقے میں ایک ناخوشگوار واقعہ ظہور میں آیا تھا جب سوزان سرتوں، ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اس ولائتی سواروں کے رسالے کے ایک افسر کے ساتھ نکل بھاگی تھی جس میں اس کا باپ کمانڈر تھا۔

یہ بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کے والدین کسان تھے مگر یہ شجاعت کا نیلا نشان لگائے رہتا تھا۔ اس لڑکی کو اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے کس طرح نوجوان کے دل میں اپنی محبت کا اعتبار بٹھایا تھا۔

کسی کو مطلق خبر نہ تھی کہ اچانک ایک شام یہ نوجوان سپاہی اپنی خدمات کا عرصہ گزار لینے کے بعد اس لڑکی کو ساتھ لے کر کہیں روپوش ہو گیا۔ جستجو کی گئی مگر ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب دیر تک ان کے متعلق کوئی خبر نہ ملی تو لوگوں نے سمجھا کہ لڑکی مر چکی ہے۔

تو اس طرح میں نے اس الگ تھلگ وادی میں اسی لڑکی کو دیکھا۔

میں نے کہا "ہاں مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے کہ آپ مادموزیل سوزان ہیں"

اس نے سر ہلا کر کہا "ہاں" اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر بوڑھے آدمی کی طرف دیکھ کر وہ کہنے لگی "یہ وہی ہے !"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی اور جب اس نے اس کی طرف دیکھا تھا تو اس کی نظروں میں بے پایاں محبت جھلک رہی تھی۔ میں نے پوچھا "تو آپ بہت خوش ہوں گی"

اس نے ایسی آواز میں جواب دیا جو اس کے دل سے نکل رہی تھی "ہاں بہت خوش ہوں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہوا"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا میں اس وقت محبت کی حیرت انگیز قوت سے متعجب ہو رہا تھا کہ کس طرح یہ امیر لڑکی اس آدمی۔ اس کسان کے ساتھ ساتھ پھرتی رہی۔ اور کس طرح اس نے ایک بے کیف اور بے رونق ادنیٰ سی زندگی بسر کرنے پر اپنے آپ کو مجبور کر لیا۔ کس طرح اس نے اس ایک بے وقوف شہری کی بیوی بننا پسند کیا جسے پہننے کے لئے معمولی سی ٹوپی اور کینوس کے بوٹ ہی میسر آتے ہیں اور کس طرح اب وہ بید کی سیٹ والی کرسی پر بیٹھ کر آلو، گوبھی اور شوربا ایک معمولی سی میز آگے رکھ کر مٹی کے برتن میں سے کھا لیتی ہے۔

اس کے دل میں اس انسان کے سوا کبھی کوئی خیال نہ آیا تھا۔ زر و جواہر خوشنما کپڑے۔ بازوؤں والی کرسیاں۔ رنگین پردوں والے کمرے کی معطر آسائش اور وہ نرم نرم گدیلے جن پر جسم کو ایک ابدی راحت محسوس ہوتی ہے ان میں سے کوئی چیز اسے میسر نہیں تھی اور نہ ان کیلئے اسے کبھی افسوس ہوا تھا۔ اسے اپنے شوہر کے علاوہ اور کسی چیز کی خواہش نہ تھی۔ بس وہی وہ تھا جسے وہ چاہتی تھی۔

جوانی کے آغاز ہی میں اس نے نازونعم کی زندگی اور ان سب عزیزوں کو خیر باد کہہ دی تھی جن کی آغوش میں اس نے پرورش پائی تھی اور جنھیں اس سے حد درجہ محبت تھی۔ وہ ان کو چھوڑ کر اسی ایک انسان کے ساتھ یہاں اس ویرانے

میں آگئی یہی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا یہی اس کے خوابوں کی تعبیر تھی اور یہی وہ ایک ہستی تھی جس کے ساتھ اس کی امیدیں وابستہ تھیں اور اب بھی ہیں اس شخص نے نہ جانے کیسے اس کی ہستی کو آغاز سے انجام تک ایک نہ زائل ہونے والی مسرت سے بھر دیا تھا!

بھلا وہ اس سے زیادہ خوش کہیں رہ سکتی تھی۔

دوسری صبح میں اِن دونوں سے ہاتھ ملا کر چلا آیا"

کہانی بیان کرنے والا یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ ایک عورت بولی :-

"تو کیا ہوا۔ اس کا مقصد نہایت سہل الحصول تھا کیونکہ اُسنے بے حد سادہ زندگی پر اکتفا کرلی تھی۔ وہ ضرور کوئی نادان لڑکی ہوگی!"

دوسری عورت آہستہ سے بولی "نادان ہی سہی مگر وہ خوش تو تھی!"

دنیا کے اُس پار دُور فاصلے پر کورسکا رات کی تاریکی میں آہستہ آہستہ چھپتا ہوا پھر سمندر میں غائب ہوگیا۔ اور اس کا وسیع سایہ بھی جو زبان حال سے محبت کے ان حقیقی پرستاروں کی کہانی بیان کررہا تھا، ساتھ ہی چھپ گیا!

(موپاساں)

طاہر قریشی بی اے



قطعات

(۱)

دامانِ دل سے چاکِ سبو سیو اور بے ہوش رہو
جیسی ملے شراب پیو اور خموش رہو
مجبوریوں کا ذکر ہے سامانِ خود کشی
جب تک نہ آئے موت جیو اور خموش رہو

(۲)

غم ہائے زیست کا نہ کرو اور بے ہوش رہو
آفاتِ دہر سے نہ ڈرو اور خموش رہو
ہاں بے ہوش رہو کہ نام ہی کا ہے زندگی
بے آئی موت تم نہ مرو اور خموش رہو

ضیا فتح آبادی

پریتم کو ڈھونڈنے

پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

پھولوں کے رنگ میں
جل کی ترنگ میں
کرنوں کی جنگ میں
پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

بھونرے کی تان میں
کلیوں کی آن میں
نرگس کے دھیان میں
پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

پپیہے کے جھاڑ میں
بوندوں کی آڑ میں
بن میں پہاڑ میں
پریتم کو ڈھونڈنے
میں تو سکھی آج گئی پریتم کو ڈھونڈنے

اندرجیت شرما

شریکِ سفر

مجھے نہیں معلوم کہ ہم میں سے پہلے کون ٹرین پر سوار ہوا۔ بلکہ کافی عرصہ تک میں نے اس کے وجود کو بھی اپنے ڈبہ میں محسوس نہیں کیا۔ مگر وہ میرے ساتھ تھا ...... میرا شریکِ سفر!

میں شب کی اخیر گاڑی میں سفر کر رہا تھا —— بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کی ممبئی سے بارولی جانے والی وہ سست رفتار پسنجر ٹرین جو تمام اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی جاتی ہے جس کی مسافت کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی اور جس میں سفر کرنے والے کو "بقائے دوام" کا لطف آ جاتا ہے۔ روانگی کے موقع پر میرا کمپارٹمنٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن ہر آنے والے اسٹیشن پر وہ دو چار چار مسافر اترتے گئے۔ بالآخر میں اکیلا رہ گیا۔ یا محض مجھے گمان ہوا کہ میں اکیلا ہوں۔

رات کے وقت ریل کے پُرشور ڈبہ میں تنہا سفر کرنے سے دل میں آزادی کا ایک خوش گوار خیال پیدا ہونے لگتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی قیاس کیا ہے کہ ایسے موقع پر آپ کو کس قدر آزادی مل جاتی ہے؟ اس وقت آپ بالکل آزاد ہوتے ہیں مکمل سوراج کے مالک!! آپ بلا کسی روک ٹوک کے جو آپ کا جی چاہے کر سکتے ہیں۔ آپ خود کو مخاطب کر کے جس قدر بلند آواز سے چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ کوئی آپ کی سننے والا نہ ہو گا۔ اگر آپ چاہیں تو کسی فرضی مخاطب سے مباحثہ حجت بلکہ ہاتھا پائی بھی کر سکتے ہیں۔ بلا کسی مخالفت کے آپ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ کوئی آپ کو اس حالت میں دیکھنے نہ آئے گا۔ آپ ناچ سکتے ہیں۔ آپ گا سکتے ہیں۔ آپ ہاکی اور گولف کی مشق کر سکتے ہیں۔ آپ ڈبہ کی ناہموار زمین پر گولیاں کھیل سکتے ہیں، بلا خوف تردید آپ اپنے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کھول سکتے ہیں اور پھر بند بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی آپ کی اس حرکت پر ناک بھوں نہیں چڑھائے گا۔ آپ اپنے قریب کی دونوں کھڑکیاں کھول سکتے ہیں اور کھولنے کے بعد بند کر سکتے ہیں بلکہ اگر آپ چاہیں تو اپنی آزادی کی خوشی میں کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں کھولتے اور بند کرتے رہیں جب تک کہ آپ کے ہاتھ تھک نہ جائیں۔ آپ حسب خواہش ڈبہ کے کسی گوشے میں آرام کر سکتے ہیں بلکہ چاروں گوشوں کو یکے بعد دیگرے آزما سکتے ہیں۔ آپ خوب پھیل کر بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ اپنی چادر سے لمبی ٹانگیں پھیلا کر لیٹ سکتے ہیں۔ آپ ایک بنچ پر دوسرے والے قانون کو توڑ کر ایک پر بیٹھ کر دوسرے پر پیر، تیسرے پر بستر، چوتھے پر تکیہ اور پانچویں پر اسباب رکھ سکتے ہیں۔ غرض کہ ایسے موقع پر آپ آزاد ہوتے ہیں اپنے فعل کے مختار!

آزادی کی اس رات کو میں نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ جو کچھ میں نے کیا۔ وہ ان سے کہیں زیادہ معمولی حرکت تھی جب میرے درجے کے آخری مسافر نے اپنا اسباب سمیٹ کر کمپارٹمنٹ کو خیرباد کہا تو میں نے اپنے ہاتھوں سے اخبار رکھ دیا۔ اور جمائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا کھڑکی کے باہر گرمیوں کی خاموش رات کو دیکھا جس میں میں سفر کر رہا تھا۔ ڈبہ کی دوسری جانب گیا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر بلا وجہ اسے بند کر دیا سگریٹ روشن کر کے چمنی کی طرح منہ سے دھواں خارج کرتا ہوا اپنی نشست پر آ کے بیٹھ گیا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

یہاں پر میں نے اپنے شریکِ سفر کے وجود کو محسوس کیا۔ وہ آیا اور میری ناک پر بیٹھ گیا!!

وہ اُن پر والے صاحب بینش کیڑوں میں سے ایک تھا جنہیں ہم "مچھر" کہتے ہیں میں نے اسے اپنی ناک پر سے اُڑا دیا۔ اس نے ڈبہ میں چکر لگا کر فضا کا معائنہ کیا۔ یکے بعد دیگرے تمام کھڑکیوں میں حاضری دی لیمپ کے گرد طواف کیا اور آخر میں شاید اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس گوشے میں بیٹھے ہوئے "عظیم الجثہ جانور" سے زیادہ پُر لطف ڈبہ میں اور کوئی شئے نہیں ہے چنانچہ اس نے مراجعت کی۔ اب اس کی نظرِ عنایت میری گردن پر تھی۔

میں نے اسے دوبارہ اڑا دیا۔ اس نے ڈبہ کا ایک اور طواف کیا۔ لوٹا اور نہایت ڈھٹائی سے میرے ہاتھ کی پشت پر بیٹھ گیا۔ "بس بس!" میں نے کہا "آخر بلند حوصلگی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دو بار میں نے تمہیں جتلا دیا کہ میں معمولی آدمی نہیں ہوں میرے غصہ کے آگے کوئی گستاخی کی ہمت نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ میں تمہیں پھانسی کا حکم سناتا ہوں۔ یہ عدالت کا فیصلہ

اور انصاف کا تقاضا ہے۔ تمھارے خلاف کئی الزام ہیں۔ تم آوارہ ہو تم امن عامّہ کے دشمن ہو۔ تم دفعہ ۱۴۴ کی زد میں ہو۔ تم بلاٹکٹ سفر کر رہے ہو۔ تم ..... دیکھو میں کہتا ہوں یہ تمام جرائم تمھیں تختۂ دار پر لے جانے کے لئے کافی ہیں۔ تم سُن رہے ہو۔ اب تمھیں موت کا جام پینے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ تم نے سُنا؟

وہ یہ سب کچھ سُن رہا تھا مگر ہٹ دھرمی ملاحظہ ہو کہ اس پر میرے غصّہ سے تمتماتے ہوئے چہرے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ بدستور میرے ہاتھ کی پشت پر بیٹھا رہا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دایاں ہاتھ گھما کر اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ کر دیا لیکن وہ نہایت آسانی سے کترا کر نکل گیا۔ کیا میں زک اٹھا سکتا تھا؟ اور وہ بھی ایک مچھر سے؟ میری خودداری نے یہ گوارا نہ کیا۔ میں نے اخبار سے اسے مارنا چاہا لیکن وہ وار خالی دے کر اڑ گیا۔ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔ اپنی نشست سے اچھل کر میں نے لیمپ کے گرد اس کا تعاقب کیا۔ میں نے ہر پھرتی اور چالاکی سے کام لیا۔ پہلے اسے ایک جگہ بیٹھ جانے دیا۔ پھر آہستہ سے آ کر یکبارگی دھاوا بول دیا۔ مگر نتیجہ معلوم!

وہ کھلے بندوں مجھ سے کھیل رہا تھا۔ ایک ماہر سانٹھ مار کی طرح۔ ایک عظیم المرتبت ہستی سے۔ خیال فرمائیے۔ اس نے اپنی تفریحِ طبع کے لئے انتخاب بھی کیا تو کسے؟ اپنے سے اچھے خاصے پَوَن چکی کے سے انسان کو للکارنا بھی عجیب مذاق تھا۔ اس نے مجھے تختۂ مشق بنایا اور میں بنا رہا۔ کیا کرتا مجبور تھا۔

پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے ڈبّہ میں تنہا نہیں ہوں بلکہ یہ مچھر میرا شریکِ سفر ہے۔ نصف ڈبّہ کا حق دار اور مساوی حقوق کا مالک!! اب مچھر میرے لئے محض ایک کیڑا نہ تھا بلکہ اس کی وقعت میری نگاہوں میں بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اسے اپنا ہم رتبہ سمجھنے لگا۔ اور خود کو اس سے اعلیٰ و افضل سمجھتا تو کس برتے پر۔ جب کہ میں ایک معمولی اور سب سے پہلے ہی مقابلہ میں اس سے شکست کھا چکا تھا۔

میں نے اسے موت کا حکم سنا دیا تھا اور اسے مارنے کی کوشش بھی کی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ یہ میری طاقت سے باہر ہے۔ یہ میرے لئے بڑے شرم کی بات تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں رحم دلی سے کام لوں۔ کیونکہ یہ بزرگانِ سَلَف کی صفت رہی ہے۔ اور اس سے میں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتا ہوں۔

"میں اپنا سنایا ہوا پھانسی کا حکم واپس لیتا ہوں" میں نے اپنی نشست کی طرف مراجعت کرتے ہوئے اپنے شریکِ سفر سے کہا "میں تمھیں موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا۔ مگر ہاں معاف ضرور کر سکتا ہوں۔ اور میں نے تمھیں معاف کیا۔"

میں اخبار سنبھال کر عزت کے ساتھ اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ میرا ہم سفر اڑتا ہوا آیا اور اخبار پر بیٹھ گیا۔ "بے وقوف" میں نے کہا "تم خود ہی جال میں پھنس گئے۔ اگر میں اخبار کو دونوں جانب سے جنبش دوں تو تم امن پسندوں کے انعامی مقابلہ میں گاندھی جی کی شرکت اور آئندہ جنگِ عظیم کے امکانات کی سرخیوں کے درمیان پس کر آٹا ہی تو ہو جاؤ۔ مگر نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے تمھیں ایک بار معاف کر دیا ہے اور میں تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں جو منہ سے کہتا ہوں اسے کر دکھاتا ہوں۔ میں تمھیں مارنا بھی نہیں چاہتا کیونکہ میں نے تمھیں خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میرے خیالات تمھاری طرف سے تبدیل ہو گئے ہیں۔ کیا میں کہہ دوں کہ .... کہ مجھے تم سے محبت ہو چلی ہے۔ بہرحال تقدیر نے آج کی شب ہمیں ہم سفر بنا دیا۔ میں تمھارے لئے باعثِ تفریح بنا۔ اور تم میرے لئے۔ غرض دونوں برابر رہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی غیر فانی نہیں ہے۔ ہماری زندگیاں یکساں ہیں۔ شاید تم اپنے سفر کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور میں بھی اپنے سفرِ زندگی کے متعلق مکمل معلومات نہیں رکھتا۔ تم اندھیری رات میں ان دیکھی منزلوں کو طے کرتے ہوئے ٹرین کے روشن ڈبّہ میں داخل ہو گئے ہو۔ اور کچھ عرصہ لیمپ کے گرد چکّر لگانے کے بعد بھیانک فضا کی مہیب تاریکی میں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔ میں بھی عدم کی ان دیکھی منزلیں طے کرتا ہوا عالمِ وجود میں آ گیا ہوں۔ کچھ عرصہ دنیاوی لذّتوں کے حصول میں کوشاں رہنے کے بعد نہ معلوم کب اور کہاں چلا جاؤں گا۔ ہم اچانک نمودار ہو جانے والے بھوت کی طرح عالمِ شہود میں آ جاتے ہیں اور اسی طرح معدوم ہو جانے کے بعد اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ شاید ....

"تو آپ اسی اسٹیشن پر اتر جائیں گے جناب؟" ایک قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے مجھے منزلِ مقصود سے آگاہ کر دیا۔

"شاید میری آنکھ جھپک گئی تھی۔" میں نے مسافر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور اپنی ٹوپی اور چھڑی اٹھا کر ڈبّہ سے باہر نکل آیا۔

گاڑی پلیٹ فارم پر سے آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں دیکھا کہ میرا ہم سفر لیمپ کے گرد چکّر کاٹ رہا ہے۔

(گارڈنر)

غلام عبّاس "مولوی"

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں اپنے گاؤں سے ان کے شہر میں رہنے کے لئے گئی۔ اس وقت میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ جب میں اپنے گاؤں میں تھی تو ان کو جانتی تک نہ تھی۔ ان کے شہر میں میرے ایک عزیز بھی رہتے تھے۔ پہلے پہل میں اپنے عزیز ہی کے گھر اتری وہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے عزیز کے عزیز تھے مجھ سے تو کوئی خاص رشتہ داری نہ تھی۔

وہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صبح اپنے عزیز کے یہاں آئی بس اسی وقت ان کو پہلی بار دیکھا۔ میں نے رسمی سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ دوپہر کو کھانے سے فراغت پا کر گھر کے سب لوگ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ساری فضا خاموش ہوگئی۔ دھوپ کی وجہ سے کمروں کے دروازے بند کر دئے گئے تھے۔ اس لئے کچھ اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ وہ عمر، وہ قیامت کا زمانہ۔ پھر میری شوخ طبیعت بھلا مجھ سے بستر پر خاموش کیسے لیٹا جاتا! اٹھ کر سارے گھر کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے میں ان کے پاس پہنچی۔ کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کے بالوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا: "اخاہ! آپ کا خط تو بہت اچھا ہے۔ کیا لکھ رہے ہیں؟"

انھوں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میری بے باکی اور بے تکلفی پر کچھ مسکرائے پھر کہا: "میرا خط تو بہت معمولی ہے۔ کچھ نہیں ایک کہانی کا ترجمہ کر رہا تھا۔ آؤ! بیٹھو" میں کرسی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے ان کو نہایت غور سے دیکھا۔ کوئی بیس۔ بائیس برس کا سن چھریرا جسم میانہ قد۔ پتلی کمر۔ سانولا نمکین رنگ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پتلی سی ناک مسی کے رنگ کے ہونٹ۔ کشادہ پیشانی۔ سیاہ گھنی ابرو۔ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد مجھے ان کی صورت اچھی معلوم ہوئی۔ میں مسکرا دی۔ انھوں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی تھیں؟ کیوں ہنسیں؟ تم تو بڑی شریر معلوم ہوتی ہو"

میں نے کہا: "کچھ نہیں۔ آپ ہی کو دیکھ رہی تھی صبح اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ ہوں! میں تو بالکل شرارت نہیں کرتی۔ لیکن آپ کی طرح سب لوگ کہتے ہیں کہ میں شریر ہوں۔ میں نے تو بہت دن سے شرارت کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

اس پر وہ مسکرائے۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

چند روز بعد انھوں نے مجھے اپنی منگیتر کی تصویر دکھائی۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ان کی رشتے کی بہن کی تصویر ہے لیکن میں سمجھ گئی کہ ان کی منگیتر ہوں گی۔ رشتے کی بہن ہوئیں تو کیا ہوا۔ بہرحال مجھے ان کی منگیتر پسند آئیں۔ میرے ہی صوبے کی لڑکی صوبے کا مخصوص لباس۔ وہی نزاکت میں نے کہا: "اچھی تو ہیں لیکن آپ کا گھر کب آباد کریں گی؟"

انھوں نے کہا: "دیکھو! پھر وہی شرارت کی باتیں۔ یہ تو میرے رشتے کی بہن ہیں"

میں نے کہا: "ہاں! ہوں گی لیکن ساتھ ہی ساتھ "وہ" بھی تو ہیں"

اس پر وہ مسکرا دئیے۔ اسی روز میں اپنے گھر چلی آئی۔

میرا گھر ان کے مکان سے بہت دور نہ تھا۔ وہ اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں طفلانہ پریشانیوں میں مبتلا رہتی تھی۔ وہ مجھے بہت تسکین دیتے تھے۔

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ موسم گرما واپس جا رہا تھا۔ امنگیں پیدا کرنے والی برسات آ رہی تھی کبھی کبھی ایک دو بادل برس جاتے۔ جھڑی تو نہ لگی تھی۔ میرے گھر میں سنترے کا ایک باغ تھا کچھ سنترے پک چکے تھے کچھ پک رہے تھے اور چند پکنے کی آرزو کر رہے تھے سنتروں کی خوشبو آہستہ آہستہ جذبات بیدار کر رہی تھی۔ بیلے کی کلیاں قاصد بن کر جانے کے لئے مچل رہی تھیں۔ آسمان پر کالے کالے اور بھورے بھورے بادل چھائے رہتے تھے۔ سنترے کے درختوں اور بادلوں کا افق عجب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ عرصے سے وہ میرے گھر نہ آئے تھے۔ ایک دن شام کو میں معمولی تنہا ادھی پہچے حسب معمول سنترے کے باغ میں

بیٹھی تھی (اس عرصے میں میں ایک شہری لڑکی ہو چکی تھی۔ شہر کی لڑکیوں کی طرح شام سنگھار کرکے باغ میں جا بیٹھتی۔ اگر کیلی ہوتی تو کسی کتاب یا رسالے کا مطالعہ کرتی، اتنے میں دیکھا کہ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی اچکن پہنے چلے آ رہے ہیں مسکراتے ہوئے اور اپنی ترکی ٹوپی کا پھندنا ہلاتے وہ میری طرف بڑھے میں استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا "آیئے۔ آیئے!"

روز کی حرف و حکایات تھی وہ بھی نہ رہی
گاہے گاہے کی ملاقات تھی وہ بھی نہ رہی

لیکن ذرا کسی دوسرے کا بھی خیال کر لیا کیجئے۔ میں تو آپ کو اتنا یاد کرتی ہوں اور آپ تو ایک نہ دو اتنے اتنے دن بعد آتے ہیں کچھ تو انصاف کیجئے۔"

وہ کہنے لگے "ماشاء اللہ تم تو خوب بولنے لگی ہو، یہ باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟"

میں نے کہا "باتیں تو حالات سکھا دیتے ہیں۔ ہاں، شعر ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ اس وقت یاد آ گیا۔ اس لئے آپ پر صرف کر دیا۔"

وہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ آج وہ خلافِ معمول مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا "کچھ گاؤ۔ تمھیں گانا تو آتا ہو گا۔"

میں نے کہا "آتا واتا تو نہیں۔ ابھی تو سیکھتی ہوں۔"

غضب کا موسم سنترے کی خوشبو۔ گھٹا چھائی ہوئی۔ پھر ان کا اصرار میں گانے کے لئے تیار ہو گئی۔ کچھ شرما کر ہاتھوں میں منہ چھپا کر ملہار کی ٹھمری سنائی گیت کے الفاظ بڑے پُر درد تھے۔ میں نے ذرا سی دیر کے لیے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ میں گھبرا گئی۔ اس وقت یہ نہ جانتی تھی کہ الفاظ کے درد سے انسان رو بھی سکتا ہے۔ حیران ہو کر پوچھا "کہئے کیسی طبیعت ہے؟ آپ کیوں رونے لگے تھے؟" انھوں نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور سمجھ گئے کہ میں ان کے رونے کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ وہ بات ٹالنے کے لئے بولے "کچھ نہیں ایک بات یاد آ گئی تھی اس لئے آنسو نکل آئے" "شاباش! تم بہت اچھا گاتی ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔"

پھر اور باتیں ہونے لگیں۔ اس روز وہ خلافِ معمول رات تک بیٹھے رہے۔ جاتے وقت بھی کچھ اپنے اوپر جبر کر کے گئے۔ اس دن کے بعد سے وہ میرے پاس قریب قریب روزانہ آتے۔ خوب باتیں کرتے۔ اس عرصے میں میں بھی ان سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ باہر سب ہی لوگ آتے تھے۔ بعض اشخاص کو آتے دیکھ کر وہ مجھ سے اندر جانے کو کہتے۔ میں باوجود اس کے کہ ان لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتی تھی اٹھ کر چلی جاتی اور مجھے ذرا بھی ناگوار نہ گزرتا۔

ایک دن حسبِ معمول وہ شام کو آئے۔ تھوڑی دیر ہوئی بارش ہوئی تھی اور اب دھوپ نکل آئی تھی۔ کیسا اچھا وقت تھا۔ مٹی سے ہلکی سی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ نیم کے درخت نہائے ہوئے کھڑے تھے۔ درختوں سے پانی کے قطرے کبھی کبھی ٹپک پڑتے تھے۔ پپیہا الگ چہک رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کالے کالے بادل بھاگے پھر رہے تھے کہیں ہلکے سے بادل میں سورج مسکرا رہا تھا کبھی بادل ہٹ جاتا تو بالکل بے نقاب ہو جاتا۔ غرض بڑا اچھا سماں تھا۔ میں ان کا انتظار کر ہی رہی تھی کہ وہ آ گئے۔ میری خوشی نہ پوچھئے۔ وہ میری آسمانی ساڑی کو دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ کہا "آج تو بہت تر و تازہ اور خوش خوش نظر آ رہی ہو۔" میں نے کہا "خوب! خوش کیوں نہ نظر آؤں؟ میں انتظار کروں کہ آپ آ جائیں۔ اور پھر بھی اداس ہی بیٹھی رہوں؟"

انھوں نے کہا "اچھا! شکریہ۔ آج تو کہیں سیر کو جانے کو دل چاہتا ہے۔" میں نے کہا "بازار تو مجھے بھی جانا تھا۔ دور کے راستے سے آہستہ آہستہ چلئے تو سیر بھی ہو جائے گی۔" وہ راضی ہو گئے۔ میں والدہ سے پوچھ کر ان کے ساتھ ہو لی۔

راستے میں انھوں نے پوچھا "کیا کیا خریدو گی؟"

میں نے بتایا "چاکولیٹ بسکٹ کا ڈبہ۔ چوٹی میں ڈالنے کا فیتہ اور باقی چیزوں کی فہرست ہے۔"

انھوں نے پوچھا "فیتہ کس رنگ کا لو گی؟"

میں نے کہا "اودا یا سبز"

انھوں نے کہا "تمھیں سب سے زیادہ کون سا رنگ پسند ہے؟"

میں نے کہا "سبز"

انھوں نے پوچھا "آسمانی نہیں اچھا لگتا؟"

میں نے کہا "جی ہاں! وہ بھی اچھا ہوتا ہے۔" اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے بازار پہنچ گئے۔ سب چیزیں خریدیں اور واپس ہوئے۔ فیتہ میں نے آسمانی رنگ کا خریدا تھا۔ واپسی میں وہ کہنے لگے "فیتہ تو تم نے آسمانی ہی خریدا!" اس پر میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی۔ ہم لوگ گھر پہنچے۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے گھر چلے گئے۔ رات کو میں بستر پر لیٹے لیٹے آسمانی رنگ کے متعلق سوچنے لگی "آسمانی رنگ واقعی ہوتا تو اچھا ہے۔ انھیں کیوں پسند ہے؟ مجھے سبز کیوں پسند ہے؟ آسمان تو آسمانی رنگ کا ہے اور تمام درخت سبز ہوتے ہیں۔ اللہ میاں کو تو دونوں رنگ پسند ہیں۔"

انھیں خیالات نے مجھے تھپکنا شروع کیا اور میں دل سے باتیں کرتے کرتے سو گئی۔

چند روز تک وہ اسی طرح آتے رہے پھر ہم لوگ ایک دوسرے مکان میں چلے گئے۔ نئے مکان میں وہ ایسے وقت آتے کہ میں اسکول میں ہوتی۔ والدہ سے باتیں کر کے چلے جاتے۔ والدہ نے مجھے بتایا کہ وہ میری کاپیاں اور کتابیں دیکھ جایا کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ "بیچاری اپنی عمر کے لحاظ سے تو بہت کچھ کرتی ہے ڈرائنگ تو غیر معمولی طور پر اچھی ہے۔" میں نے والدہ سے کہا "ان کی قدر دانی ہے۔"

ایک روز شروع رات پڑھنے کے کمرے میں بیٹھی ہوئی میں ایک انگریزی ناول کا آخری باب پڑھ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ میز سے پاؤں ٹکائے کرسی پر جھول رہی تھی۔ اتنے میں وہ آ گئے۔ پیچھے سے میری کرسی روک لی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو مسکرا دئے اور قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی تھیں؟" میں نے کتاب پیش کر دی۔

کہا "اخاہ! یہ تو میں نے بھی پڑھی ہے۔ کیا تم نے ختم کر لی؟"

میں نے کہا "جی! ابھی ابھی ختم کی ہے۔"

پوچھا "پسند آئی؟ ہیروئن کا کیریکٹر کیسا تھا؟"

میں نے کہا "کتاب تو اچھی خاصی ہے۔ ہیروئن کے کیرکٹر کے متعلق کیا کہوں؟ عشوہ، شوخی، ناز و انداز و ادا سب ہی تو تھا۔ اور یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے کہ جہاں حسن ہوتا ہے وہاں تغافل بھی ہے۔"

اس پر وہ کہنے لگے: "SO YOU HAVE GOTA ROMANTIC HEART"

اس پر میں جھینپ سی گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ میرے چہرے سے میرے خیالات کو پڑھنے لگے۔ اسی وقت کھڑکی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ میں نے خنکی محسوس کرتے ہوئے اور بات ٹالنے کے لئے بھی کہا "سردی ہو رہی ہے چائے بنوا دوں؟"

میں نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ وہ سمجھ گئے کہ میں بات ٹالنے کیلئے کہہ رہی ہوں۔

کہنے لگے: "مجھے تو اس وقت سردی نہیں محسوس ہو رہی۔ نہ چائے پینے کو طبیعت چاہتی ہے۔" اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے میز پر سر رکھ دیا اور ان کی طرف ایک بار دیکھا پھر فوراً ہی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ باہر سے درختوں کی سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی کبھی کبھی کوئی چڑیا آہستہ آہستہ بولنے لگتی۔ میرے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے میں ان کے سامنے آتی تو تھی مگر پہلے کی طرح نہیں اب سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ آتی۔ ان کی نظر بچا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھتی اور جب وہ مجھے مخاطب کرتے تو دوسری طرف دیکھنے لگتی۔ ان کے پاس بیٹھنا بھی چاہتی تھی اور جھجکتی بھی تھی۔ دن گزرتے گئے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ میرے ساتھ ان کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔ آخری مفصل ملاقات کے دن وہ میرے ساتھ ایک معما حل کر رہے تھے۔ مجھے اس زمانے میں معمے حل کرنے کا بڑا شوق تھا۔

کئی سال گزر گئے۔ میں دوسرے شہر میں چلی آئی۔ میں نے سنا کہ ان کی منگیتر کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی ہوئی ایک دن وہ میرے کسی دوست کے یہاں مجھ سے ملنے آئے لیکن میں اس وقت وہاں نہ تھی۔ ان کے پاس بھی زیادہ وقت نہ تھا۔ اس لئے چلے گئے۔ مجھے ان سے نہ ملنے کا بڑا افسوس ہوا۔ ایک دن میں ان کے شہر گئی ہوئی تھی۔ سڑک پر سے انھیں گزرتے دیکھا لیکن بلا نہ سکی۔

ایک سال بعد میں نے سنا کہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ بہت غمگین رہتے ہیں۔ مجھے ان کی بیوی سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہوا سنا تھا کہ ہر لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔ بیچاری شادی کے بعد صرف ایک سال زندہ رہیں۔

اب مجھ سے ان سے کبھی ملاقات ہوئی اور میری ہمت پڑی (کیونکہ اب مجھ میں وہ پہلی سی بے باکی نہیں رہی) تو پوچھوں گی کہ آپ کو وہ زمانہ اور وہ باتیں بھی یاد ہیں کہ نہیں؟

دیکھوں پھر وہ کیا کہتے ہیں!

سلیمہ سلطانی بیگم لکھنوی



اتنے بڑے شہر میں دربدر مارے مارے پھرنے کے لئے اور صرف ایک وقت کی سادہ خوراک حاصل کرنے کی مسلسل بے فائدہ جستجو کے لئے مجھے کوئی چیز نہ جگا سکے گی۔ میں جانتا تھا کہ لندن کی گلیوں میں پھرنے والے فقیر اگر ہوشیار ہوں تو اچھی روزی کما لیتے ہیں۔ شہر ان سے بھرا پڑا ہے لیکن میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی اور نہ مجھ سے یہ ہو سکے گا بعض نے اپنے آپ کو کسی طرح جیل تک بھی پہنچایا جہاں انھیں تین وقت کا کھانا میسر ہے لیکن یہاں بھی میری خودداری سدِ راہ بنے گی۔ میں نے مصمم ارادہ کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ میں سوسائٹی پر بار بن کر نہیں رہوں گا۔ ان حالات میں اور ایسے طریق پر خودکشی کا ارتکاب نہ صرف قابلِ احترام و عزت ہوگا بلکہ کسی پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اور اس میں صرف تھوڑی سی گیس خرچ ہوگی۔ اگرچہ میرے جسم کی تجہیز و تکفین کا کام ضرور باقی رہ جائے گا لیکن اس کے لئے بھی میں کسی ہسپتال کے نام خط چھوڑ جاؤں گا۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد میرا اعتقاد اور زیادہ پختہ ہوتا گیا کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل کبھی بھی نہیں ہوئی اور اس کو چھوڑ دینے کے بعد ہی میں مطمئن ہو سکتا ہوں۔ میں نے دنیا میں آتے وقت کسی سے اجازت طلب نہیں کی تھی۔ اس لئے یہاں سے جانے کے لئے بھی میں کیوں خودمختار نہ ہوں؟ اور اس کے بعد اگر مجھے معلوم ہوا کہ اگلا جہان بھی ہے، اور مجھے اس خدا کے سامنے جانا بھی پڑا جس میں اعتقاد رکھنے کے لئے میرے والدین مجھے سکھاتے رہے تو میں یہ حالات پیش کر دوں گا جو مجھے یہاں پیش آرہے ہیں میں یقیناً صحیح راستے پر ہوں گا۔ اور اس کا انصاف میرے تجربے میں بالکل نئی چیز ہوگا۔

میں نے دو مختصر سے خط لکھے اور انھیں میز پر رکھ دیا۔ جہاں سے وہ بآسانی مل سکتے تھے اور اخبارات کے لمبے چوڑے اوراق پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے بنائے اور اپنے جیبی چاقو کی نوک سے انھیں دروازے اور کھڑکی کے سوراخوں میں اس طرح بھر دیا کہ کوئی سوراخ باقی نہ رہا۔ یہ کام میں نے بہت اچھی طرح کیا۔ کیونکہ میں اپنے ارادوں میں ناکامیاب نہیں رہنا چاہتا تھا مبادا کوئی گیس سونگھ لے اور مجھے جسم و جان کا تعلق منقطع ہونے سے پہلے بچا لے یہ کام ختم کرنے کے بعد میں نے گیس کا بٹن کھول دیا اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا میں نے اپنے ہاتھ پاؤں آرام سے پھیلا دیئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور انتظار کرنے لگا کہ موت سے مقابلہ کرنا دروازے میں سے گزر کر کسی خوشنما دنیا میں پہنچ جانے کی مانند ہے یا کسی پہاڑی پر سے ابدی خلا یا لاہوت میں کود پڑنے کی طرح۔

میں دونوں کے استقبال کے لئے تیار تھا میں نے چند سانس کھینچ کھینچ کر لئے۔ لیکن گیس کافی تیزی سے نہیں پھیل رہی تھی اور ابھی تک مجھ پر اثر نہ کر سکی تھی۔

دفعتہً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے رگ و ریشے میں ایک خوفناک سی لہر دوڑ گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مالکِ مکان ہوگا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی اور میرے دروازے پر دستک نہیں دیتا تھا۔ یہ مجھ سے اگلے ہفتے کا کرایہ وصول کرنے آیا ہوگا۔ اس دفعہ وہ ایک دن پہلے آگیا ہوگا۔ میں دروازہ کھولنے پر مجبور تھا کیونکہ دوسری صورت میں اس کے پاس چونکہ چابی تھی وہ اندر آسکتا تھا اور میرے ارادوں کو درہم برہم کر سکتا تھا۔ میں بستر سے کود کر باہر نکلا گیس کا بٹن بند کر دیا۔ اور جلدی سے دروازے کی طرف اس ارادے سے بڑھا تاکہ تھوڑا سا کھول کر اس بڈھے سے کہوں کہ کرائے کے لئے کل آئے۔ میں نے دروازہ ایک انچ یا اس سے زیادہ کھولا اور دیکھنے لگا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ باہر ہال میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ چونکہ وہ میرے ارادوں میں مخل ہو چکی تھی میں نے غضب ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور اس نے عاجزانہ طور پر ایک طاشت میری طرف بڑھا دی جو بوٹوں کے بہت سی قسم کے تسموں اور فیتوں سے پُر تھی۔ اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جناب مجھے آپ کو تکلیف دینے کا بہت افسوس ہے لیکن میں نے خیال کیا شاید آپ کو تسموں کی ضرورت ہو۔ انکی قیمت صرف دو پنس فی جوڑی ہے میرے پاس ہر قسم کے اور ہر سائز کے جیسے آپ چاہیں موجود ہیں۔"

میں اپنی زندگی پر نفریں بھیج رہا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے یہ بتانے میں کوئی فائدہ نہیں کہ میں مفلس اور قلاش ہوں میرا خیال ہے کہ اس نے میری حالت کو غلط سمجھا۔ کیونکہ جلدی سے اس نے وہ طاشت میرے سامنے سے ہٹا لی اور پہلے سے بھی زیادہ کانپتی آواز میں کہنے لگی۔

"براہِ مہربانی پولیس کو نہ بلائیے۔ میں جانتی ہوں کہ ہم لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں لیکن مجھے چونکہ یہ ضرور کہیں نہ کہیں کچھ بیچنے ہیں..... میں ابھی چلی جاؤں گی مجھے ان سے نہ نکلوائیے۔"

اب یہ دیکھتے ہوئے کہ میں اس کی طرف غصے سے نہیں دیکھ رہا اس نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کئے اور انگلیوں سے اپنے بازو کو کھجلانا شروع کیا۔

تجب میں دوسری منزل پر کام کر رہی تھی تو ایک آدمی نے مجھے زینے پر سے دھکا دے دیا۔ شاید وہ مجھے گرانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نیچے گر پڑی

اس سے مجھے یہ زخم آیا۔"

ایک لمحے کے پس و پیش کے بعد اس نے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔

"اگر آپ ان فیتوں کو خریدنا نہیں چاہتے تو مجھے کچھ رنج نہیں۔ دنیا میں شاید کسی کو ان کی ضرورت نہیں لیکن کیا میں کچھ دیر کے لئے آپ کے کمرے میں آسکتی ہوں؟ اور ذرا آرام لینے کے لئے بیٹھ سکتی ہوں۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ میں اس وقت بڑی تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ میں چند لمحوں کے بعد بالکل درست ہو جاؤں گی۔"

میں نے گونگوں کی طرح اسے اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ اس نے کمرے کی حالت کا اچھی طرح جائزہ لیا اور میرے بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی ایک نظر اس کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کی عمر انیس بیس برس کے قریب ہوگی۔ اگر اسے کھانے کے لئے اچھا کھانا اور پہننے کے لئے اچھا لباس ملتا تو وہ ضرور حسین معلوم ہوتی۔ اب غربت میں اس کی زندگی تباہ تھی لیکن میری زندگی بھی تو تباہ ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کی اس حالت کی فکر بے سود تھا۔

اس دوران میں جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں اس نے میری خودکشی کی تیاریوں کو بھانپ لیا میرے خیال میں اس نے سب معاملہ اسی وقت سمجھ لیا ہوگا جب اس نے دروازے پر دستک دی تھی اور جب میں زندگی کی الجھنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"کیوں —— تم —— تم —— تم؟"

"ہاں" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "تم نے یہ بھانپ لیا۔ اگر تم دس منٹ بعد آتیں تو میں تمھاری آواز بھی نہ سن سکتا۔ جب تم نے دروازے پر دستک دی گیس مجھ پر اثر کر رہی تھی۔ اب جوں ہی تم جاؤ گی میں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں گا۔ اس پر بحث کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔" اس نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا۔

"لیکن کیوں؟ کیا تم محبت کے ستائے ہوئے ہو؟ کیا تمھیں کسی عورت سے تکلیف پہنچی ہے؟ میری اس بات پر یقین کرنا۔ عورتیں کسی توجہ اور تشویش کی مستحق نہیں ہیں۔"

میں نے انکار کے طور پر اپنا سر ہلایا اور کہا۔

تمھارا خیال غلط ہے۔ میں عورتوں کے جھگڑے میں کبھی نہیں پڑتا۔ میرا قصہ اس سے زیادہ دردناک ہے۔ صرف ایک چیز کے لئے میری زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ گزشتہ دو دن سے مجھے کھانے کو کچھ نہیں ملا بلکہ مجھے یہ کمرہ خالی کرنا ہوگا۔ میں کہاں جا سکتا ہوں؟ کہیں نہیں۔ اس دنیا میں کوئی انسان نہیں جسے میری فکر کرنے کی ضرورت ہو۔ میں کسی طرح بھی کوئی کام حاصل نہیں کر سکا اور اب میں تلاش کرتے کرتے بھی تنگ آ گیا ہوں۔ شاید میں اس قابل نہیں لیکن میں کبھی بھی ان مصائب کو آسان کرنے کے لئے غیر شریفانہ طرز زندگی اختیار نہیں کروں گا۔ اور اس سے پیشتر کہ زندگی مجھے اور اذیت دے میں اپنے آپ کو ختم کر رہا ہوں۔"

اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

لیکن مایوس ہونے کی کونسی وجہ ہے۔ تم نوجوان ہو!

میں نے جواب دیا "نہیں امید میرے لئے نہیں، میں نے اب تک چھبیس سال گزارے ہیں ان میں بہت کم خوشگوار لمحات میرے لئے آئے ہیں۔ اور اب کیا یقین ہو سکتا ہے کہ آئندہ چھبیس سال بھی ایسے نہیں گزریں گے میں کیوں اس دکھ دینے والی دنیا میں رہوں جہاں مجھے زبردستی رکھا جا رہا ہے حالانکہ میں یہ گیس کا بٹن دبا دینے سے ابدی نیند سو سکتا ہوں —— ابدی —— ہمیشہ کی۔"

میں اس سخت، کرخت اور ناقابل تردید منطق کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا جو انسان میں اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب زندگی کے مصائب اسے انتہائی حالات تک پہنچا دیں اور وہ زندگی کے متعلق کچھ ان امید افزا خیالات کے ساتھ جو میرے دلائل کے مقابل شکستہ ہو کر رہ جاتے تھے بحث میں مصروف تھی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ تم صحیح راستے پر ہو" آخرکار اس نے تسلیم کر لیا "زندگی فی الحقیقت بہت تکلیف دہ ہے۔"

ایک لمحے کے لئے ہم خاموش رہے۔ پھر اس نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ زندگی کے متعلق تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے بالکل صحیح ہے۔ میری گزشتہ زندگی میں بھی ایسے مواقع آئے ہیں جب میں بھی ایسا محسوس کرتی رہی ہوں۔ مجھے بھی اس کمرے میں رہنے کی اجازت دو۔ اور مجھے بھی اپنی زندگی کو اسی طرح ختم کرنے دو جس طرح تم کر رہے ہو۔ اس دنیا میں کوئی انسان نہیں جسے میرے متعلق تشویش ہو۔ کل سے کھانے کیلئے مجھے صرف ایک بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی ملی ہے۔ آج ابھی تک ایک فیتہ بھی نہیں بکا اور اب رات کو بھی میرے پاس کچھ نہیں۔ میں —— میں

بھوکی بھی ہوں لیکن اس جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ایک ایسا طریقہ ضرور ہی جس سے میں اپنی روزی کما سکتی ہوں لیکن میں وہ کبھی اختیار نہیں کروں گی۔ کیا تم یہاں مجھے اپنے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دوگے ؟ اور اس اذیت دہ دنیا کو اسی طرح چھوڑ دینے کی بھی جس طرح تم اسے چھوڑ دینا چاہتے ہو؟ براہ مہربانی ضرور!"

میں پہلے تو یہ نہیں چاہتا تھا لیکن آخرکار متفق ہوگیا کیونکہ ذلت اور اذیت کی حالت میں رفاقت عزیز ترین ہوتی ہے۔ آخر جس طرح مجھے اپنی زندگی ختم کر دینے کا حق تھا اسی طرح اسے بھی تھا۔ اور گیس اس کا بہترین علاج تھی موت کے بعد جب ہمارے مردہ جسم پائے جائیں گے۔ دنیا جو بھی چاہے خیال کرے، اخبارات بڑے بڑے جلی عنوانات سے یہ خبر شائع کریں گے ۱۔

خودکشی کا معاہدہ !

محبت کا انجام !

لیکن ہمیں کیا پروا ہے۔ ہم دونوں سے اس وقت اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ہم نے دروازے کے سوراخوں کو اخبارات کے پرزوں سے پھر بند کیا وہ بستر پر دراز ہوگئی اور میں نے گیس کا بٹن کھول دیا۔ میں کرسی پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے مجھے بستر پر آجانے کے لئے کہا۔ کیونکہ وہاں کافی جگہ تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس اذیت بخش دنیا میں زندگی کے یہ چند آخری لمحے تو ہم آرام سے گزار سکیں۔ میں بھی اس کے قریب ہی بستر پر دراز ہوگیا اور سوچا کہ ہم دونو کے مردہ جسم اکٹھے پائے جانے سے لوگ کیا خیال کریں گے لیکن میں نے اس کی پروا نہ کی اور نہ اُس نے۔ ہم دونو اسی طرح لیٹے رہے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ گہرے سانس لینے لگے اور کمرہ آہستہ آہستہ گیس سے بھر گیا۔ اگرچہ گیس آہستہ پھیل رہی تھی لیکن پھیل ضرور رہی تھی۔

یک لخت اس نے مجھ سے کہا ۱۔

"میں ——— میں ——— چونکہ میرا خیال ہے مجھ پر گیس اثر کر رہی ہے ——— مرنے سے پہلے اس کمرے میں یہ چند لمحے گزارنے کی اجازت دینے کے لئے تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جب سے دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ صرف تم ہی ایسے انسان ہو جس نے مجھ سے یہ ہمدردی کی ہے میں تمھاری بہت ممنون ہوں ——— خدا حافظ !"

میں ہمدردی کے لہجے میں بولا۔ اس لئے کہ اپنے ساتھ اسے بھی موت کے منہ میں لئے جا رہا تھا۔

"خاتون! میں تمھارے کسی شکریے کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے ہمدردی کا نام نہ دوگی۔ کاش میں کوئی ایسا کام کرتا جس کیلئے تم شکریہ ادا کرسکتیں لیکن میں ——— میں ——— میں بھی تم سے ایک چیز کی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ کسی قدر مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے لیکن میں تمھیں چومنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرصۂ دراز سے نہ کسی عورت سے باتیں کی ہیں اور نہ کسی کو چوما ہے۔ کیا میں تمھیں چوم سکتا ہوں۔ اس سے پیشتر کہ ہم ——— ——— "

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"——— ہاں ——— اگر تم واقعی ایسا چاہتے ہو"

میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنی طرف کھینچا۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اور میرے لب اس کے نرم لبوں سے جا ملے۔ ان میں حرارت تھی۔ اس نے میرے بوسوں کا جواب بھی ایسے پُرجذبات طریق پر دیا کہ میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ ہم ایک دوسرے سے زور سے چمٹے ہوئے تھے۔ میں اسے چومتا رہا لیکن آخرکار اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ کیونکہ گیس اس پر کافی اثر کر چکی تھی۔ مدہوشی کی سی حالت میں میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بے ہوش میری آغوش میں لیٹی ہوئی تھی . . . .

یک لخت مجھے احساس ہوا کہ میں قاتل بننے کے قریب ہوں۔ اس قسم کی عورت کو دنیا میں رہنا چاہئے۔ زندگی کے متعلق امید افزا خیالات رکھنے میں وہ صحیح راستے پر ہے۔ میری سخت۔ کرخت اور ناقابل تردید منطق مصائب اور تنہائی سے تنگ آئے ہوئے پریشان آدمی کے خیالات ہیں لیکن ——— تنہائی؟ ——— کیوں ! اب میں تنہا نہیں رہوں گا۔ اگر وہ ———

اسے آہستہ سے الگ رکھتے ہوئے میں بڑی مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکا۔ کمرہ گیس سے بھر چکا تھا۔ میرا خاتمہ ایک لمحے میں ہی ہوا چاہتا تھا۔ سانس لینے کی سخت کوشش کرتے ہوئے اور ایک شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے میں نے گیس کے بٹن تک پہنچنے کی کوشش کی۔ موت کے منہ میں پہنچے ہوئے انسان کی طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے میں نے آخر بٹن بند کر دیا۔ اور فرش پر گر پڑا۔ اور اپنے آپ کو کھڑکی کی طرف گھسیٹنے لگا۔ میں نے سوچا شاید میں کبھی وہاں تک نہ پہنچ سکوں گا لیکن آخرکار پہنچ گیا اور میں نے ایک مکہ مار کر شیشہ توڑ دیا۔ پھر میں بیہوش ہوکر گر پڑا۔

شاید چند منٹ مجھ پر بے ہوشی طاری رہی۔ آخرکار تازہ ہوا سے مجھے کچھ ہوش آیا۔ اور جوں ہی مجھے یہ خیال آیا کہ یہ کیا ہوا تھا۔ میں بستر کے قریب پہنچا اور جلدی سے اس لڑکی کو اٹھایا۔ میں ہراساں ہو رہا تھا۔

اگر وہ مرجاتی تو کیا ہوتا! یہ کتنا ظلم ہوتا! میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور اسے کھڑکی کے قریب لے گیا۔ اور بے چینی سے دیکھنے لگا کہ وہ سانس لے رہی ہے یا نہیں۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہوچکا تھا۔ لیکن اس کا سینہ سانس کی خفیف سی آمدرفت سے ابھی تک آہستہ آہستہ اُٹھ اور بیٹھ رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کے بچ رہنے کی امید باقی تھی۔ اس حالت میں میں نے بہت سی حرکتیں اس وقت اس قسم کی کیں جیسی انسان اس وقت کرتا ہے جب وہ یک لخت کسی خاص زبردست جذبے کے ماتحت ہو۔ میں نے اس سے معاف کردینے کی التجا کی اور کہا کہ میں بے وقوف تھا۔ جوں ہی میں اس غم سے چیخ اٹھنے کے قریب تھا کہ وہ مرچکی ہے اور جب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اس کی لمبی لمبی پلکوں میں جنبش ہوئی اور اس کی آنکھیں مجھے دیکھنے لگیں۔

اگرچہ کچھ دیر کے لئے اسے سر درد کی شکایت ضرور رہی لیکن گیس کے اثرات اس پر سے زائل ہوچکے تھے۔ اس کے ساتھ مجھے بھی سر درد کی شکایت پیدا ہوئی لیکن اب میں اگر تنہا ہوتا تو شاید میں اور زیادہ بیمار ہوجاتا۔ اگلے دن میں اپنا سوٹ کیس اور اپنی چند اور چیزیں ایک دکان پر لے گیا۔ جہاں مجھے ایک حقیر سی رقم مل گئی جس میں سے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے بعد چند شلنگ باقی بھی بچ رہے۔ ہم ایک چھوٹے سے درمیانہ درجے کے ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ جہاں ہم نے گرم گرم خوراک حاصل کی جو ہم سے پہلے تو کھائی نہیں جاتی تھی لیکن جب ہم نے کھانے کا تہیہ کرلیا تو چبا چبا کر کھا گئے۔

اگلے روز میں نے اور اس نے فیتوں کو دو طاشوں میں سجایا۔ اور دن بھر میں ہم نے خاصے فیتے بیچ لئے۔ یہ ہماری ابتدا تھی۔ اگلے دن اس سے بھی بہتر

اب میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاتی جب تک وہ زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔ آہستہ آہستہ ہماری آمدنی بڑھتی گئی۔ اگرچہ ایسے دن بھی آتے تھے۔ جب ہماری فیتوں کی ایک جوڑی بھی نہیں بکتی تھی اور ہم بہت مایوس ہوجاتے تھے لیکن آخر کار ایک دن مجھے گیرج میکینک کی جگہ مل گئی۔ اور اب ہم پر فاقے کی نوبت نہیں آتی۔ ہمارا مستقبل اب کسی قدر محفوظ ہے۔

قطعاً مایوس ہوجانا انتہائی بے وقوفی ہے۔ کیونکہ زندگی کا بہاؤ نہایت تیز ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا اس ندی کے اگلے خم کے پیچھے کیا کچھ ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ایف۔ایم ساقی

غزل

جنون مدعا ہے اور میں ہوں
دلِ غم آشنا ہے اور میں ہوں

جفائیں ہیں تمہاری اور تم ہو
تقاضائے وفا ہے اور میں ہوں

خرد اور ہوش میں محوِ تحیّر
جنوں کی انتہا ہے اور میں ہوں

حجاباتِ تعیّن کا گماں کیا
نظر کی انتہا ہے اور میں ہوں

نہ تسکیں ہے، نہ تسکیں کی تمنّا
غمِ راحت فزا ہے اور میں ہوں

خیالِ ماسوا سے دور حاجی
بتاؤں کیا کہ کیا ہے اور میں ہوں

حاجی سرحدی

کوئل

اے درد کے پیمبر! اے نوحہ خوانِ ظلمت! — ظلمت فغاں ہے تیری، یا تُو فغانِ ظلمت!

افسردگی سے ہے نالاں اُجڑے ہوئے گلوں کی — کلیوں پہ رو رہی ہے یا رُوح عبرتوں کی،

ماتم ہوا ہے پرّاں شیون کے پَر لگا کر، — یا جاگ اٹھی ہے غم کی تقدیر بلبلا کر

تصویر بولتی ہے اندوہ کی شجر پر، — یا سانپ لوٹتا ہے گلزار کے جگر پر

شبنم کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سحر ہے — ناسور ہو گیا ہے، جو شاخ پر ثمر ہے

سہمی ہوئی ہیں کلیاں اِس شورشِ حزیں سے — منہ ڈھانپتی ہیں اپنا پتّی کی آستیں سے

گُل کا جگر ہوا ہے اِس لَے سے ٹکڑے ٹکڑے — لالے کی ہے صراحی، اِس مَے سے ٹکڑے ٹکڑے

لائی ہے حلق میں کیا دوزخ کی آگ بھر کر — برسا رہی ہے ظالم! جس کو تو اب چمن پر،

گلزار اِس صدا سے ماتم کدہ ہے سارا
خاموش ہو خدارا! خاموش ہو خدارا!!

مسعود شاہد

غزل

عشق بے چین رکھے گا مجھے معلوم نہ تھا
درد رہ رہ کے اُٹھے گا مجھے معلوم نہ تھا

نام سنتے ہی نکل آئے گا آنسو بن کر
رازِ الفت نہ چھُپے گا مجھے معلوم نہ تھا

اُس کے غم سے کبھی فرصت نہ ملے گی مجھ کو
ہاتھ دِل سے نہ ہٹے گا مجھے معلوم نہ تھا

میرے احساس کی دُنیا ہی نرالی ہوگی
اِک جہاں اور بنے گا مجھے معلوم نہ تھا

راہِ مقصود میں غیرت کو مٹانا ہوگا
مجھ سے یہ ہو نہ سکے گا مجھے معلوم نہ تھا

مختلف ہوگی مری بات سے جس کی ہر بات
سابقہ اُس سے پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا

میرے جذبات سمجھ لے مجھے اپنا کر لے
کوئی ایسا نہ ملے گا مجھے معلوم نہ تھا

عرضِ مطلب پہ پشیمان نہ ہوتا لیکن
دِل پہ قابو نہ رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

جیتے جی اُس سے ملاقات نہ ہو گی سیفیؔ
یہ بھی ارمان رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

سیفیؔ نوگانوی

مینارِ غزالاں

چین کے عہدِ قدیم کی ایک فسوں گر حسینہ کی لرزہ خیز داستان

باب ۱

پُراسرار چین

چین اپنی قدامت کے اعتبار سے صناعی و ساحرانہ دستکاریوں کے باعث تاریخ عالم میں ایک بہت بلند و پراسرار درجہ رکھتا ہے۔ ماقبل تاریخ ——— یا کم از کم تین ہزار سال قبل مسیح سے ——— انسان چین کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر اس کی قدامت، کثرتِ نفوس اور پراسرار تہذیب اسے سمجھنے نہیں دیتی۔ اگرچہ جدید دنیا چین سے کہیں قریب تر ہو گئی ہے مگر پھر بھی پراسرار چین کے سربستہ رازوں کا سمجھنا دشوار ہے۔

۳ ہزار سال قبل مسیح سے چین کی اپنی تہذیب اور اپنا تمدن موجود ہے۔ اور غالباً کوئی قدیم تہذیب اس قدر سختی کے ساتھ اپنی قدامت اور جمود پر قائم نہیں رہی ہے جس قدر چین کی تہذیب۔ چینی تہذیب کے تحفظ میں ایک بڑا عنصر یہ کام کرتا رہا ہے کہ اہل چین کسی نئی چیز کو اپنے وجود اور اپنے تمدن میں مشکل ہی سے جگہ دیتے ہیں، زندگی کے نہایت سخت اصول جو بعید ترین ماضی میں بنائے گئے تھے ان کو مذہبی و روحانی عظمت حاصل ہونے کی وجہ سے کبھی اضمحلال نہ ہوا۔ توہم پرستی، سخت گیری، جسمانی مشقت و اذیت، صناعی اور ہنرمندی اور اپنی قدامت کو ہو ابند حالت میں رکھنے پر اصرار، یہ ہیں وہ اسباب جس نے چین کے جمود و تعطل کو اور اس کی تہذیب اور مملکت کے تحفظ کو ہمارے لئے ایک وجہ حیرت بنا رکھا ہے ———!

چین جیسے خشک، سخت گیری پر قائم، جمود پر نازاں اور توہم و قدامت کے مقید ملک میں رومان اور شعری زندگی کا بھلا کیا کام ———!

عورت

چین جیسے جامد و سرشارِ قدامت ملک میں عورت کی حیثیت سوائے جائداد منقلہ کی حیثیت کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ پیدائش ہی سے عورت کے لئے ذلیل زندگی، محکومی اور دائمی خواری مقدر ہو جاتی تھی۔ ادب و شعر سے نسبت تو کجا۔ اسے معمولی نوشت و خواند کی نعمت بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔ عشق و آزادی حیات کی سربلندی اسے کہاں نصیب۔ اسے اس کی مرضی کے خلاف جس کے ساتھ چاہا بیاہ دیا جاتا تھا۔ سخت پردہ اور پابندی اس کی زندگی کا شیوہ قرار پاتا تھا۔ چلنے پھرنے کی قوت و آزادی سے بھی محروم کر دی جاتی تھی۔ تمام عمر کامل و شدید غلامی اور سخت قسم کی قید و بلا میں اسے گزارنی ہوتی تھی۔ ہاں مرنے سے پہلے چند سالوں کے لئے اسے کسی قدر آزادی اس معنی میں مل جاتی تھی کہ وہ ایک ساس ہو کر اپنی بہو پر گھر میں حکم چلا سکتی تھی اور بس!!

ان پابندیوں اور رسوم و قیود کی سرگشتیوں کے باوجود ہمیں تاریخ میں بعض نمایاں و درخشندہ چینی خواتین کے نام ملتے ہیں جنھوں نے قدامت کی حصار بندی توڑ کر اپنی نسوانی حیات کے باوجود شعر و حکمت، ادب، انشا، نقاشی و مصوری، موسیقی و رقص میں نمایاں درجے حاصل کئے۔ فنونِ سپاہ گری میں یکتا باغیوں کے سرکچلنے، فوجوں کے پرے کے پرے زیر و زبر کر دینے والی بہادر خواتین کے نام بھی اسی سرزمین چین کی تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

اخلاق و عصمت کے حصار کو توڑنا ناممکن تھا اور بغاوت کرنا تو خیال

میں بھی ناممکن تھا۔ اخلاق وعفت کے قوانین نہایت سخت تھے۔ ان ضوابط کی ہلکی سے ہلکی تبدیلی اور شکست کی سزا موت کے مترادف تھی۔ اہلِ چین نے انسانی جان لینے کے لئے جو تیاست آفریں عذاب اور لرزہ خیز اذیت دینے والی ترکیبیں ایجاد کر رکھی تھیں ان کا ذکر یہاں کرنا ضروری نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ اہلِ چین اذیت دہی اور عذاب دہی کے معاملہ میں ایسا وحشیانہ بلیغ تصوّر لے کر آئے ہیں۔ شاید دنیا کی کوئی قوم ان کو شرمندہ نہیں کر سکتی۔

خواہ عورت حرم شاہی کے زرّیں قفس میں بند ہو یا معمولی حالت میں کمر سے بچہ باندھے سڑک یا کھیت پر کام کر رہی ہو سب کے لئے نسوانی قیود کی پابندیاں قدامت سے بھی قدیم رسوم کی شدید صورتوں پر عامل ہونا مقدر و مختص ہو گیا تھا۔

۳ ہزار سال قبل مسیح میں شہنشاہ فون حی نے شادی کے جو ضوابط بنائے تھے وہی تمام زمانۂ قدیم وجدید میں چین کے لئے قابلِ عمل رہے۔

یہاں برسبیلِ اس کا تذکرہ کرنا مناسب ہو گا کہ شادی کے جو اصول اس وقت منضبط کئے گئے تھے ان کا معیار بعض حالتوں میں جدید تہذیب اور مغربی تہذیب والوں کے لئے بالخصوص قابلِ رشک ہے۔ مثلاً یہ کہ شادی سے پہلے دونوں کو یعنی میاں اور بیوی کو ایک ایک بیان ایک دوسرے کو دینا ہو گا کہ اس کی صحت کیسی ہے۔ تندرستی کی معمولی سے معمولی خرابی اور جسمانی نقائص کا شادی سے پہلے ایک دوسرے پر کامل طور پر اظہار لازمی شرائط میں سے تھا۔ آج کل اندھا دھند شادیوں کے باعث جو سانحات ہماری زندگیوں میں رونما ہوتے ہیں یہ قابلِ قدر قانون انھیں کسی حالت میں پیدا نہ ہونے دیتا۔

عفتِ نسوانی کا تصوّر اہلِ چین میں بے حد بلند تھا عصمت کے حصار کی دیواریں بہت اونچی تھیں، ایک عورت کو اپنے خاوند یا والدین کے سامنے بھی اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ غیر مرد کے ہاتھ سے کوئی چیز لے لے اگر کسی غیر مرد سے کوئی چیز کسی عورت کو لینی ہوتی تھی تو اس کے لئے ایک قاعدہ تھا۔ یہ چیز میز پر رکھ دی جاتی تھی اور عورت اپنے لمبے کرتے کی ڈھیلی آستینوں سے اس چیز کو ڈھانکتے ہوئے اٹھا لیتی تھی۔

رومہ کے زوال کے آخری ایام میں ایک خوب صورت اور زہریلی ناگن مسالینہ ہماری نظر کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اسے سرزمین رومہ کی "محل بہا سیٹرنی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ——— کون یقین کرے گا کہ چین جیسے ملک میں بھی ایک مسالینہ ہو گزری ہے ———

ایک عیش پرست شہوت رانی کی ملکہ عفت وعصمت کے خراج سے مملکت کو تاخت وتاراج کرنے والی ایک افعی صفت حسینہ ——— ایک سمِ جمیل ——— ایک بے حد وحشت ناک "دوزخی حور" جس کے حسن کی دمک اور عیش پرستانہ کارفرمائیوں سے چین کی تاریخ کا ایک باب سیاسی انقلاب اور حسن وجمال کی برق پاشیوں سے رزم بزم کا ایک نہایت پُرتکلف نظارہ پیش کرتا ہے۔

باب ۲

قصّہ کا شروع

ہمارے قصہ کی ابتدا ۱۴۱۱ء میں ہوتی ہے۔

۱۴۱۱ء میں چین کیا ہو سکتا ہے۔ ذرا اس کا تصور کیجئے۔ الگ تھلگ ایک سنسان نگر بے حد آباد وعظیم الشان آبادی۔ آج کل جو تہذیب چین میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ اُس وقت اس سے کچھ زیادہ ممیز حالت نہ تھی۔ لباس میں۔ زرہ بکتر وآلاتِ حرب میں تعمیرات میں۔ غرض جس چیز میں دیکھیں وہی حالت قائم ہے۔ جو صدیوں پہلے تھی۔ عجائب خانوں میں ہم چین کی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر چین کا جو تصور اپنے دماغ میں پیدا کر سکتے ہیں۔ بس سمجھ لیجئے کہ ۱۴۱۱ء میں بھی چین ایسا ہی تھا۔

کچھ عرصہ سے ایک قزاق میو روچی نام کا مملکت میں لوٹ مار کر رہا تھا اور اس نے اپنی خوفناک ترک تازیوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ اسے پکڑنے کی سب کوششیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں۔ اسے اگر چین کا "رابن ہڈ" یا رزمی قصوں کے بہرام کا اوتار سمجھ لیا جائے تو شاید معاملہ پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سریع الفہم ہو جائے گا۔

بس ایک ایسا ہی قزاق جیسا "بہرام" تھا۔

شہنشاہِ وقت، شیوسین کو ایک رات محل خاص میں یہ اطلاع ملی کہ ایک نوجوان حسینہ باریابی کی کوشش کر رہی ہے۔ اور قاعدے کے مطابق اسے روکا جا رہا ہے۔ وہ بادشاہ سے کوئی نہایت پُراسرار بات کہنا چاہتی ہے۔ کوئی خفیہ پیغام ——— ! اس سے سوالات کئے گئے کہ وہ بادشاہ کے پاس کیوں جانا چاہتی ہے۔ کیا کام ہے۔ دوسرے لوگوں کو وہ کام کیوں نہیں بتاتی وغیرہ۔ مگر اس نے سب سوالوں کا جواب یہی دیا کہ "میں صرف شہنشاہ کے حضور میں جا کر ہی کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے روکو نہیں" اس لڑکی نے اپنا نام طا۔ کی بتایا۔

اس عورت کو آخرکار حاکم عدل کے سامنے پیش کیا گیا جسے "منترین" کہتے تھے منترین نے اس عورت سے بہت سے سوالات کئے اور یہ بتایا کہ شہنشاہ چین سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی معمولی آدمی اس کے دربار میں بھیجا جائے۔ حاکم کا فرض ہے کہ وہ اس شخص کی اصلیت اور معاملہ کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا جانا شہنشاہ کے لئے غیر ضروری تھا اور اس نے جا کر کوئی معقول بات نہیں کی تو اس کے لئے عذاب الیم تیار رکھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے اسے تمام عذابوں اور اذیت ناک سزاؤں کا نقشہ آنکھ سے دکھا دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اپنے ارادہ سے باز آجائے ورنہ ان سزاؤں کے لئے تیار رہے۔ دو روز تک طا۔کی سے سوال جواب ہوتے رہے۔ مگر اس نے بلند ہمتی اور پختہ عزم کے ساتھ حاکم کے تمام شبہات دور کر دئیے مگر قانون کے مطابق اسے عذابوں سے آگاہی دینے کے لئے تیسرے روز ایک مکان میں لے جایا گیا۔ لڑکی نے دیکھا کہ صحن میں دو مرد نیم برہنہ پیٹ کے بل گرم ریت پر لیٹے ہوئے ہیں اور دو جلاد ان کے سرینوں پر گینڈے کی کھال کے تازیانے لگا رہے ہیں۔ ان کی آہ و بکا سے زمین و آسمان لرزتے تھے۔ مگر ظالم جلادوں کو ان کی تکلیف تازیانہ بازی کے لئے اور مہمیز کا کام دیتی تھی۔

لڑکی کے چہرے پر اس عذاب سے مطلق خوف پیدا نہ ہوا۔ جسے دیکھ کر مجسٹریٹ کسی قدر متعجب ہوا۔ مگر اس نے سوچا کہ کوئی عذاب اس سے بھی سخت کھایا جائے۔ تاکہ لڑکی اپنے ارادے سے باز آجائے۔ اسے ایک اور مکان میں لیجایا گیا جو قید خانے کے قریب تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی نظر دو ڈولیوں پر پڑی جن پر دو آدمی پڑے ہوئے تھے اور ملازم ان ڈولیوں کو لے جا رہے تھے۔ ان کا پیر اکڑا ہوا تھا۔ ایک کا پیر کچلا رہ گیا تھا۔ لڑکی نے دیکھا کہ پیر میں سے خون کی تلکیاں بہہ رہی ہیں۔ آخرکار اسے اس کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں سے اس نے یہ آدمی ڈولیوں میں لیٹے نکلتے دیکھے تھے۔ یہ کمرہ دوزخ کا نمونہ تھا۔ بانس ہر قد و قامت اور وضع قطع کے جا بجا رکھے تھے جو اذیت دینے کے کام آتے تھے۔ قیدیوں اور عذاب پانے والوں کے لئے مختلف قسم کے قفل۔ زنجیریں اور بندشیں۔ سیسے کے موٹے اور مڑے ہوئے پائپ تھے جنھیں قیدی کے جسم سے لپیٹ کر دبایا جاتا تھا۔

منترین نے بتایا کہ ایسے لوگوں کے لئے جو کسی وجہ سے مورد عذاب قرار دئیے جائیں یہ سزائیں دی جاتی ہیں منترین نے نہایت جوش اور دبدبہ کے ساتھ ان اذیتوں اور آلات کا ذکر کیا جن سے وہ سزا دے گا۔ اگر اس کو دربار شاہی سے عذاب کی سزا مقرر ہوئی۔ مگر لڑکی اب بھی خاموش اور مطمئن کھڑی تھی۔ اس پر کسی آنے والے خوف کا اثر نہ تھا۔

آخر میں اسے ایک بڑے ایوان میں لایا گیا۔ جہاں ایک میز کے گرد بہت سے حاکم بیٹھے تھے۔ اور سامنے ایک کرسی بچھی تھی۔ طا۔کی کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ سامنے نسوار کی ڈبیہ رکھ دی گئی جو فیشن میں داخل تھا۔ سامنے ایک سٹول پر ایک مرد جسے زرد فام ہرقلیس کہنا بجا ہو گا بیٹھا تھا۔ اس کے جسم کی تنومندی اور توانائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ خادم۔ تولیہ۔ اسفنج اور پانی لے کر آ گئے کہ اگر عورت کو عذاب کا نظارہ دیکھنے سے غشی آجائے تو پانی کے چھینٹے دے کر اوسان قائم رکھے جائیں۔ مگر عورت نہایت ہی مطمئن' ان تمام تیاریوں سے بے غرض بنی اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔

توانا و تنومند انسان ایک بدنصیب مجرم تھا۔ کسی شاہی جرم کا اس پر عتاب نازل ہونے والا تھا۔ ایک جلاد بانسوں کی تیلیوں سے بنی ہوئی دو جالیاں لایا۔ دونوں جالیوں کو دونوں ہاتھوں میں پرو دیا گیا۔ اس طرح کہ انگلیاں بانسوں کی تیلیوں کے درمیان گویا شکنجہ میں آگئیں۔ ان بانسوں کے شکنجوں میں ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں۔ جلاد نے حکم پاتے ہی انھیں کھینچا جس کی وجہ سے بانسوں کی تیلیاں کھنچنی شروع ہوئیں اور پہلوان صفت مجرم نے آہ و زاری شروع کی بہت کم لوگ ہیں جو صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بانسوں کی یہ چند تیلیاں کس درجہ ہولناک عذاب انسان کے لئے پیدا کر سکتی تھیں۔ دیو ہیکل انسان کرب و تکلیف کے باعث پتہ کی طرح لرزنے لگا۔ اس کے ننگے پنڈے پر ذرا سی دیر میں پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ چیختے چیختے اس کی آواز بھی ختم ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چکی میں پیسا جا رہا ہے۔ ظالم حاکم کے حکم سے شکنجہ اور کس دیا گیا۔ مجرم کا جبڑا اس طرح کٹکٹا رہا تھا۔ جیسے سردی میں دانت بجتے ہیں۔ اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ اس ذہنی اذیت سے لرز رہا تھا۔

یکا یک طا۔کی نے بے چین ہو کر مجسٹریٹ سے کہا ——————

بس اسے رہنے دیجئے۔ میں آپ کو ابھی بتاتی ہوں کہ کون ہوں اور کیوں ——— !"

بہت سنجیدگی اور آہستگی کے ساتھ لڑکی نے منترین کو بتایا کہ اس کو جو چیز یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ اس کا اس شخص کے معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ براہ راست شہنشاہ سے تعلق ہے اور وہ یہ روح کو لرزانے والا عذاب اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی۔ اس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے ————

"مہربانی کر کے اس آدمی ——————"

منترین نے کچھ سوچ کر اپنا سر تسلیم کے لئے جھکایا۔ اور بانسوں کا شکنجہ ڈھیلا کرنے کا حکم دیا۔ شکنجہ علیحدہ ہو گیا۔ مگر ابھی تک کرب و اذیت کی وجہ سے وہ دیو ہیکل زرد فام غلام کانپ رہا تھا جس سے سزا کی ذہنی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے'

"میں یو روشی کی لڑکی ہوں جس نے غدر مچایا ہے۔ اور میں سیدھی شہنشاہ کے پاس جانا چاہتی ہوں"

منتریٔ بن نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ مہمان کس قدر اہمیت کا مالک ہے اور اسے روکنا کتنا مضر ہے معمولی مگر بے حد پیچیدہ رسوم و تکلفات کے بعد عورت کو شہنشاہ کے حضور میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اسے محل میں لے جایا گیا۔ تخت شاہی جس کمرے میں بچھا تھا اسکی دیواریں زر و جواہر سے مرصع اور نقش و نگار سے آراستہ۔ حریر و دیبا کے رنگین و مصور پردوں سے ستور تھیں۔ اس کا چوکور دروازہ لیشب سے بنا ہوا تھا۔ عورت ڈری سہمی۔ اور آدابِ شاہی سے مرعوب۔ زر و جواہر کی چمک سے ششدر اندر داخل ہوئی۔ پیچھے سے کسی چوب دار نے اس کے شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور وہ مقررہ آداب بجالانے کے لئے جھک گئی۔ جب اس نے اٹھ کر نظر ڈالی تو دیکھا کہ زر و جواہر سے لدی ہوئی شکلیں حکام و افسران و امرائے سلطنت کی چاروں طرف بیٹھی ہیں۔ اور بیچ میں شہنشاہ زرق برق پوشاک اور درخشندہ جواہرات سے لدا ہوا ننگے سر بیٹھا ہے۔

بادشاہ چین تختِ سلطنت پر جلوہ افروز تھا۔ یہ تخت زمین سے چار فٹ اونچا تھا۔ لڑکی پر شہنشاہ چین نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جما دیں اور اسے قریب آنے کے لئے کہا لڑکی قریب پہنچ گئی اور جھک کر چار مرتبہ آداب بجالائی یہ آداب صرف رقاصہ کنیزوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لڑکی نہایت وجاہت اور طراری کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ نسوانی جھجک یا رعب شاہانہ کا اس پر کچھ اثر نہ تھا۔

اس نے بتایا کہ میرا نام طا۔ کی ہے۔ اور وہ باغی سپاہی یو روشی کی بیٹی ہے۔ اور وہ زمین و آسمان کے مالک شہنشاہ چین سے اپنے باپ کی بدکرداریوں کی معافی مانگنے آئی ہے۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میرا باپ ان ان شرائط پر حکومتِ وقت کی اطاعت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور وہ یہ اطاعت گزاریاں پوری طرح ادا کرے گا۔

شہنشاہ چین بت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ زندگی کے آثار صرف اس بات سے ظاہر ہوتے تھے کہ اس کے نتھنے کبھی کبھی ہل جاتے تھے۔ آج تک کسی عورت نے اس پر اتنا اثر نہیں کیا تھا جس قدر اس عورت نے آج کیا۔ یہ لڑکی نسوانی حسن و جمال کا شاہکار تھی۔ صرف چینی شکل تھی ورنہ جسم اور رعنائی جمال کے باب میں وہ یونانی دیوی زہرہ کے مثل تھی۔ عادت کے خلاف اپنے ہم نشینوں سے مشورہ کئے بغیر شہنشاہ چین نے حکم دیا کہ لڑکی کو دربار سے واپس کیا جائے اور آرام سے رکھا جائے۔ اور طلب کرنے پر دوبارہ پیش کیا جائے۔

دوسری بار باریابی ہوئی۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور رفتہ رفتہ طا۔ کی نے بادشاہ پر قابو پا لیا۔ اب اس نے سرکاری معاملات اور رموزِ مملکت میں بھی دخیل ہونے کی کوشش کی شہنشاہ اس کے حسن کی دمک سے اندھا ہو چکا تھا اور سوائے طا۔ کی کے کسی عورت کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی کہ یہ عورت کیا کرنے والی ہے۔ اگرچہ شہنشاہ چین ایک مطلق العنان بادشاہ ہوتا تھا۔ مگر اپنے ارکان سلطنت سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا لیکن اب طا۔ کی جو چاہتی تھی کرتی تھی۔ بادشاہ اس کے آگے لب کشائی کی ہمت نہ کرتا تھا سلطنت کے امرا خوف سے کچھ نہ کہتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ اس بخس عورت کو شہنشاہ کے قرب سے ہٹانے کی فکر میں تھے۔

طا۔ کی نے اثر جمانے کے بعد شاہی خزانے پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ بڑے بڑے عہدے القاب و خطابات۔ اعزازات نیلام ہونے لگے اور اس نے خوب رقم جمع کر لی شہنشاہِ چین شو سین اس کے حسن کا دیوانہ ہو رہا تھا اور احتجاج کے باوجود کچھ نہ کرتا تھا۔ جب طا کی سامنے آتی اس کے حسن کی جھلک اس کے جسم کی لچک اور عیش افروز حرکات سے اس کا دل سلطنت کی حدود سے نکل کر گناہ کے بھیانک جنگل میں غائب ہو جاتا۔ قدیم زمانہ کے وہ آہنی اصول و قواعد جنہیں حکیم چین کنفیوشس نے منضبط کیا تھا طا۔ کی نے توڑ دئیے۔ حالانکہ وہ احکامِ الٰہی کی برابر سمجھے اور مانے جاتے تھے۔

طا۔ کی اس آزادی پر اکتفا کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے محل شاہی کو مارکیٹ میں تبدیل کر دیا۔ جہاں معمولی سے معمولی خدمت کے عوض روپیہ طلب کیا جاتا تھا۔ عیش و معصیت کے اڈے قائم ہو گئے تھے۔ اپنے عیش کو وسیع کرنے اور ساری سلطنت کو اپنے وسیع گناہ کے صحرا میں گم کر دینے کے لئے اس نے ایک محل بنوایا جس کا نام "لوطائی" ۔ یعنی "مینارِ غزالاں" رکھا۔ یہ اس کے اپنے جمع کئے ہوئے روپے اور اپنے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اس کی سج دھج اور کرّ و فر وہ شاہی محل سے بڑھا دینا چاہتی تھی تاکہ بادشاہ صرف یہاں رہا کرے اور قدیم محل میں رہنا بھی چھوڑ دے۔

"مینارِ غزالاں" میں ایشیا کی چیدہ۔ خوب صورت عورتیں منگوا کر رکھی گئیں۔ اس کے دروازے خوب صورت لیشب سے بنوائے گئے۔ اس کے کمروں میں ننگی اور حیا سوز تصویریں کندہ کرائی گئیں۔ اس محل عیش کے دروازے صرف نیک اور بے عیب آدمی کے لئے بند تھے۔ ورنہ ہر گنہگار مرد و عورت کے لئے اس محل میں کامل مہمان داری اور عیش کوشی کا سامان مہیا رہتا تھا۔ ایسے موقعے پر خواجہ سراؤں۔ آبرو باختہ عورتوں۔ اور عصمت فروش حسینانِ چین نے اڈے جمائے۔

دنیا کے تمام اقسام عیش جو انسان کو معلوم تھے یہاں پورے شباب کے ساتھ برسرِ عمل دکھائی دیتے تھے اور بادشاہ کے لئے روز نئی دلہنیں مہیا کرنے کا اہتمام افسوس کہ حسینہ طا-کی نے خود اپنے ذمہ لیا تھا!

جاوا، تبت، منگولیا وغیرہ سے رقاصائیں بلوائی جاتی تھیں۔ ان کے عریاں ناچ ہوتے تھے۔ اور شہنشاہ کی بستیاں الامان۔ اہل چین نے شاید اس سے پہلے خواب میں بھی وہ جنسی بداطواریاں نہ دیکھی ہوں گی۔ جو زہریلی حسینہ طا-کی نے ایجاد کر کے "مینارِ غزالاں" میں رائج کی تھیں اور جن سے شوہر تسین اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔

باب ۳

عیش میں خلل!

کین کیو نامی ایک سردار مملکت نے بادشاہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں اور اس سلسلہ میں اس نے ایک لڑکی حضور میں گزرانی جس کی صورت شکل حوروں جیسی اور جس کی عفت و عصمت بالکل محفوظ تھی۔ جوں ہی یہ لڑکی "مینارِ غزالاں" میں لائی گئی۔ بادشاہ چین کے دل پر اثر ہوا۔ اور اس نے اسے اپنے سامنے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ طا-کی۔ اس نئے مہمان کے آنے سے ہرگز خائف نہ تھی اور نہ اسے یہ خدشہ تھا کہ وہ رقیبہ بن جائے گی۔ وہ اس نئے شکار کو بادشاہ کے لئے ایک تجربہ ہی سمجھتی تھی۔

کین کیو کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بادشاہ سنورنے کے بجائے ایک معصوم دوشیزہ کو بھی گناہگاری کی قربان گاہ پر اپنے ہاتھوں سے بھینٹ چڑھا دے گا سردار کین کیو نے تو یہ مصلحت سوچی تھی مگر کارگر نہ ہوئی۔ لڑکی نے جب اپنی آنکھوں سے "مینارِ غزالاں" کی معصیت نواز زندگی دیکھی۔ شرمناک اور حیا سوز اطوار و اشغال اسے دکھائے گئے تو وہ لرز اٹھی۔ اس نے احتجاج کیا کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے ابھی اس محبس گناہ سے نکالو۔ مگر دھمکیوں اور ترغیبوں اور دلاسوں سے کام لے کر طا-کی نے اسے کچھ دنوں محل میں رکھا اور رفتہ رفتہ اسے بھی ان گناہوں میں برابر کا شریک کر لیا۔ ایک مرغ معصوم گرفتار ہو کر جب طا-کی جیسی شکاری عورت کے محبسِ معصیت میں پھنس جائے تو اس کا دوبارہ باہر نکلنا ناممکن تھا۔

لڑکی ان شرمناک اور دل ہلا دینے والے گناہوں کی تاب نہ لا سکی اور اس نے دادِ عیش دینے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے نہایت سخت قسم کی اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔ آدم خوری اس محل کے رہنے والے انسانی درندوں کے مخصوص اشغال میں داخل تھی۔ چنانچہ اس عورت کے جسم نزار کو بھی دانتوں سے چبایا گیا اور مردہ جسم کو طرح طرح کی لرزہ پیدا کرنے والی حرکات سے آلودہ کیا گیا۔ اس کی لاش اس کے باپ کے پاس بطور مظاہرۂ انتقام بھیج دی گئی

لڑکی کے باپ پر غم و غصہ کی بجلیاں گریں اور وہ ایک شیر کی طرح بپھر کر میدان میں نکل پڑا۔ اس نے تمام چین کو اپنے شور سے متوجہ کر لیا اور بغاوت کی آگ پھیلانی شروع کر دی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ آخر اس جہنمی زندگی کو اہلِ چین کب تک برداشت کریں گے ——— اس شخص کو شاہ والا شان کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

مگر قتل رنگ لایا۔ تمام صوبوں میں بغاوت کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی اور شعلے بھڑکنے کے لئے مچل رہے تھے۔ صرف جبر و خوف کی وجہ سے عام غدر ہونے نہ پاتا تھا۔ ورنہ لوگ طا-کی سے انتقام لینے اور شہنشاہ کو اس کی بدکرداری کا مزا چکھانے کے لئے بالکل بھرے بیٹھے تھے۔ غریب و نادار، گم نام درحقیقت لوگوں کو بھی سر اٹھانے کا حوصلہ ہوا۔ پرے کے پرے باغیوں کے آتے اور مینارِ غزالاں کے گرد منڈلاتے اور اسے اکھیڑ پھینکنے کی ترکیبیں کرتے مگر "مینارِ غزالاں" کے عیش کرنے والے اپنے مضبوط و مستحکم قلعہ میں باہر کی دنیا سے بے خبر باجوں کی آوازوں، موسیقی کی تانوں اور حسینوں کی برق پاشیوں میں مسحور و محو تھے۔ انہیں مطلق خیال نہ تھا کہ رنج و الم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تکلیف و پریشانی بھی کسی چیز کا نام ہے انھیں یہ پختہ یقین تھا کہ موت کبھی نہیں آئے گی۔ اور تا ابد یہ رقص عیش میں محو رہیں گے۔ "مینارِ غزالاں" کے لوگوں کو انسان کے جامِ انصاف اور خدا کے پیمانۂ صبر کے لبریز ہو جانے کا مطلق اندیشہ نہ تھا۔

اہلِ چین بڑی مشکل سے ان توہین آمیز حرکاتِ عیش اور تباہ کن اطوارِ شاہی کو پانچ سال سے برداشت کر رہے تھے۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا تھا۔ ضرورت تھی ایک ایسے رہنما کی جو سلگتی ہوئی چنگاریوں کو شعلوں میں تبدیل کر کے اس گناہ کے ہنگامہ کو خاکستر کر دے۔

وو وانگ نامی ایک خاندانی شہزادے نے آخر کار علمِ جہاد بلند کیا چین کی چار ملین آبادی میں سے ایک فوج سرفروشوں کی بن جانی کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چاروں طرف سے رضا کار اس فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آنے لگے اور آخر کار اس نے عیش محل پر دھاوا بول دیا۔

یہی وہ غریب تھے جن کے بھائی بند منگولوں نے چنگیز خاں کے زیر کمان چین کے اس سرے سے لے کر یورپ کی اس سرحد بحر اسود تک اپنی تاخت کی حدود وسیع کر دی تھیں۔ جن کے زیر نگیں ایک دنیا کانپتی تھی۔

جب حملہ کی خبر شوسین کو ہوئی تو اس کو پہلے تو یقین نہ آیا۔ مگر پھر یا تھا ٹھنکا اس نے اپنے محل کی حفاظت کے لئے احکام جاری کئے۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کے احکام سن کر برزنے والے لوگ اب نہایت سرد مہری سے کام لے رہے ہیں اور اس کا حکم چلنا بند ہو جائے گا۔ تو اس نے سمجھ لیا کہ وقت اب آگیا ہے کہ چپ چاپ جان بچا کر آدمی نکل جائے اور زیادہ شور نہ کرے۔ اسے پھر خیال آیا کہ "مینارِ غزالاں" میں چلو۔ وہ ایک ایسی جائے پناہ ہے جہاں اب تک اس کے احکام چلتے ہیں۔

باب ۴

انہدام

وہ ایک خفیہ سرنگ کے ذریعہ جو اس کے محل سے "مینارِ غزالاں" تک جاتی تھی چپ چاپ پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ نقشہ ہی پلٹا ہوا ہے ہزاروں رفیق ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں کچھ نوکر چاکر باقی رہ گئے ہیں جو مدافعت نہیں کر سکتے تھے۔ رہ گئیں کنیزیں۔ خواجہ سرا۔ خوب صورت لڑکے اور عنّین وہ بھلا کیا اس کی حفاظت کا کام کر سکتے تھے۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور غصّہ میں بھر کر چیزیں توڑنے پھوڑنے لگا۔ قیمتی آلاتِ مے کشی بیش بہا ظروف و آرائش کے سامان ایک ایک کر کے ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ یکایک اس کو کچھ خیال آیا۔ اس نے حکم دیا کہ سب فرنیچر اور کاغذ کی چیزیں صحن میں جمع کر دی جائیں۔ تمام قیمتی اور نایاب لکڑی کا سامان۔ کاغذی چیزیں۔ ڈھیر کی صورت میں رکھ دی گئیں۔ اس نے ایک نہایت بیش قیمت لبادہ پہنا اور زیورات کے صندوقچے منگا کر مٹھیاں بھر بھر کر حالتِ طیش و دیوانگی میں اپنے سر پر نچھاور کیں۔ کپڑوں پر نثار کیں اور کاغذ و سامان چوب کی اس قیمتی چتا پر بیٹھ گیا۔

چلّا کر ——— اس کی آواز ہی اب کہاں باقی رہی تھی۔

——— بولا "شہنشاہ چین غدّاروں کے ہاتھ پڑ کر مرنا نہیں چاہتا اس لئے اپنی جان کو بے عزتی سے کھونے کی بجائے خود خاکستر ہو جائے گا۔

تمام نوکر اور کنیزیں چاروں طرف آ کھڑی ہوئیں کسی کی مجال نہ ہوئی جو اسے روک سکتا۔ اس نے کہا چتا میں آگ لگا دو۔ ابھی لوگ تذبذب ہی کر رہے تھے کہ کسی طرف سے ایک جلتی ہوئی مشعل آ کر گری۔ سامنے سے ایک دریچہ بند ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا۔ طا۔ کی مشعل پھینک کر جلدی سے بھاگ گئی۔

مشعل کا کاغذ اور چوبی سامان میں لگنا تھا کہ بھک سے ہوا اور آناً فاناً شہنشاہ چین بھسم ہو کر ایک تودہ خاکستر بن گیا اور اپنے گناہوں کی آلودہ سرزمین پر ہی آ کر اس نے آخری سانس بھی پورے کئے۔ محل عیش ایک زر دھاجھ کی آواز اور ایک پُراسرار چینی گھنٹہ کی ضربات کے شور سے گونج رہا تھا۔ مرتے مرتے شوسین نے نوکروں اور ساتھیوں کو پکارا کہ تم بھی اس آتشکدہ معصیت میں کود کر میرے ساتھ چلو۔ زندگی کی رفاقت کو تا ابد قائم رکھو۔ مگر بے وفا دنیا اس قدر سمجھ دار نہیں ہے کہ آخر تک کام میں شریک رہے۔

باب ۵

طا۔کی کا حشر

طا۔کی۔ کہاں تھی ؟

ہر شخص کی زبان پر یہی لفظ تھا۔ طا۔کی کہاں ہے۔ کہاں ہے وہ خبیثہ ملعونہ مجسمۂ گناہ و معصیت۔ وہ آلودگی و شرارت کی نجس دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ اس سے لوگ انتقام لینا چاہتے تھے۔

شاہی محل کی حفاظتی فوج نے ذرا سی دیر میں ہتھیار ڈال دئیے۔ اس سے پہلے کہ محل پر انقلابی فوج کا حملہ ہوتا لوگوں نے فتح کے جھنڈے بلند کر دئیے اور شہروں میں اژدہے کی مورتیں جلوس میں نکالی گئیں جو فتح مندی و کامرانی کا نشان سمجھی جاتی تھیں۔ چاروں طرف خونی کا غوغا تھا۔ ہر شخص نجاست و آلودگی حیات کے تماشہ کا حسرت ناک انجام دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

چاروں طرف دستے اور فوجیں دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔ طا۔کی نہ ملنی تھی نہ ملی۔

یکایک فاتح نوجوان وو دانگ کی رہائش گاہ کے سامنے ایک مرصّع و مذہّب پالکی آ کر رکی۔ اندر سے طا۔کی زرق برق پوشاک اور جواہرات و آرائشِ جمال کے جملہ اسلحہ سے لیس باہر نکلی۔ اس نے حرم میں جا کر نوجوان فاتح کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ اپنی جہنمی مسکراہٹ میں پُر شباب فاتح کے تمام ارمانوں کو جذب

کرکے فنا کر دینا چاہتی تھی۔

طا۔ کی نے بتایا کہ اس نے شہنشاہ کو غلط روی سے بچانے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی تمام طاقتیں شہوت رانِ مطلق العنان کے سامنے ہیچ ہو گئیں۔

طا۔ کی نے تمام نسوانی خوبیاں نوجوان جرنیل کو اپنانے کے لئے ختم کر دیں۔ اس کا حربۂ حسن کئی بار اس قدر تیز ہوا کہ شاید نوجوان جرنیل اپنے آپکو اس کے آغوش میں گرا ہوا پاتا۔ مگر جمال حسن اور الفاظ کے جادو نے اسکو زیادہ دیر تک آزمائش میں نہ ڈالا۔ وہ سوچتا تھا کہ رعنائی اور پاکیزگی حسن کا ایک نادر مجسمہ کیونکر گناہ اور سیاہ کاری کا ایسا ہولناک امین بنا رہا چین کی تاریخ میں سب سے زیادہ سیاہ ورق جس کے حال سے لبریز ہے۔ وہی جگمگاتی ہوئی ملکہ بعیش تھی ڈُو وانگ دیکھتا اور حیرت کرتا تھا۔ آخر کار اندرونی کشمکش حسن پر غالب آئی اور اس نے جھنجلا کر حکم دیا ——— !

باب ۶

انجام کا پردہ گرتا ہے!

اس نے حکم دیا کہ طا۔ کی کو لے جاؤ اور زنداں میں بند کر دو۔

اگلے روز عدالت میں عورت کو پیش کیا گیا۔ اس نے اپنی صفائی میں بہت سی باتیں پیش کیں مثلاً اس نے کہا کہ میں بالکل بے گناہ معصوم ہستی ہوں اس وقت چین کی عفت مآب خواتین میں بہت سی رسوم حفاظتِ عصمت کے لئے جو جاری کی ہیں وہ سب میری ایجاد ہیں۔ بالخصوص عورتوں کے پاؤں تنگ سخت جوتے میں مقید رکھنے کی رسم چین میں میں نے ہی چلائی ہے جسے "کنول قدم" کے مبارک نام سے یاد کیا جاتا ہے!!

عدالت خود ڈُو وانگ کی تھی اس نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ عورت اس پر ساحرانہ جمال کا پرتو ڈال رہی ہے۔ انداز اور شباب کی بجلیاں گرا کر اسے اپنے آغوش میں قیدی بنا کر جذب کر لینا چاہتی ہے اور اس کا حربہ دمبدم کارگر ہو رہا ہے۔

اس کو چھوڑ دینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ تمام چین متفقہ آواز بلند کر رہا تھا کہ اس بدکردار اور ناپاک ہستی کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچانا ضروری ہے۔ ڈُو وانگ نے جلاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"اپنا کام کرو"

طا۔ کی مسکرا کر نوجوان جرنیل کی طرف حریصانہ طور سے دیکھنے لگی ——— وہ ایک دفعہ پھر مسکرائی اور کس قدر زہر تھا اس کی مسکراہٹ میں جب ڈُو وانگ ٹکٹکی کے پاس سے گزرا جلاد نے اس کے خوبصورت سیاہ بال۔ رسم کے موافق اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے اس کو ٹکٹکی سے باندھ دیا گیا تھا۔ سر قلم کرنے کے لئے جلاد اپنا آفتاب جیسا چمکیلا سیفہ ایک ناپاک و نجس سر کو اس کے تن سے جدا کرنے کے لئے تول رہا تھا!

معارف

ظفر قریشی بی۔ اے

حسن صبح بہار ہے تیرا
لالۂ زرنگار ہے تیرا
خواب ہو یا کہ نقش بے معنی
زندگی شاہکار ہے تیرا
جس کو اپنی خبر نہیں کوئی
کیا وہی رازدار ہے تیرا

حمید عرفانی ایم۔ اے

رباعیات

(۱)

پیمانِ شراب آج اٹھا لی کیسی
ساقی تری آنکھوں سے چرا لی کیسی!
وہ لپکا پڑا ہے کہ الٰہی توبہ!
کمبخت کسی نے منہ لگا لی کیسی!!

(۲)

دل صدقۂ جامِ زرفشاں کر ساقی
لے مے پہ نچھاور مری جاں کر ساقی
ہستی ہے یہ اک گھونٹ بھی جاں کے لیے
کچھ اور بھی نرخ اس کا گراں کر ساقی!

(۳)

کام آئی تری مست نگاہی ساقی
کس طرح دیا شرم نباہی ساقی
ہوں مستِ نگہ! خدا کو یوں ٹال دیا
ورنہ مری ہوتی رو سیاہی ساقی

(۴)

بے بادہ بہارِ عیشِ فانی کیا ہے!
بے بادہ ایاغِ زندگانی کیا ہے؟
مٹی کا پیالہ ہے وہ اک بے قیمت
بے بادہ ایاغِ زندگانی کیا ہے!

سعید احمد اعجاز

بیاہ

ایک ہندی کہانی

"ذیل کا افسانہ ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون شریمتی شورانی بی۔ اے نے لکھا ہے۔ میں نے اسے دیوناگری حروف کی بجائے اردو رسم الخط میں لکھ دیا ہے۔ نہ کوئی لفظ بدلا ہے۔ نہ کسی کا ترجمہ کیا ہے۔ اس محنت سے غرض صرف اتنی ہے کہ اردو پڑھنے والوں پر واضح ہو جائے کہ وہ ہندو جنھوں نے اردو فارسی نہیں پڑھی مگر ان کا دل و دماغ "بنارسی پنڈت کی ہندی" کو ملکی زبان بنانے کی بجائے عام زبان بولنے اور لکھنے کا عادی ہو تو وہ ایسی زبان بولتا ہے جیسی کہ اس مضمون میں استعمال کی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ فارسی و عربی کے کتنے لفظ ہیں جو بے تکلف اس مضمون میں استعمال ہو گئے ہیں اور بعض سنسکرت کے ایسے لفظ آپ کو نظر آئیں گے کہ ہماری بول چال میں ان کا اور مفہوم ہے اور ہندی زبان کے ادیب اس کا اور مفہوم لے رہے ہیں۔ اور بعض ایسے الفاظ ہیں کہ ایک ہندو ادیب ان کے سوا دوسرا لفظ بول ہی نہیں سکتا۔ ان امور میں سے میں تصریح کسی کی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ناظرین خود غور فرمائیں اور میری رائے کی تائید یا تردید کریں۔ شہاب

(۱)

منشی شمبھوناتھ کو مایا کے وِواہ کی بڑی چنتا تھی! مرنے سے پہلے کنیا دان کا پن لے لینا چاہتے تھے۔ منشی جی کی تین پشتوں میں کوئی کنیا ہوئی ہی نہیں۔ دیوتاؤں کی بہت منوتیاں کرنے کے بعد پوتی ملی تھی۔ ان کے پتر دینا ناتھ کو یہ کنیا رتن ملی تھی۔

دینا بابو نے باپ کا پرستاو سن کر کہا: "آپ کو بھی خوب سوجھی ابھی اس کا نواں سال ہے۔"

منشی جی بولے: "بیٹا میرا اب کون بھروسا۔ پکا ہوا آم ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو مجھے کنیا دان کا پن بھی نہ ملے؟"

دینا ناتھ پتا کے بھگت تھے چپ ہو گئے۔ دودھ مونہی لڑکی کے وِواہ کی کلپنا ہی ہاسیاسپد تھی۔

منشی جی نے بیٹے کے من کا بھاؤ تاڑ کر کہا: "اسے میری بے وقوفی ہی سمجھو مگر میں آشاوادی ہوں اور ایشور پر بھروسا رکھتا ہوں کسی طرح کی شنکا مت کرو۔ میری مایا جہاں جائے سکھی رہے گی۔"

دینا بابو بولے "جیسی پھر آپ کی اچھا"

مایا دوڑی آئی اور منشی جی کی پیٹھ پر بیٹھ کر ان کی دونوں آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی :-

"میں کون ہوں بوجھو"

منشی جی نے ہنس کر کہا۔ "تو میری رانی بیٹی مایا ہے"

آج کسی سہیلی نے مایا کے نام کی ہنسی اڑائی تھی۔ وہ بات مایا کے من میں کھٹک رہی تھی۔ دادا کی گود میں بیٹھ کر بولی۔

"دادا جی! میرا نام کس نے مایا رکھ دیا؟"

منشی جی ہنس کر بولے "بیٹیا یہ نام میں نے رکھا ہے۔ بہت دنوں تک مایا دیوی کی پوجا کی کہ وہ میرے گھر آ کر اسے پوتر کریں جب دیوی جی نے ور دان سوروپ تجھ کو دیا تو میں نے تیرا نام مایا رکھا"

مایا پرسن ہو کر بولی "تو دادا جی۔ میں بھی کیا دیوی ہوں؟"

منشی جی اسے گلے لگا کر بولے "ہاں تم دیوی ہو۔ ہم ہندو لوگ کنیا کو دیوی ہی کے روپ میں دیکھتے ہیں"

(۲)

دینا بابو باہر سے آئے۔ ایک فوٹو پتا کے ہاتھ میں رکھ کر بولے بڑا ہونہار

لڑکا ہے اور کتنا روپ وان!"

منشی جی فوٹو دیکھ کر بولے :" ہاں لڑکا اچھا ہے لیکن میری مایا کون کم ہے!"

مایا نے منشی جی کے ہاتھ سے فوٹو چھین لیا اور بولی " داداجی! یہ فوٹو میں لوں گی۔ میں اس سے اپنا بیاہ کروں گی "

دادا نے رنو رکیا " کیا کرے گی بیٹی بیاہ کر کے ؟"

مایا نے اپنے ماما جی کی بیٹی للتیا کا بیاہ دیکھا تھا۔ خوب باجے بجے تھے۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے آئے تھے اور بہت سی مٹھائیاں بنی تھیں ۔ وہ دھوم دھام خوب اچھا لگتا تھا۔ پھر وہ کیوں نہ اپنا ووا ہ کرے ؟

منشی جی ہنسکر بولے "بیٹا۔ للتیا کو تو وہ سب اپنے گھر لے گئے کہیں تجھے بھی گھر لے گئے تو میں کیا کروں گا ؟"

مایا کچھ چنتت ہوکر بولی :" تو پھر رہنے دو میں نہیں لوں گی کچھ بھی" پھر کچھ سوچ کر بولی " تو دادا جی سب چیزیں لے کر گھر میں رکھ لینا اور سبھوں کو مار کر بھگا دینا۔ دروازہ بند کر لینا۔ اچھا!"

منشی جی بولے :" بیٹا! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کیسے ان کو جیتوں گا ؟"

مایا نے سارا پروگرام سوچ لیا تھا۔ داداجی اور بابوجی اور دادی جی اور اماں جی سب لوگ رات کو چلیں گے اور سارا سامان لے کر رات کو بھاگ آدیں گے کسی کو خبر نہ ہوگی۔

منشی جی کی آنکھوں کے سامنے وِدائی والا دَشے آگیا۔ بڑے پریم سے مایا کو چھاتی سے لگا کر اس کا مکھ چوما اور آنکھوں میں آنسو بھرے باہر چلے گئے۔

مایا سب کو ور کی فوٹو دکھاتی تھی اور خوش تھی۔ اس سے اس کا بیاہ ہوگا اس کے ساتھ خوب کھیلے گی۔ اس کی ماں اور دادی اس کے بھولے پن پر رو دیتی تھیں۔

(۳)

آج مایا کا بیاہ ہے۔ باجے بج رہے ہیں۔ دھوم دھام ہے۔ مایا بڑی خوش . . . . . . !

باہر سے دینا ناتھ آکر ماں سے بولے :" اماں ہم لوگ بارات لینے سٹیشن جاتے ہیں "

ماں نے کہا " جاؤ۔ مگر دیکھو مایا نہ دیکھنے پائے۔ نہیں تو وہ بھی چلنے کو تیار ہو جائے گی "

تب تک مایا خود ہی آ گئی۔ اور پتا کو کہیں جانے کے لئے تیار دیکھ کر بولی " بابوجی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی "

دینا بابو ہنس کر بولے " بیٹی۔ تو کہاں جائے گی میرے ساتھ! میں گھومنے نہیں جاتا کام سے جاتا ہوں "

"میں تو چلوں گی "

" وہاں فوج آئی ہے تم کو پکڑ لے جائے گی میں تو ان کو بھگانے جاتا ہوں بیٹی!"

مایا " نہیں بابوجی! میں بھی مار کر بھگا دوں گی!"

باہر سے منشی جی آکر مایا سے بولے :" چلو بیٹی! میں اور تم باغ کی سیر کر آئیں۔ ان کو جانے دو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے "

مایا سب سُدھ بُدھ بھول گئی اور دادا جی کے ساتھ باغ میں چل دی۔

(۴)

بارات خوب دھوم دھام سے آئی۔ باراتیں جنواسا دیا گیا۔ مایا بیچاری کو وہاں نہیں جانے دیا۔ نہ جانے وہاں کیا تماشہ ہو رہا ہے اور نہ جانے اُسے کیوں نہیں جانے دیا جاتا لیکن جب بارات دوار پر آگئی تو اس کو روکنا اسمبھو تھا جب منشی جی تھال میں آرتی سجا کر اور دوسرے تھال میں کپڑے اور گہنیاں لیکر چلے تو مایا کیسے ٹھہر سکتی تھی۔ پہلے تو کسی طرح اُسے استریوں نے قید کر رکھا تھا مگر جب استریاں خود بارات کی شوبھا دیکھنے کے لئے اپنے من پر قابو نہیں کر سکیں تو مایا تو بچی ہی ہے۔

مایا کو دتی پھاندتی اپنے دادا جی کے پاس پہونچی۔ جب دیکھا کہ وہ بڑے بھاو سے پوجا کر رہے ہیں تو خود بھی بنا کچھ کہے سنے ور کے پاس ہی بغل میں کھڑی ہوکر بولی " اب سے تم میرے گھر میں رہنا۔ اچھا! مجھ سے لڑنا نہیں۔ میں تجھے اپنے کھلونے دوں گی۔ میرے گھر میں بہت سی مٹھائی ہے تجھے کھلاؤں گی۔ اچھا!" جب ور نے اس کا بھی کوئی اُتر نہ دیا تو مایا کھج کر کہنے لگی " کیوں منہ بنا کر کھڑے ہو، بولتے کیوں نہیں ؟"

دینا بابو نے دیکھا کہ بھدّ ہوا چاہتا ہے۔ جاکر اسے گود میں اٹھا کر بولے:۔ "بیٹی تو بڑی پاگل ہے "

بارات میں جو بوڑھے تھے۔ وہ تو ایسی کنیا دیکھ کر خوش تھے۔ ان کے بچپن میں اسی طرح کے بیاہ ہوتے تھے۔ ہاں یُووَک ہنس رہے تھے۔ انھیں ایسی کنیا ایک عجوبہ تھی۔

دینا بابو نے جیوں ہی گھر میں جاکر مایا کو گود سے اتار دیا۔ وہ پھر دادا جی کے پاس پہنچ گئی۔ اور جب منشی جی سب سامان باراتیوں کو دینے لگے تو مایا ان کے ہاتھوں سے چھیننے لگی اور رو کر بولی " یہ سب میرا ہے۔ میں نہ دوں گی "

دَرَک کے پتا نے ہنس کر مایا کو گود میں لے کر کہا "تمہارا ہی ہے بیٹی!"

اور منشی جی سے کہا "آپ یہ سب سامان گھر ہی میں رکھ لیں۔"

تب کہیں مایا کو سنتوش ہوا۔ وہ تھال اور روپے لئے گھر میں آئی اور بارات جنواسے گئی۔

(۵)

سب رسموں کے بعد بیاہ کا سمے آیا۔ گہنے اور کپڑے تو مایا نے بڑی خوشی سے لئے اور پہنے۔ نائن اسے سکھا پڑھا کر منڈپ میں لائی۔ پر مایا نے جب دیکھا کہ درک کو بیٹھنے کو اچھا خوب صورت پیڑھا ملا اور اسے بیٹھنے کو کیول ایک تپّل ملی تو وہ درک سے بولی "میرا پیڑھا دے دو۔ نہیں میں گرا دوں گی۔" بیچارا درک شرما گیا۔

منشی جی بولے "بیٹی مایا جھگڑا نہیں کرنا ہوتا۔"

مایا نے بگڑ کر کہا "میرے ہی لئے تو پیڑھا آیا تھا سو میں تپّل پر بیٹھوں اور یہ راجا بن کے آئے ہیں جو پیڑھے پر بیٹھیں گے۔"

مایا کی باتوں پر سب کو ہنسی آگئی۔

درک کے پتا بولے "بیٹی جانے دو۔ میں کل تمہارے لئے بہت اچھا پیڑھا منگا دوں گا۔ سویرا ہونے دو۔"

بیاہ بھی ختم ہو گیا۔ جب بارات جنواسے چلی گئی تو مایا بڑی خوش تھی کیونکہ گہنے اور کپڑے سب مل گئے تھے۔

(۶)

دوسرے دن درک کے پتا نے آگرہ کیا کہ بہو کو بدا کر دیجئے۔ کیونکہ ان کی ماتا جی اپنے پوتے کی بہو کو دیکھنا چاہتی تھیں۔

منشی جی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "رات کے اُت پات کو دیکھ چکے ہیں۔ ابھی تو بہت بچی ہے۔"

سمدھی جی بولے "بچی جیسی آپ کی ویسی ہی میری۔ اماں کو بھی اسے دیکھنے کی بڑی سادھ ہے کہیں مر نہ جائیں۔ کرپا کر کے ایک دن کے لئے بدا کر دیجئے۔ دوسرے دن بلا لیجئے گا۔ ان کی سادھ پوری ہو جائے گی۔"

بدائی کا مہورت آ گیا۔ باجے بجنے لگے۔ دوار پر پالکی لگا دی گئی۔ مایا اپنی سہیلیوں کے ساتھ اندر پالکی میں بیٹھ گئی۔ سب میلا دیکھنے چلیں گے۔ اپنے نئے کپڑے دکھلاتی تھی۔ اور خوش ہوتی تھی۔

رضیہ بولی "جب میرا بیاہ ہوگا۔ تب مجھے بھی اسی طرح سب سامان ملیگا تمہارے بابو جی بڑے اچھے ہیں تبھی تو تمہارا بیاہ کر دیا۔ تبھی تو تمہیں گہنے اور کپڑے مل گئے۔"

اس منڈلی میں ایک لڑکی درگا تھی۔ اس کی عمر بارہ سال تھی۔ وہ دو ایک بیاہ اور بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ ان گہنوں کے بدلے خود ہی سب کو چھوڑ ایک غیر پریوار میں جانا پڑتا ہے۔ اسی لئے ان چیزوں کا مول اس کی آنکھوں میں نہیں کے برابر ہو گیا تھا۔

مایا نے ہنس کر کہا "درگا دیوی جلدی آؤ۔ نہیں تو تمہیں جگہ نہ ملیگی!"

درگا بولی "مایا تو پاگل ہے۔ میں نہیں آؤں گی۔"

ادھر بھیتر سب لوگ مایا کو ڈھونڈتے ہیں۔ مایا ہنس رہی ہے۔

منشی جی نے باہر جا کر دیکھا تو مایا اپنی منڈلی کے ساتھ پالکی میں بیٹھی ہے سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔

منشی جی کے رُکے ہوئے آنسو مایا کا بھولا پن دیکھ کر اور بھی اُمڈ آئے بولے "پیاری مایا! کیا تو آج اپنے دادا کو بھول گئی؟ میں تجھے کب سے ڈھونڈتا ہوں آ۔ مایا۔ میں تجھے چھاتی سے لگاؤں۔ بیٹی آ ...."

مایا کی کچھ سمجھ نہ آیا۔ بولی "دادا جی آپ بھی چلیں میلا دیکھنے۔ آپ بھی بیٹھئے میں نہ اُتروں گی۔"

جیسے مایا چاہتی تھی اسی طرح بدا ہو گئی۔ کیونکہ اُتری نہیں۔ دادا۔ پتا۔ اور بھائی بہنیں سب سٹیشن تک پہونچانے گئے۔

(۷)

جب تک سکھیاں گاڑی میں تھیں تب تک مایا خوش تھی لیکن جب وہ اکیلی ایک بڑی اِستری کے ساتھ رہ گئی۔ گھر کا کوئی دوسرا نہ تھا تو مایا نے رونا اور چیخنا شروع کیا۔ گاڑی پر سے کودنا بھی چاہتی تھی۔ بار بار کہتی تھی "میں دادا جی کے پاس جاؤں گی۔"

مہاراجن بولی "بیٹی شورت کرو۔ گاڑی پر چلو۔ کل ہم تم دونوں چلی آئیں گی۔"

مایا رو کر بولی "میں نہیں جاؤں گی میں دادا جی کے پاس جاؤنگی۔"

مہاراجن نے کہا "دادا جی گھر گئے۔ کل آئیں گے۔ تب میں اور تم دونوں دادا جی کے پاس چلیں گے۔"

مایا جب کسی طرح چپ نہ ہوئی تو مہاراجن بولی "دیکھو بیٹی تم روؤگی تو یہ سب دادا جی کے پاس کبھی نہ جانے دیں گے۔ اس لئے بیٹی تم رونا نہیں اور ان کے گھر میں کسی سے کچھ نہ بولنا نہیں تو گھر میں بند کر دیں گے۔ تب کیا ہوگا۔ جو

کوئی کچھ پوچھے تو سر ہلا دینا۔ اچھا! نہیں بیٹی گھر میں بند کر دیں گے تو دادا کے گھر کیسے ہم لوگ جائیں گے۔"

مایا۔ رو کر بولی :۔" تو دادا جی مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے ہیں ان پاجیوں کے پاس!"

مہاراجن بولی :۔" چپ بیٹی! کچھ نہ کہنا نہیں سن لیں گے تو آفت آجائیگی تب کیا ہوگا۔ بیٹی ان کے گھر میں کچھ نہیں بولنا جو کہیں سن لینا۔ اور جو کھانا دیں چپکے سے کھا لینا۔ بھلا بیٹی! کل دادا جی آئیں گے۔ ہم لوگ اپنے گھر چلے آئینگے"

مایا سہم گئی "میں کچھ نہیں بولوں گی چاچی۔ تم مجھے چھوڑ کر کہیں بھی مت جانا نہیں تو گھر میں بند کر دیں گے تو کیا ہوگا چاچی!"

مہاراجن نے کہا:" ہاں کچھ نہیں بولنا بس کہیں نہیں جاؤں گی بیٹی!"

(۸)

مایا اپنی سسرال آئی تو بہت ڈرتی تھی کسی سے کچھ نہ بولتی تھی۔ بولے گی تو بند کر دی جائے گی۔ تب دادا جی کے ساتھ کیسے اپنے گھر جائے گی مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تو دادی مایا کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگی۔ کئی چیزیں کڑوی تھیں لیکن تو مایا کچھ بولتی نہ تھی۔ سی سی کرتی جاتی تھی۔ آنکھوں سے پانی گرتا تھا اور ناک سے بھی۔

مایا کی دَدیا ساس بولی :۔" کیا ہے بیٹی مایا؟" مایا کچھ نہ بولی۔

دادی پھر بولی :۔" بیٹی کیوں روتی ہے۔ بتا دے۔ یہ بھی تو تیرا ہی گھر ہے"

جب اب کی بھی مایا نہ بولی تو سب شنکا ہوئی کہ وہ گونگی تو نہیں ہے۔

دادی نے مہاراجن سے پوچھا:" کیا بات ہے بہو بولتی کیوں نہیں ہے؟"

مہاراجن نے کہا:" شرماتی ہے سرکار۔ ابھی تو آپ کے گھر آئی ہے سرکار!"

دادی ہنسی۔" ابھی سے اس کو شرمانا کس نے سکھا دیا۔ ابھی تو بچہ ہے"

مہاراجن نے کہا:" صاحب گھر بھی بہت شرماتی ہے"

دادی پرسن ہوگئی:" میری بہو دیوی ہے"

مہاراجن بولی" سب آپ کی کرپا ہے۔ ہم لوگ کس لائق ہیں"

تیسرے دن مایا خوش خوش اپنے گھر آگئی۔ دادا جی سے بولی:" آپ مجھ کو چھوڑ کر چلے آئے ہیں وہاں کچھ بھی بولی ہوتی تو وہاں کے لوگ مجھے بند کر دیتے تو کیا ہوتا اب مجھے کسی کے پاس نہ چھوڑنا دادا جی۔ اچھا"

دادا نے پوچھا:۔" تجھے کسی نے مارا تو نہیں کھانا اچھا دیا تھا نا؟" مایا ناک سکوڑ کر بولی۔ کیا اچھا دیا کھانا بڑا کڑوا لگتا تھا مگر میں کچھ بولی نہیں ڈرتی تھی کہ سب بند کر دیں گے

مہر محمد خاں شہاب

ٹیپو کی وصیّت

ٹیپو نے کہا اپنے پسر سے دمِ آخر

"یہ قول جہاں تاب رکھ اے جانِ پدر یاد

جو مرغ کہ رہتا ہے فضا گیر و فلک سیر

ہر گز نہیں کھنچ سکتا سوئے دانۂ صیّاد

تابش نہ گر ایمان کی پہلو میں ہو دل تاب

بے زور ہے جنگاہ میں پھر بازوئے فولاد

لغزش نہیں ہے اُس مردِ جواں عزم سے ہوتی

ہو جس کے ارادوں کی "ہو اللہ" پہ بنیاد

حلقوں میں مقیّد نہیں رہ سکتی کبھی روح

رہتے ہیں سلاسل میں بھی مردانِ حُر آزاد

کٹ کٹ کے جوانوں کی طرح جنگ میں گرنا

میسور میں کرنا نہ غلامی مگر ایجاد"

شہید ابن علی

جھوٹ

"دیہاتی لڑکی کو پڑھانا لکھانا اپنے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔" زمین پر ہاتھ پٹک کر جھنکی نے اپنے پتی سے کہا ہیرالال نے سر اٹھا کر اپنی پتنی کی طرف دیکھا جیسے اس کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں کہ کیا بات ہے؟

"اکیلی لڑکی سمجھ کر لڑکے کی طرح پالا" ——— ہاتھ مٹکا کر جھنکی نے کہا "اب میم بننا چاہتی ہے؟"

"جب سے دُلریا پڑھنے لگی۔ تبھی سے تم اس کے پیچھے پڑی ہو۔ آخر کیا کیا بیچاری نے؟"

"تمھیں نے اسے خراب کیا۔ اور اسی طرح کی باتیں کہہ کہہ کر میرا تو ایسا جی چاہتا ہے کہ جان دے دوں" جھنکی نے غصّے سے اتنا کہہ کر آنسو بہانا شروع کیا۔

ہری لال سے اپنی استری کا رونا نہیں دیکھا گیا۔ اس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا ——— "آخر بات کیا ہے؟"

جھنکی نے کہا ——— "اسی تمھاری دُلریا کا گُن ہے۔ ابھی زمیندارن کے ہاں ہم دونوں گئی تھیں۔ لڑکی سُندر ہے ہی اسے دیکھ کر زمیندارن نے کہا۔ میرا جی چاہتا ہے تمھاری لڑکی اپنے لڑکے سے بیاہ دوں۔ ان کی بات سن کر میں تو یہ سوچ کر خوش ہو گئی کہ ایسا اچھا گھر ملے گا۔ پر اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ ——— "تمھارے لڑکے سے بیاہ نہیں کرونگی" تمھیں بتاؤ بھلا کہیں لڑکیاں بھی ایسی بات کرتی ہیں۔ وہ تو میں نے بات بنالی نہیں تو اس دُلریا نے سب چوپٹ کر دیا تھا۔ لوٹتی بار راستے بھر مجھ سے لڑتی آئی ہے اور یہاں منہ لپیٹے پڑی ہے۔ سنا گُن اپنی دلاری کا؟"

"ابھی بچی تو ہے ہی" کہہ کر ہیرالال اٹھ کر دلریا کے پاس گئے۔ دیکھا تو پڑی آنسو بہا رہی تھی۔

× × × × × × ×

دلاری اپنی ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کی طرح نہ تھی۔ وہ سندری ہی نہیں تھی۔ اس میں ایک ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو زبردستی اس کی طرف کھینچ لیتی تھی جسے اس کی ماں ضد کہتی تھی وہ اصل میں دُلریا کا وصف تھا جسے وہ اپنی عزت کا غرور سمجھ کر کرتی تھی۔ اس دن اس کا زمیندار کے ہاں جانا اس کے لئے بڑی تکلیف کا باعث ہوگیا۔ زمیندار کا لڑکا برجو ہیرالال کے ہاں آنے لگا اور دلریا سے ایسی باتیں کرنے لگا جیسے بیاہ طے ہو گیا ہو۔

دلاری کو برجو سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ برجو کی بات چیت اس کا بول برتاؤ اسے اتنا رُوکھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا یہی جی چاہتا تھا کہ جب برجو آئے تو کہیں بھاگ جائے لیکن وہ اپنی ماں سے بے بس تھی جو اسے برجو سے بات چیت کرنے اور ہنسنے بولنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔ اس کی ماں تو یہ سمجھتی تھی کہ دُلریا کو برجو جیسا بَر دنیا بھر میں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گا۔

دُلریا بات تو کرتی برجو سے پر اسے دھیان ہر وقت رہتا تھا شیامو کا جو اس کے ساتھ کا پڑھا تھا اور پاس ہی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شہر میں جا کر نوکری کرتا تھا۔

دُلاری اور شیامو دوست تو ضرور تھے اور ان میں ایک دوسرے کے لئے پریم بھی تھا لیکن انھوں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

× × × × × ×

شیامو دس پندرہ دن کی چھٹّی لے کر جب اپنے گاؤں میں آیا تو اسے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ دلاری کا بیاہ برجو سے ہو رہا ہے۔ یہ اپنے معمول کے مطابق اس روز دُلریا سے ملنے نہ گیا۔ طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا اور اپنے کمرے سے باہر بھی نہ نکلا۔

جب دلریا نے سنا کہ شیامو آیا ہے تو وہ اس کی راہ دیکھنے لگی لیکن جب وہ نہ آیا تو اسے بھی بڑا دُکھ ہوا۔ اور سوچنے لگی کہ کیا یہ مجھ کو بھی بھول گیا؟ دوسرے دن سویرے ہی اس نے شیامو کو بلوانے کے لئے آدمی بھیجا لیکن وہ گھر نہ تھا۔ دلاری کا کلیجہ بیٹھ گیا اور وہ گھر سے نکل پڑی اور اپنی ماں سے مندر کا بہانہ کر کے جمنا کنارے دل بہلانے چلی گئی۔ اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوچنے

گی کہ نہ! میں ایسی ابھاگنی ہوں کہ ماں باپ میرا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ اور اس موہکو یہ جوکی زمینداری دیکھ کر مجھے زبردستی اس کے گلے منڈھ رہے ہیں شیامو کہاں چلا گیا ہے؟ وہ مجھ سے کیوں نہیں ملا؟ یہ سب سوچ سوچ کر وہ دکھ اور چنتا کے اتھاہ ساگر میں ڈوبی جا رہی تھی۔

اتفاق سے شیامو بھی دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ وہ دلاری کو دیکھ کر اس کی طرف چلا لیکن یہ اس طرح سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے شیامو کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

"دلاری!"

"کون، شیامو؟" چونک کر اور خوش ہو کر دلاری نے کہا۔ دونوں دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن بیاہ کی کچھ چرچا نہ چھیڑی۔ زیادہ دیر ہوئی تو دونوں گھر کی طرف چلے۔

"آج میں سویرے سے کسی سے نہیں بولا تھا"

"میں بھی کسی سے نہیں بولی تھی اور آج مجھے ایسے آدمی کی کھوج تھی جو میری مصیبت سنے . . . . اتنا کہہ کر دلریا رک گئی اسے خیال آگیا کہ وہ ناحق ایسی بات کہہ گئی جو اسے نہیں کہنی چاہئے تھی۔ آخر شیامو اس کا تھا ہی کون؟

شیامو نے دیکھا کہ دلریا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔ تو اس نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے ہٹ کر کے پوچھے۔

× × × × × × ×

اسی دن شام کو ——————

"دلاری چلتی ہو گھومنے؟" برجو نے پوچھا۔

"نہیں!" دُلاری نے روکھائی سے جواب دیا۔

"میں بھی چلتی ہوں بیٹی، چلو نہ" دلریا کی ماں نے کہا۔

"میں بہت تھکی ہوں۔ میں نہ جاؤں گی۔"

"چلو!" کچھ کڑائی سے جھنکی نے کہا۔

"نہ جاؤں گی!" دلریا نے پھر اسی استقلال کے ساتھ کہا۔

"اچھا میں ابھی گھوم کر آتا ہوں" کہہ کر برجو چلا گیا۔

جھنکی غصے سے لال ہو کر گھورتی رہ گئی۔ دلریا وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلی گئی۔

وہ اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر سوچتی رہی کہ اس طرح یہ جھمیلا کتنے دنوں تک چلتا رہے گا۔ اس نے سوچ لیا کہ جب برجو آئے گا تو صاف صاف کہہ دوں گی کہ تم سے ہرگز بیاہ نہ کروں گی۔ اس نے پھر سوچا کہ اس بیسویں صدی میں بھی کیا کوئی اس طرح زبردستی اسے برجو جیسے نالائق سے بیاہ سکتا ہے؟"

اسے اپنے کمرے میں چین نہ ملا۔ وہ باہر نکل گئی اور بستی سے باہر چلی گئی اُدھر سے شیامو بھی آ رہا تھا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھوں اس وقت تم سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں؟" اس نے دلاری سے کہا۔

"گھر میں جی نہ لگا۔ اسی سے نکل پڑی" تھوڑی دور تک دونوں چلے گئے۔

"شیامو! میری مدد کرو گے؟" دلاری نے پوچھا۔

"ضرور!" دلاری جھینپ سی گئی۔

زبان سے اس نے کچھ نہ کہا دونوں کی آنکھوں ہی نے آپس میں سب کچھ طے کر لیا۔

گھر پر آ کر اس نے برجو کو دیکھا جھنکی اس سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ دلاری نے کہا —————— "میں برجو بابو سے الگ کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اس کی ماں وہاں سے ہٹ گئی۔

"برجو بابو!" دلاری نے کہا۔ اور اسے اپنی اس جرأت پر خود ہی تعجب ہو رہا تھا —————— "میں سنتی ہوں آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ایسی تجویز پر فخر کرنا چاہئے لیکن افسوس کی بات ہے کہ میں آپ سے بیاہ نہ کروں گی۔ شیامو . . . ."

بات کی ابتدا سن کر تو برجو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی لیکن شیامو کا نام سن کر اس کے چہرے کا رنگ ایسا بدل گیا کہ دلاری ڈر کر چپ ہو گئی۔

"شیامو —————— ؟" کچھ سوچتے ہوئے تھوڑی دیر کے بعد برجو نے کہا "شیامو وہی سندر پور والا نہ جس کی استری نے دو سال ہوئے پنچایت بٹوری تھی؟"

دلاری کا منہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا جی جانے کیسا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا ہو۔ وہ پاگل سی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا —————— "ہاں وہی شیامو میرے ہی پیچھے تو اس کی استری نے پنچایت بٹوری تھی . . . . ."

یہ خوفناک جھوٹ دلاری کے منہ سے نکلنے کو تو نکل گیا لیکن وہ بے جان سی ہو گئی۔ پھر بھی اس نے اپنے کو سنبھالا۔ اور برجو کی طرف دیکھتی رہی تاکہ وہ اسکی کمزوری بھانپ نہ جائے۔ اسے اس وقت صرف اپنے شیامو کا خیال تھا جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی۔

"تم سچ کہتی ہو —————" تھوڑی دیر چپ رہ کر برجو نے زور

سے پوچھا۔

"بالکل سچ کہتی ہوں لیکن کسی سے کہنا مت۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں سب معلوم ہے۔"

دلاری کی باتیں سن کر برجو کچھ نہ بولا۔ اور اٹھ کر چلا گیا۔

× × × × × × ×

برجو کے چلے جانے کے بعد اس کے جھوٹ نے اسے ادھ موا کر دیا۔ وہ ایک چارپائی پر پڑ گئی اور اپنے اس نیچ پن پر خوب روئی۔ برجو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

یہ سچ تھا کہ اس نے اپنے جی کا ایک جھنجھٹ تو جھوٹ بول کر توڑ دیا تھا لیکن اسے اپنے اس جھوٹ بولنے پر اس دن تک لاج آتی رہی جب تک وہ بیاہ کر کے شیامو کے گھر نہ گئی اور اس نے شیامو کو اپنے جھوٹ بولنے کی کتھا نہ سنا دی۔

"تو اس طرح جھوٹ بول کر تم نے مجھے پایا ہے ——— ؟" شیامو نے پیار سے کہا۔ اور دلاری کو گلے سے لگا لیا۔

آسی رام نگری

تصوّر

میں نے آہنی سلاخوں سے باہر دیکھا
رات سادہ تھی مگر مہیب ——— !
میرے تصوّر میں تم تھے
اچانک آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔
اس کی سرخ اور سنہری چمک سے آسمان روشن ہو گیا
اور ایک لمحہ کے بعد یہ چمک رات کی بے پایاں تاریکی میں گم ہو کر رہ گئی۔

آہ! میری دنیا تباہ ہو گئی ——— !
راکھ ہو گئی ——— !
میں نے آہنی سلاخوں میں سے باہر دیکھا۔
میرے تصوّر میں تم ہی تھے۔
آخر یہ آہنی سلاخیں کیوں ؟
تم کیوں ——— اور
میں ——— کیوں ——— ؟
آخر یہ دن رات۔ یہ ماہ و سال کیوں ؟
جب کہ ایک دنیا ایک ہی چمک کے بعد تباہ ہو جاتی ہے،
ہمیشہ کے لئے راکھ ہو جاتی ہے۔!

بشیر ہندی

غزل

آباد اگر نجد کا ویرانہ نہیں ہے
مجنوں کو بلاؤ۔ وہ دیوانہ نہیں ہے؟

ہے شمعِ وفا محفلِ اُلفت میں ضیاریز
اِس شمع پہ لیکن کوئی پروانہ نہیں ہے

یہ عقل کی باتوں میں تو آئے گا نہ ہرگز
عاشق ترا ہشیار ہے دیوانہ نہیں ہے

ساقی تری محفل ہے مئے ناب میں غرقاب
اور میرے لئے ایک بھی پیمانہ نہیں ہے

کافر بھی مسلمان بھی شیدا ہے بتوں پر
وہ کونسا دل ہے جو صنم خانہ نہیں ہے

دو اشک ہی نکلے تھے کہ اُس شوخ نے ٹوکا
حضرت! یہ مرا گھر ہے، عزا خانہ نہیں ہے

مجھ کو نظر آتا ہے یہ عالم ہمہ تن نُور
اک ذرہ یہاں حُسن سے بیگانہ نہیں ہے

ہوتا ہے اس آغاز کا انجام بہت نیک
جو کعبہ نہ بن جائے وہ بُت خانہ نہیں ہے

ہر رنگِ تغزّل مرا معمول ہے اختر
کم ظرف مرے شعر کا پیمانہ نہیں ہے

ہری چند اختر

تہذیب کدھر جا رہی ہے

اقتصادی اور سیاسی قوتوں کا تجزیہ

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران میں یورپ نے ایک نہائت عجیب و غریب تہذیب کی بنا ڈالی ہے۔ سائنس کی ترقی کی وجہ سے فطرت کی طاقتیں انسان کے قابو میں لائی گئی ہیں اور اُن کی مدد سے مادی زندگی کی ضروریات ایک بہت بڑے پیمانے پر پیدا کی جا رہی ہیں۔ یہ نئی قوتیں اور نئے طریق کم و بیش تمام ممالک پر اثر انداز ہو چکے ہیں اور ذرائع باربرداری اور خبررسانی کی ترقی کی بدولت تمام عالم ایک ہی تہذیب کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔

تاہم اس دورانِ ارتقا میں اس تہذیب نے کئی ایک سیاسی و اقتصادی آویزشوں کو جنم دیا ہے۔ اِن آویزشوں کا اصلی مبدا، تو انسان کے وہ طبعی رجحانات ہیں جو اسے قبضہ حاصل کرنے اور حکومت کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ مگر اُن حالات کے ماتحت جو "صنعتی انقلاب" کے باعث ظہور پذیر ہوئے ان متضاد قوتوں نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اور اگر ان کا ازالہ نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ کہیں یہ تہذیب کو نیست و نابود نہ کر دیں۔ اس چھوٹے سے مضمون میں یہ تو ممکن نہیں کہ ان تمام مسائل پر ایک بسیط بحث کی جا سکے اور ان آویزشوں کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی جا سکے۔ اس لئے میں ان میں سے صرف تین مسائل پر ناقدانہ نظر ڈالوں گا۔

ان تین متضاد آویزشوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پہلی آویزش غیر مطمئن اور مطمئن اقوام کے درمیان ہے۔ اوّل الذکر ممالکِ مقبوضہ کی موجودہ تقسیم کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور ثانی الذکر اس تقسیم کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ جرمنی۔ اٹلی۔ جاپان وغیرہ غیر مطمئن اقوام میں اور انگلستان فرانس اور امریکہ مطمئن اقوام میں شمار ہوتے ہیں۔

(۲) دوسری آویزش ملوکیت پرست طاقتوں اور ان کی محکوم اقوام کے درمیان ہے۔ مؤخر الذکر کو سیاسی آزادی کی ضرورت کا احساس ہو چکا ہے اور وہ سیاسی طور پر بیدار ہو چکی ہیں۔ اس لئے آزادی حاصل کرنے پر مُصر ہیں۔

(۳) تیسری آویزش دو معاشرتی اصولوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو موجودہ نظامِ معاشرت کے حامی ہیں جس کی بنا سرمایہ داری ہے۔ دوسری طرف وہ ہیں جو اشتراکی نظام کے قیام کے خواہاں ہیں۔ یہ تینوں آویزشیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔

اب ہم ان آویزشوں کا یکے بعد دیگرے مطالعہ کریں گے۔

فسطائی خطرہ

پیشتر اس کے کہ ہم فسطائی اقوام کے مطالبۂ تقسیم جدید اور اس کی اہمیت پر نظر ڈالیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فسطائیت کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بقول سکاٹ نیرنگ تحریک فسطائیت سرمایہ دار اور حقوق یافتہ افراد کی تحریک ہے اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی جاری کردہ ہے پہلے پہل تو یہ تحریک متوسط طبقہ کی قیادت میں رہتی ہے مگر بعد ازاں اس حکمران طبقہ کی قیادت میں چلی جاتی ہے جو جنگِ عظیم، اقتصادی بدحالی اور محکوم اقوام کی بغاوت سے برباد شدہ سرمایہ دار شہنشاہیت سے مُنہ موڑ رہا ہو اور مزدور بغاوت کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے تدبیریں سوچ رہا ہو۔ عموماً یہ عناصر قومی جذبے کی آڑ میں مزدور تحریک کا قلع قمع کرنے کے لئے اقتصادی طور پر دوسری قوموں سے بے نیاز ہونے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

غرضکہ فسطائیت ذیل کے مقاصد پر مشتمل ہے:-

(ا) نظامِ سرمایہ پرستی کو اس کے دورِ ابتلا میں مزدور تحریک کے حملوں سے محفوظ رکھنا۔ فسطائی ممالک پر اس مقصد کے حصول کے لئے ٹریڈ یونین کی قبیل کے مزدور اداروں کو کچلنا تقریر و تحریر پر پابندیاں عائد کرنا ہڑتال وغیرہ کو خلافِ قانون قرار دینا اور جمہوری اداروں کو ہر ممکن ذریعہ سے مٹانا۔

(ب) نوآبادیات اور مقبوضات حاصل کر کے اقتصادی طور پر بیرونی اقوام سے بے نیاز ہونا۔

(ج) جارحانہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عوام کے جذبۂ حبِ وطن یا نسلی امتیاز سے کھیل کر ان کی مدد حاصل کرنا۔

(د) قومی دنائت کے احساس کو دور کرنے کے لئے شاندار فتوحات حاصل کرکے بالآخر تمام دنیا کی قیادت کی امید رکھنا

فسطائیت کے مندرجہ بالا مقاصد اور عزائم موجودہ فسطائی طاقتوں کے حالات اور افعال کا مطالعہ کرنے سے بہت اچھی طرح عیاں ہو جاتے ہیں۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح یہ طاقتیں دنیا کے امن اور تہذیب کے لئے خطرۂ عظیم بنی ہوئی ہیں۔ ان تینوں ممالک میں فوجی شخصی یا جماعتی آمریت قائم ہے۔ مسولینی اٹلی میں اور ہٹلر جرمنی میں شخصی ڈکٹیٹر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جاپان میں کوئی شخص قائد نہیں۔ یہاں فوجی جماعت کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ ان تینوں ممالک میں ٹریڈ یونین، مزدوروں کی جماعتیں اور آزادئ تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد ہیں۔ تینوں میں ڈکٹیٹر شپ اقتصادی بدحالی کے ایام میں ظہور پذیر ہوئی۔ تینوں عوام کے جذبۂ حب الوطن اور نسلی امتیاز کو اپیل کرتے ہیں۔ تینوں یا تو پہلے ہی سے علاقہ غیر پر حملہ کرکے قابض ہو چکے ہیں یا ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تینوں جنگ کی پوجا کرتے ہیں اور اُسکی تیاریوں میں ہمہ تن مشغول ہیں۔

جاپان

جاپان ہی کو لیجئے پچھلے پانچ سالوں میں اُس نے مانچوریا، جیہوں، اندرونی منگولیا اور شمالی چین کے چند صوبوں پر اپنا فوجی تسلط جما لیا ہے۔ ان ملحقہ علاقوں کا مجموعی رقبہ۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی اور سپین کے مجموعی رقبہ سے بھی زیادہ ہے۔ اب وہ سارے چین پر سیادت کا دعویدار ہے اور غالباً جرمنی کی امداد سے سویٹ روس پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا منتہائے نظر مشرقی ایشیا پر مکمل تسلط قائم کرنا اور مشرقِ بعید سے فرانس، برطانیہ، اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا اخراج ہے۔ انگلستان، جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مشرقِ بعید میں امریکہ والوں کے عزائم اور چینی قومی تحاریک اور روسی کمیونزم کے راستے میں ایک سدِ راہ خیال کرتا رہا ہے۔ مگر اب انگریزی رائے عامہ جاپانی عزائم سے خائف نظر آتی ہے اور اس کا ایک اہم طبقہ اس مشترکہ خطرے کے خلاف اینگلو امریکن معاہدے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر انگلستان نے دوربینی سے کام لیا ہوتا اور مجلسِ اقوام کی اُس وقت حتمی طور پر مدد کی ہوتی جبکہ جاپان نے ۱۹۳۱ء میں پہلے پہل معاہدۂ کیلاگ اور لیگ کی دفعات کی خلاف ورزی کی تھی تو لیگ زیادہ مستحکم ہو جاتی اور اٹلی کے بعد کے جارحانہ اقدامات ناممکنات میں سے ہو جاتے۔

اٹلی

اب ہمیں اٹلی کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جبکہ ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت نہائت گری ہوئی تھی۔ اُس وقت مسولینی عروج پذیر ہوا۔ اُس نے ملک میں اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے بعد فوراً ہی اٹلی کی شکایاتِ بے انصافی کو جو اس کے جائز حقوق میں جنگِ عظیم کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم میں برتی گئی تھی بلند کیا۔ اٹلی بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل کرنا چاہتا تھا سو اس نے حبشہ پر نہائت ہی معمولی وجوہات کی بنا پر حملہ کر دیا اور اُسے فتح کرکے اپنا مقصد حاصل کیا۔ اس میں بھی برطانیہ کے کوئی فیصلہ کن طریق عمل اختیار نہ کرنے سے اٹلی کی بڑی حد تک مدد ہو گئی۔ فرانس چاہتا تھا کہ وہ برطانیہ سے وعدہ لے کہ جب جرمنی اُس پر حملہ کرے تو برطانیہ اس کی مدد کرے گا مگر جب وہ اس طرف سے ناامید ہو گیا تو اُس نے اٹلی سے معاہدہ کر لیا اور تعزیرات کے عائد کرنے میں پوری طرح دلچسپی نہ لی۔ اس وقت برطانیہ ایک طرف تو اٹلی سے مالِ غنیمت کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھا اور دوسری طرف اجتماعی حفاظت کا پرچار کرتا تھا۔ حبشہ پر اٹلی کی فتح برطانیہ کے حق میں ایک قسم کی دھمکی تھی۔ نیز اٹلی نے ابھی سے برطانیہ کی بحرِ روم میں فوقیت پر اعتراض کرنا شروع کر دیا ہے۔ جب سپین میں اٹلی اور جرمنی کی صریح مدد اور فرانس اور برطانیہ کے کوئی حصہ نہ لینے کی غیر جانبدارانہ پالیسی سے جنرل فرنکو کی فسطائی طاقت قائم ہو جائے گی تو یہ معاملہ اور بھی نازک صورت اختیار کرے گا۔

جرمنی

سب سے زیادہ خطرے کا احتمال جرمنی سے ہے۔ جہاں ایک ایسی رجعت پسند جماعت برسرِ اقتدار ہے۔ جو قومی وحشت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ ہٹلر کے عروج کی وجہ جرمنی کا وہ احساس دنائت تھا جو معاہدہ ورسیلز نے ایک ایسی شجاع اور شاندار روایات رکھنے والی قوم پر اقتصادی اور سیاسی پابندیاں عائد کرکے پیدا کر دیا تھا۔ برونِنگ کی حکومت کی مالی حکمت عملی نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا اور اُس پر طرہ یہ کہ ۳۲-۱۹۳۱ء کی اقتصادی مشکلات اور مالی کمزوریوں نے تازیانے کا کام کیا اور حالات نے نہائت نازک صورت اختیار کر لی۔ سو اِن نازک حالات میں اشتمالی فرقے کی تدابیر اور جمہورِ اشتراکی کی بے اثری نے رجعت پسند عناصر کو مستحکم بنا دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے عنانِ ملک ہاتھ میں لے لی۔ اس مقامِ اعلیٰ پر پہنچنے کے بعد ہٹلر تین سال کے اندر اندر اپنے دشمنوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تمام ان لوگوں کو جو آرین نہیں تھے یعنی جن کے خون میں ضعیف سے ضعیف بھی یہودی اثر تھا۔ ملک سے نکال باہر کیا اور معاہدہ ورسیلز کی تمام قیود اور پابندیوں کو معاہدۂ لوکارنو کی قیود سمیت توڑ ڈالا۔

یہاں بھی ہٹلر کی کامیابی برطانوی خارجی پالیسی کے تذبذب کی وجہ سے تھی۔ انگریزوں نے اُن بے انصافیوں کو جو جرمنی سے جنگِ عظیم کے بعد کی گئی تھیں مدنظر رکھتے ہوئے ہٹلر کی چالوں کو نرمی کی نظر سے دیکھا۔ جرمنی نے لیگ سے کنارہ کشی کر لی اور اسلحہ بنانے شروع کر دیئے جن پر اُس نے تین سال میں ۱۵۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ خرچ کئے۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر کی فوجیں خطۂ رائن میں داخل ہو گئیں جو ۱۹۲۵ء کے عہد نامۂ لوکارنو کی رُو سے فوجی طاقت سے پاک رکھا گیا تھا اور اب ہٹلر جرمنی کی کھوئی ہوئی نوآبادیات واپس طلب کر رہا ہے۔ ہٹلر کے خیالات بڑے وسیع اور بلند ہیں۔ اُس نے اپنا پروگرام صاف لفظوں میں اپنی کتاب "میری جہدِ حیات" میں لکھا ہے۔ اور یہ کتاب جرمن فسطائیت کی انجیل سمجھی جاتی ہے اور جرمنی میں ہر شادی پر میاں بیوی کو تحفۃً پیش کی جاتی ہے۔ تمام ملکوں کو جن میں جرمن لوگ بستے ہیں۔ جرمنی کے ماتحت لانا اُس کا مقصد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ آسٹریا اور ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، زیکوسلوویکیا، ہنگری، رومانیا، لتھوانیا اور پولینڈ کے اُن علاقوں کو جن میں جرمن لوگ بستے ہیں حاصل کیا جائے۔ فرانسس ولیمز اس کے متعلق کہتا ہے کہ جرمن سکولوں میں جغرافیہ کے طلباء کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جرمنی کی حدود یہ نہیں جو موجودہ زمانے میں ہیں۔ ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ حدود صرف عارضی ہیں۔ اور اصل حدود وہ ہیں جو وسطِ یورپ پر حاوی ہیں۔ ہٹلر کا موجودہ مطمحِ نظر ملک روس معلوم ہوتا ہے۔

ہٹلر اپنی کتاب میں رقمطراز ہے "اگر کوئی سلطنت نئی آبادیات اور قلمرو حاصل کرنا چاہے تو وہ صرف روس سے ایسی قلمرو کی مقتضی ہو سکتی ہے"۔ اور پھر کہا ہے۔ "اگر یورپ میں ہم نوآبادیات کے مسئلہ کو چھیڑیں تو ہمارا خیال فی الفور روس کی طرف اور اُن سلطنتوں کی طرف جو روس کے زیرِ نگیں ہیں مبذول ہو گا۔ قسمت خود اس طرف ہماری رہنمائی کرتی نظر آتی ہے"۔ اس بارے میں ہٹلر نے اپنی جدید تقاریر میں اپنی خواہشات کا اظہار کیا ہے۔

پیشتر ازیں ہٹلر نے پولینڈ اور جاپان کے ساتھ ان اغراض کو پیشِ نظر رکھ کر معاہدے کئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں جرمنی اور جاپان کے درمیان سوویٹ یونین کے خلاف ایک معاہدہ طے پایا ہے۔ اور پھر اطالوی امداد کے حاصل کرنے کی سعی بلیغ ہو رہی ہے۔ ہٹلر کا خیال یہ بھی ہے کہ اگر ممکن ہو تو برطانوی طاقت کو بھی اپنی طرف کھینچ کر فرانس کو علیحدہ کرے۔ اور اس ملک کے ساتھ ایک آخری فیصلے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کرے۔ انجام کار اس کا مطمحِ نظر تمام دنیا کی فتح حاصل کرنے سے کم نہیں ہے

وہ لکھتا ہے "وہ سلطنت جو اِس زہریلی نسلی آمیزش کے زمانے میں نسلی پاکیزگی کی علمبردار ہے ضرور ہے کہ ایک دن تمام روئے زمین پر قابض ہو جائے۔ خیر وہ ایسے خیالات کے اظہار میں ایک وہمی دنیا میں ہے۔ بہر نوع اس کے مقاصد و اغراض عیاں ہیں۔ اُس نے آسٹریا سے چھیڑ چھاڑ صرف اس لئے نہیں کی کہ وہ اٹلی سے اچھے تعلقات قائم رکھ سکے۔ غرضیکہ اُس کو جب بھی موقع ہاتھ آیا اُس کا مقصد روس پر دھاوا بولنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُس کو زیکوسلوویکیا کی ریاست میں مداخلت کی ضرورت پیش آئے گی۔ فرانسس ولیمز کا خیال ہے "زیکوسلوویکیا میں نازی مداخلت یقیناً بغیر تاخیر یورپ میں جنگ کا باعث ہو گی"۔

پس معلوم ہوا کہ تمام فسطائی حکومتیں نوآبادیات کی مقتضی ہیں، ایک عالمگیر جنگ بھی ظہور پذیر کیوں نہ ہو۔ جدید آلاتِ حرب مثلاً گیس، بم اور ہوائی جہاز کے استعمال سے عالمگیر جنگ اُن نتائج کی حامل ہو گی جو ہسپانیہ میں ایک چھوٹے پیمانے پر رُونما ہو رہے ہیں۔ ایک ہوائی جہاز نئے اصول پر حال ہی میں ایجاد ہوا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آٹھ ہزار میل تک بے تکلف پرواز کر سکے گا۔ اور بموں کے بھاری بوجھ کو دو ہزار میل تک لے جا کر اپنی جائے پرواز تک واپس بھی آ سکے گا۔

لنڈن کے اخبار آبزرور مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۳۶ء نے مندرجہ بالا خبر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے "پس اس ہوائی جہاز کا عمل لینن گریڈ، ماسکو، ایتھنز، روم اور میڈرڈ تمام پر حاوی ہو گا"

فسطائی حکومتیں مندرجہ ذیل وجوہات پر نوآبادیات کا تقاضا کرتی ہیں:۔

(ا) دنیا میں وقار حاصل کرنے کی خاطر۔

(ب) دورانِ جنگ میں جنگی نقطۂ نگاہ سے اہم مقامات کو حاصل کرنے کے لئے۔

(ج) اقتصادی ضروریات۔ مثلاً

(۱) آبادی کی کثرت کو کم کرنے کے لئے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ ممالک اپنی آبادی کو ہر ممکن ذریعے سے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۲) خام اشیاء مستقل طور پر مہیا کرنے کے لئے۔

(۳) اپنی مصنوعہ اشیاء کی تجارتی منڈیوں کو محفوظ کرنے کے لئے۔ اس آخری وجہِ مطالبہ کو زیادہ اہمیت اس لئے مل گئی ہے۔ کہ شہنشاہی حکومتیں مثلاً برطانیہ۔ فرانس وغیرہ اپنی نوآبادیات اور مقبوضات کے درمیان امپیریل پریفرنس

کی پالیسی برت رہی ہیں۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقبوضات اور نوآبادیات میں بسنے والے لوگوں کے کوئی حقوق نہیں؟ کیا اُن کو صرف مالِ منقولہ ہی فرض کیا جائے؟ یہاں ہم نوآبادیات کے وسیع مسئلہ سے دو چار ہوتے ہیں۔

مقبوضات اور نوآبادیات

جنرل فرنز رٹر جرمن مقبوضات کی واپسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ورسیلز کے معاہدے نے جرمنی کے تمام مقبوضات چھین لئے۔ اور جو خام اشیاء جرمنی کے لئے اہم اور ضروری تھیں۔ جرمن سکے کے ذریعے اُن کی خرید کے امکانات بھی اُس سے ضبط کر لئے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے مقبوضات اس کے اپنے رقبے سے صرف ۵ ½ گنا زیادہ تھے۔ مگر پھر بھی دیگر چھوٹی حکومتوں سے جرمنی پیچھے تھا اور اُس وقت برطانوی مقبوضات اس کے اپنے رقبے سے ۱۰۵ گنا زیادہ تھے۔ بلجیم کے مقبوضات اس سے ۸۰ گنا زیادہ تھے۔ ہالینڈ کے ساٹھ گنا اور فرانس کے بائیس گنا زیادہ تھے۔"

جمعیتِ اقوام کے معاہدے کی دفعہ بائیس کا مفاد یہ ہے:۔ کہ وہ نوآبادیات اور علاقے جو جنگِ عظیم کے نتائج کی وجہ سے بعض اُن سلطنتوں کے قبضے سے نکل گئے ہیں جو اُن پر جنگ سے پہلے حکومت کرتی تھیں اور جن میں وہ قومیں آباد ہیں جو زمانۂ جدید کے مشکل حالات میں اپنے پاؤں پر خود نہیں کھڑی ہو سکتیں۔ اُن کے واسطے یہ اصول ہونا چاہیئے کہ ان کی فلاح و بہبود تہذیبِ جدید کے ہاتھ میں ایک مقدس امانت تصوّر کی جائے۔ اور اِس امانت کی حفاظت کے لئے کچھ کفالتیں جمعیت کے اس معاہدے میں شامل ہونی چاہئیں:۔

اسی دفعہ ۲۲ پر تنقید کرتے ہوئے فرانسس ولیمز لکھتا ہے: "کہ لیگ کا یہ معاہدہ صرف وہ قومیں وجود میں لائی ہیں جو جنگِ عظیم میں فتح مند ہوئی تھیں۔ اُن کو خود اپنی نوآبادیوں کی رعایا کی بہبود کا خیال نہ آیا کہ یہ بھی تہذیب کی ایک مقدس امانت ہو سکتی ہے۔ بلکہ صرف اُن نوآبادیوں کی بہتری کا خیال آیا جو پہلے شکست خوردہ قوموں کے قبضے میں تھیں۔ ان کے اپنے ہی بیانات کی بنا پر ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انہوں نے یہ جنگ صرف تہذیبِ جدیدہ کے تحفظ کی خاطر کی تھی۔ اس لئے تہذیبِ جدید کا ان پر اس سے زیادہ اور کوئی حق نہیں۔

ظاہر ہے کہ فاتحینِ جنگ نے نوآبادیات کے انتظام میں ملکیت کی بجائے تولیت کا تخیل داخل کر کے نہایت عمدہ اصول وضع کیا تھا لیکن وہ اِس اصُول کا خود اپنی تمام نوآبادیات پر اطلاق کر کے اسے عالمگیر نہ بنا سکے۔ اگر وہ اس اصول کو خود اپنی نوآبادیات پر بھی حاوی کر دیتے تو آجکل مقبوضات کی موجودہ تقسیم کی ترمیم کے مطالبات زور نہ پکڑتے اور نہ وہ باہمی حسد و رقابت ظہور میں آتا جس نے بین الاقوامی امن و امان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ بلکہ اس سے خود اُن نوآبادیوں کی رعایا بھی ان کی ممنون احسان ہوتی۔ اس عرصے میں محکوم اقوام بھی خودمختارانہ حیثیت حاصل کر لیتیں اور جمعیتِ اقوام کے توسط سے بین الاقوامی امن کے قیام کے لئے اپنا پورا زور لگاتیں۔ اب بھی کیا دیر ہوئی ہے۔ اگر تولیت کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو قابض اور غیر قابض اقوام سب کے لئے مفید ہوگا۔ ہندوستان جیسے ملکوں کو جو اپنا انتظام آپ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کو اپنا انتظام آپ کرنے کی اجازت کم عرصے میں دے دینی چاہیئے۔ اور جو ممالک سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے ابھی بہت پس افتادہ ہیں جمعیتِ اقوام کی تولیت میں ان کو ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ خود جمعیت کو بھی زیادہ طاقتور بنایا جائے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اقوام کے نمائندے شامل ہوں۔ تاکہ مذکورہ بالا تین فسطائی اقوام جن کا اصول جبر و ظلم ہے اُن کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا جا سکے۔

لیکن وقار کے قیام اور فوجی ضروریات کے علاوہ یہ بھی پوچھنا چاہیئے کہ ان قابض طاقتوں کی اقتصادی ہستی کے ساتھ یہ موافق اور ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نوآبادیات کے سیاسی حقوق کو چھوڑ دیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ انگلستان اپنے مقبوضات کے بغیر اپنی اقتصادی زندگی قائم رکھ سکے۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرمایہ داری کا نظام صرف کمزور فرقوں اور طاقتوں کی ناجائز بربادی پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اگر نوآبادیاں صنعتی نظام کے واسطے خام پیداوار نہ مہیا کریں اور اپنے حاکم ملکوں کی صنعتی پیداوار کی مسلسل آمد کو جذب نہ کریں تو یہ چیز ان ملکوں کی بدترین اقتصادی تباہی کا باعث ہوگی۔ اس لئے ہم اِن تین آویزشوں میں سے آخری آویزش کے بیان کی طرف آتے ہیں۔ جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم سے پیدا ہوئی ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت

تہذیب کو ان دو نو اصولوں میں سے جن پر اقتصادی نظام کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا اور یہ منتخب اصول اس سوال کے تمام حل کی کلید ہمارے ہاتھ میں دے دے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ سرمایہ داری کیا ہے اور اشتراکیت کیا چیز ہے۔ ایڈورڈ کونزے کی رائے میں "سرمایہ دار سوسائٹی وہی ہے جس کی تمام تر توجہ اشیاء کی صنعتی پیدائش کی طرف مبذول ہو۔ اس جماعت کے دو

حصے ہیں لہٰذا وہ جماعت جو پیداوار کے تمام ذرائع (یعنی زمین، کارخانے اور قدرتی ذرائع) کی مالک اور ذمہ دار ہے اور ثانیاً وہ لوگ جن کی ذرائع پیداوار تک رسائی اور قربت اس شرط پر ہے کہ وہ اپنی محنت اور کاوش کو منڈی میں چند روپوں کے عوض فروخت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

مسٹر جی۔ ڈی۔ ایچ کول کے نزدیک "اشتراکیت کے یہ معنی نہیں کہ صنعت و حرفت کو کسی خاص لائحہ عمل اور طریق کار کے مطابق چلایا جائے۔ بلکہ اشتراکیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام صنعت و حرفت کو عوام کے دائرۂ نظم و نسق کے تحت میں لایا جائے اور مفادِ عامہ کے واسطے اقتصادی نظام کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن تجویز سوچی جائے۔"

دنیا میں صرف روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں سوشلزم یا اشتراکیت کو قومی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ دُنیا کے دوسرے ممالک سرمایہ داری تنظیم کے مختلف مدارج میں ہیں۔ لیکن اشتراکی جماعتوں کے وجود سے یہ ممالک بھی خالی نہیں۔ ان منظم جماعتوں کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو اشتراکی خیالات رکھتے ہیں۔ فسطائی حکومتوں نے البتہ اپنے ملک کو اشتراکی عنصر سے بالکل پاک کر دیا ہے۔ خواہ وہ کسی حیثیت سے موجود ہو (انفرادی یا جماعتی)، اور یہ حقیقت ہے کہ فسطائیت اشتراکیت کی بڑی ہی دشمن ہے۔

اشتراکیت کے نئے اصول جرمنی کے مفکرِ اعظم کارل مارکس کے مرہونِ منت ہیں، جس نے اینجلز کے ساتھ مل کر ۱۸۴۸ء میں مشہورِ عالم کمیونسٹ مینی فسٹو (لائحہ عمل) شائع کیا۔ اور جس نے اشتراکیت کو ایک نہائت مناسب نظریے اور جدید لائحۂ عمل کے رنگ میں رنگ دیا۔ اشتراکیت کی بھی مختلف جماعتیں ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جن کے نظریئے (قول و فعل) حکومت کے قوانین کے عین مطابق ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو انقلاب پسند ہیں۔ انہی انقلاب پسندوں اور دہشت انگیزوں نے ۱۹۱۷ء میں روس میں نہائت کامیابی و کامرانی سے ایک انقلابِ عظیم برپا کیا اور موجودہ سوویٹ یونین کی بنا ڈالی۔

اگرچہ اشتراکی اپنے طریق کار میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری (جس میں ذرائع پیداوار پر انفرادی قبضہ ہوتا ہے۔) کی جگہ ایک دوسرا نظام اشتراکیت رائج کرنا (جس میں ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ ہوتا ہے۔)

وہ ذرائع پیداوار کے انفرادی قبضہ پر اس لئے اعتراض کرتے ہیں کہ اُن حالات کی وجہ سے جو صنعتی انقلاب نے پیدا کر دیئے ہیں معاشرتی نظام چند افراد کے قبضہ میں آجاتا ہے اور قوم کے بقیہ افراد نظامِ اجرت کی غلامی (یعنی مزدوری پیشگی) میں جکڑے جاتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ سرمایہ دار اقتصادی افادیت پر قبضہ کر لیتے ہیں اور مزدور طبقے کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کو قومی سرمایہ کے حقیقی حصے سے محروم کر دیتے ہیں۔

اشتراکیوں کا عقیدہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری میں ایک اصولی اختلاف ہے۔ کوزنے کہتا ہے "سوسائٹی کی پیدائشی قوتیں ہمیشہ عوام کی طاقت خرید سے ہر وقت بڑھنے کی مقتضی ہوتی ہیں۔ صنعتی ایجادیں اور مکمل تقسیم عمل سماجی قوتِ پیدائش کو اور امدادِ باہمی و تنظیم انفرادی و اجتماعی کارخانوں کو ترقی دیتی ہے۔ نظامِ منافع کی طلب سے جس کا کام اجرت کم کرنا اور اس طرح اجتماعی پیدائش کے بازار کو محدود کرنا ہوتا ہے۔ قوتِ خرید آہستہ آہستہ کم ہو جاتی ہے۔ اس اختلاف کا وجود ہی آئے دن کی اقتصادی مشکلات اور کساد بازاری کو واضح کر سکتا ہے جس میں اشیاء کی فاضل پیداوار بہ مقابلہ قوتِ خرید کے ایک کورچشم کو بھی نظر آ سکتی ہے۔ اس زائد پیداوار کے مسلسل بوجھ سے بچنے اور کساد بازاری کے دفعیے یا کم از کم التوا کی کوشش سرمایہ دار اقوام اپنی منڈیوں کو وسعت دینے کے لئے غیر سرمایہ دار علاقہ جات پر قابض ہونے کے لئے کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال کو اقتصادی شہنشاہیت کہا جاتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سرمایہ دار اقوام کے حاکموں نے دنیا کی تمام آبادی پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔

شہنشاہیت اور جنگ میں جو تعلق ہے وہ اب ظاہر ہے۔ جب تمام دنیا سرمایہ دار اقوام میں تقسیم ہو چکی ہو تو یہ قدرتی امر ہے کہ اُن میں سے بعض اقوام اس تقسیم پر نظرِ ثانی کی خواہاں ہوں۔ اس لئے شہنشاہیت کے ماتحت جنگ کا خطرہ ایک دائمی امر ہے۔ تمام حکومتوں کی ہتھیار بندی کا واحد سبب یہی ہے کہ وہ سب اس خطرہ سے واقف ہیں۔ چنانچہ نظریۂ اشتراکیت یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تینوں آویزشیں ایک دوسری سے انتہائی قربت رکھتی ہیں اور نظریۂ اشتراکیت کے مطابق ان آویزشوں کا واحد سبب نظامِ سرمایہ داری ہے۔

اشتراکیوں کا یہ ایمان ہے کہ جب تک دنیا میں سرمایہ داری کا وجود باقی ہے جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

اپنے مندرجہ بالا تجزیہ کے ثبوت میں اشتراکی سرمایہ دار ممالک اور روس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام سرمایہ دار ممالک ایک ایسے دورِ انحطاط میں سے گزر رہے ہیں جس کی مثال دینے سے تاریخ قاصر ہے۔ اس انحطاط نے نظامِ صنعت کو مردہ کر کے بے روزگاری بڑھا دی ہے۔ حالانکہ دوسری طرف روس کے

نظام صنعت میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے اتنی ترقی کی کہ اب وہاں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جو بے روزگار ہو۔ ادھر سیاست کے میدان میں بھی سرمایہ دار ممالک اور خصوصاً وہ ملک جو فسطائیت کے زیر اثر ہیں۔ ہر وقت جنگ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ روس میں محض امن و امان کا تذکرہ ہے۔

سرمایہ داری کے ماضی کے پیش نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکیت کے دلائل زیادہ زوردار ہیں لیکن سرمایہ داری کے نظام میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اشخاص اپنے کاروبار میں محض اس وجہ سے دلچسپی لیتے ہیں کہ وہ ان کا ذاتی کاروبار ہے۔ اس طرح صنعت اور نسلِ انسانی کی کاروباری اہلیت بہت ترقی پا گئی ہے۔ یہ دلچسپی و ترقی نظام اشتراکیت کے ماتحت اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک فطرتِ انسانی میں انقلاب نہ آجائے۔ ایک ماہر اقتصادیات کا قول ہے کہ "مال کا ذاتی ہونا مٹی کو بھی سونا بنا دیتا ہے"۔ روس کے تجربہ کی کامیابی بطور ایک برہانِ قاطع استعمال نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ نظامِ اشتراکیت کو دیگر ممالک میں بھی ہر زمانہ میں وہی کامیابی حاصل ہو جو اب روس میں ہوئی ہے۔ روس میں اس تجربہ کی کامیابی کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ وہاں ایک نہائت ہوشیار اور اولوالعزم قائد اور اُس کے ماتحت عوام کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس میں اشتراکیت کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کی جدید نوعیت کے باعث انتہائی جوشِ عمل موجود ہے۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ہنگامی جوش اور موجودہ ہوشیار و اولوالعزم قائد کے فقدان پر بھی یہ نظام کامیاب ہوسکے گا یا نہیں؟

ادھر سرمایہ داری کا نظام محض اشتراکیت کا مُنہ چڑانے یا اس کی خیال آرائی و طرزِ عمل کا تمسخر کرنے سے قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر سرمایہ دار اپنی حیات کا متمنی ہے تو اُسے موجودہ ضروریاتِ زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے تبدیل ہونا پڑے گا۔ اُسے ان تینوں آویزشوں کا حل معلوم کرنا ہوگا جو موجودہ زمانہ کے در پیش ہیں۔ اُسے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ نظامِ سرمایہ داری کمزور جماعتوں اور قوموں کے مفاد کو روندے بغیر قائم رہ سکتا ہے۔ اسے اشتراکیت کے اصولِ اقتصادیات سے سبق حاصل کرکے اور صنعت کی موجودہ بدنظمی دور کرکے اپنے اور مزدور کے حقوق کا ایک ایسا نیا تناسب قائم کرنا ہوگا جس میں کسی حد تک انفرادی و ذاتی ملکیت بھی قائم رہے۔ شہنشاہیت کو قدیم اصولِ ملکیت کے بدلے نیا اصولِ تولیت اختیار کرنا پڑے گا جو ایک جمہوری مجلسِ اقوام کے تحت بروئے کار آسکے۔ قبل اس کے کہ ایک بین الاقوامی نظام تمام اقوامِ عالم کے حفظ و امن کے لئے ایسے حالات پیدا کردے جو فسطائی خطرے کا واحد دفاع ہوسکیں تمام طاقتوں کو اپنے موجودہ تخیلِ خودمختاری میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ اگر سرمایہ دار اس اقدام کے لئے تیار نہیں تو تاریخ ہرگز اس کا انتظار نہ کرے گی۔ یا تو وہ سرمایہ داری کو نیست و نابود کردے گی یا اگر نوعِ انسانی نہیں تو کم ازکم تہذیب ضرور برباد ہو جائے گی۔ تہذیب اس وقت ایک ایسے مقام پر ہے جہاں سے حیات و ممات کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کدھر کا رُخ کرتی ہے۔

ایس۔ ایم۔ اختر اسلامیہ کالج لاہور

رباعی

ہستی کا عجب راز اگر کھل جاتا
جنت کو بھی منتہی نہ بنایا ہوتا
بیکار ہے یا یاس ہیں ورنہ آرکتا
سر شعر سے ضرور مٹ لگایا ہوتا

اعجاز



تجلّیات

یہی انداز اگر ہے اُس نگاہِ برق آئیں کا
خدا حافظ ہے پھر میری متاعِ صبر و تسکیں کا

بہار اک آئینہ ہے اُن تبسم ہائے شیریں کا
گلستاں ایک پرتو ہے کسی کے حسنِ رنگیں کا

جھلکتا ہے پسینہ اُس جبینِ نور افشاں پر
درخشاں آسمانِ حُسن پر ہے خوشہ پرویں کا

سرورِ عشق سے لبریز ہیں دل ہائے مشتاقاں
بھلا کیا پوچھنا ہے اُس نگاہِ کیف آگیں کا

میں لذت آشنائے اضطرابِ عشق ممنوں ہوں
تغافل ہائے رنگیں کا نوازش ہائے شیریں کا

تڑپ جائیں گے میرے سوزِ دل سے آہ جب نکلی
ہے میرے ضبط سے وابستہ انداز اُن کی تمکیں کا

نگاہِ ناز نے سو سو ادا سے کی فسوں سازی
نہ نکلا پر نہ نکلا کوئی پہلو میری تسکیں کا

جہانِ عشق میں بے تابیوں کا شور برپا ہے
جنوں انگیز عالم ہے تمہارے حُسنِ تزئیں کا

نظر افروز ہے از بس بہارِ بمبئی اکبرؔ
خدا حافظ رہے اِس خطۂ فردوس آئیں کا

جلال الدین اکبرؔ

خواب یا حقیقت

خبر نہیں تمھارے گھروں میں کیا دستور ہے لیکن میری بیوی تو فروری ہی میں کہنا شروع کر دیتی ہے "تم نے کچھ فیصلہ بھی کیا کہ اس دفعہ ہمیں جولائی اگست کے دن کہاں گزارنے ہیں" اور جب میں اس کے جواب میں "نہیں" کہہ دیتا ہوں تو وہ اُن اشتہاروں کو جو "مکان کرایہ کے لئے خالی" کے زیرِ عنوان اخباروں میں چھپتے ہیں پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔

ہاں تو! پچھلے سال بھی حسبِ معمول یہی ہوا اور آخر ایک مکان انتخاب کرتے ہوئے اُس نے اخبار میری طرف بڑھایا۔ اشتہار کی تفصیلات یہ تھیں۔ نازوک ——— ہکلنگ، وسیع ——— آراستہ کوٹھی ——— باغ ——— موٹر خانہ گھاٹ اور جملہ ضروریات ——— ہاں! ——— اور اصطبل بھی "مکان کا کرایہ بہت زیادہ لکھا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا "لیکن کرایہ بہت زیادہ ہے:" کہنے لگی "ہاں اس کے لئے تمھیں مالکِ مکان سے ملاقات کرنی ہوگی۔ اور اُسے کسی نہ کسی طریقے سے کرایہ کم کرنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ یہ لوگ اکثر مان جایا کرتے ہیں:" درحقیقت وہ کبھی نہیں مانا کرتے۔ خیر! اس وقت اس طویل جھگڑے میں پڑنا فضول ہے۔ غرضکہ میں نے مالکِ مکان کو خط لکھ دیا اور اس سے پوچھ بھیجا کہ آیا وہ میرے واسطے ایک رات کے قیام کا وہاں کوئی انتظام کرسکتا ہے یا نہیں۔ میں دراصل اس جگہ کا صحیح اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا اور لکھا کہ وہ فلاں شخص کو میری خدمت کے لئے مقرر کر رہا ہے۔

مبالغہ نہ سمجھئے کچھ ہماری عادت ہی ایسی ہے کہ ہم ہر کام میں پختگی چاہتے ہیں ——— جب میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میری بیوی میرے آرام کے لئے بیسیوں جتن کرتی ہے۔ مجھے ہر بستر پہ باری باری لیٹنا ہوتا ہے اور اس امتحان کے بعد جو بستر ان میں سے زیادہ آرام دہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ میرے لئے وقف کر دیتی ہے۔

میں طوفانِ برف باری سے بصد مشکل جان بچاتا ہوا کرۂ ارض کے اس ویران ترین حصے پر آ پہنچا۔

پاٹر ہیم پر ریل کا سفر ختم ہو جاتا تھا۔ اور پھر باقی راستہ جو پانچ میل سے کسی صورت بھی کم نہ ہوگا موٹر لاری پر طے کرنا پڑتا تھا۔ خوش قسمتی سے بوڑھی خادمہ مسز سیلٹن جو میری خدمت کے لئے متعین کی گئی تھی۔ مکان پر موجود تھی۔ اس نے پہلے ہی سے آگ سلگا رکھی تھی اور میرے لئے گوشت کے تکے تیار کر رہی تھی۔ جب تک میں کھاتا رہا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے مجھے اپنے شوہر کے اوپریشن کا جو اس نے حال ہی میں کرایا تھا تمام حال شروع سے لے کر اخیر تک سنا ڈالا۔ اوپریشن کا ذکر کیا تھا عملِ جراحی پر ایک مفصل تقریر تھی۔ اس دوران میں جو ٹکڑا میں کھا رہا تھا خدا کچا رہ گیا تھا اور اپنے عمل سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کی تقریر کے ساتھ ساتھ اس کے بیان کی توضیح کر رہا ہوں۔ آخر کار اس نے خوان میرے سامنے سے اٹھا لیا اور رات بھر کے لئے غائب ہوگئی۔

میں نے مکان اندر سے اچھی طرح دیکھ لیا اور اس کی بیرونی صورت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی۔ تاریکی حد سے زیادہ تھی۔ برف باری کا سلسلہ اگرچہ ابھی تک جاری تھا لیکن پہلے کی بہ نسبت اس کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ موٹر خانہ کوٹھی کے عقبی دروازے سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ میں چکر لگاتا ہوا اس طرف گیا بھی لیکن اس میں داخل نہیں ہوا۔ میں گھاٹ کی تصدیق کے لئے نیچے بھی اتر گیا۔ یہ مقام ان تمام لوازمات سمیت گرمیوں کے لئے ہر حیثیت سے بہت موزوں معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ لوگ قطبِ شمالی کے سفر کا عزم آخر کرتے کیوں ہیں یہیں کیوں نہیں آ جاتے۔

چنانچہ میں کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا آگ کے قریب جا بیٹھا یہ کیسے بتاؤں کہ اسوقت سکوت کی حالت کیا تھی۔ شاید آبی جانوروں نے بھی آج کی رات کہیں اور بسیرا کر لیا تھا۔ کم از کم وہ حرکت نہیں کر رہے تھے۔

گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی ہوں گے کہ مسز۔ اس کا ——— نام ——— کیا ——— تھا ——— سیلٹن ——— کے جانے کے بعد مجھے پہلی آواز سنائی دی یہ کسی موٹر کی آواز تھی۔ اگر یہ سیدھی نکل جاتی تو میں اسے دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ لیکن بات [illegible] وہ سیدھی نہیں گئی بلکہ وہ یہاں تک بھی نہیں پہنچی معلوم ہوتا تھا کہ کہیں دور سڑک [illegible] گئی ہے۔ اس بات کا بھی میں نے کچھ زیادہ خیال

نہ کیا۔ آخر کار موٹریں کھڑی ہوا ہی کرتی ہیں۔

پانچ یا دس منٹ گزرنے کے بعد میں نے سوچا کہ وہ ابھی تک آگے کیوں نہیں بڑھی میں اٹھا اور کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگا۔ برف باری تھم گئی تھی۔ پھاٹک میں سے کسی روشنی کی شعاع پڑ رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ نظروں سے اوجھل کہیں بڑے بڑے لیمپ روشن ہیں۔ میں نے سوچا کہ ذرا باہر نکل کر چہل قدمی کروں اور اس معاملہ کا پتہ بھی لگاؤں۔

میں نے دیکھا کہ میرے پھاٹک سے تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر سڑک کے درمیان ایک بڑی سی موٹر کھڑی ہے۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو مجھے ایک لڑکی موٹر کے انجن سے چھیڑ چھاڑ کرتی نظر آئی۔ اس کی ظاہری شکل و شباہت سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حسین لڑکی ہے لیکن وہ کچھ اس طرح سمور میں لپٹی ہوئی تھی کہ اس کی شکل کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے کہا "معلوم نہیں کیا بات ہے۔ انجن چلتا چلتا خود بخود رک گیا ہے۔ اور اب حرکت ہی نہیں کرتا۔" انجن حقیقت میں رک گیا تھا اور اب ہینڈل یا سلف دونوں میں سے کسی ایک طریقہ پر بھی حرکت نہ ہوتا تھا مشین کا پرزہ پرزہ جل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ریڈی ایٹر میں کچھ پانی بھی ہے یا خالی ہی پڑا ہے؟ کہنے لگی "اگر پہلے ہمیشہ ہوا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس وقت نہ ہو۔" میں نے کہا "آؤ تھوڑا سا ڈال کر دیکھیں تو سہی ہوتا کیا ہے۔" اس نے کہا "پانی کی بجائے برف کیوں نہ استعمال کر لیں۔" لیکن میری یہ مرضی نہیں تھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس موقع پر برف استعمال کرنا عقلمندی کے سراسر خلاف ہے۔ اور یہ راز مجھ پر اس وقت ظاہر ہوا جبکہ میں برف کا ایک ڈھول بھر کر واپس آ رہا تھا یعنی موٹر کی شہ رگ ہی بند ہو جائے گی۔

جب میں اس کی طرف واپس گیا وہ ریڈی ایٹر کا ڈھکنا اتار چکی تھی۔ اور اس میں ابھی ہم نے تھوڑا سا پانی ہی ڈالا تھا ——— حسن اتفاق سے میں نے لڑکی کو پرے ہٹا دیا تھا پہلا چمچہ بھر پانی جو داخل ہو چکا تھا ابلتا ہوا سیدھا باہر نکل آیا۔ ہم تھوڑی دیر کھڑے رہے اور جب تمام انجن ٹھنڈا ہو چکا تو ہم نے ایک دفعہ پھر پانی ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر ٹھہرتا ہی نہیں تھا جس رفتار سے ہم پانی ڈالتے تھے اسی رفتار سے نیچے سڑک پر بہہ جاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موٹر کو خالی ریڈی ایٹر سے اڑائے پھرتی رہی ہے پھر مشین کا رک جانا لازمی امر تھا

جب میں نے اس سے یہ کہا تو کہنے لگی:۔

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب مجھے تمام رات یہیں کاٹنی پڑے گی؟"

میں نے کہا "اگر تم میرے غریب خانے پر (یہ سچ مچ غریب خانہ ہی تھا کیونکہ اس کی چھتیں نمی کو روکنے سے عاجز تھیں) ٹھہرنا قبول کرو تو جس مصیبت کا نقشہ اس وقت تمہاری آنکھوں میں کھنچ رہا ہے۔ اس سے کسی قدر نجات تو تمہیں ضرور مل جائے گی۔ مگر وہ میری بات پر کچھ توجہ ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرے گھر کے حال سے واقف تھی نہیں اسے اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ پھر خدا جانے کیوں وہ موٹر کو جہاں کھڑی تھی وہیں چھوڑ کر پیدل چل پڑنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "پیدل جانے کا خیال ہی نہ کرو۔ یہ جگہ تمام آبادیوں سے میلوں دور ہے۔"

اسی وقت ہم نے سڑک پر ایک موٹر کی آواز سنی۔ اگرچہ وہ ابھی ہم سے بہت دور تھی پھر بھی ہم اس کی روشنی کو دیکھ سکتے تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ نارفک بالکل میدانی علاقہ ہے اور نظر دور تک کام کر سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ "تو تمہاری مشکلیں ابھی حل ہو جائیں گی۔ یہ چیز جو کچھ بھی ہے تمہاری موٹر کو نزدیک ترین کارخانے تک یا کم از کم تمہیں کسی قریب کے ہوٹل میں چھوڑ آئے گی۔"

مجھے امید تھی کہ اس خیال سے اسے یقیناً تھوڑی بہت تسکین ہوگی لیکن وہ بالکل ساکت رہی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا منشا کیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ رات میرے ہاں بسر کرے۔ اور نہ وہ کسی اور جگہ جانے کے لئے کسی کی ممنون ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس معاملے میں نہایت محتاط معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میرے بازو کو پکڑتے ہوئے کہا "تمہارا کیا خیال ہے یہ کیا چیز آ رہی ہے؟"

میں نے کہا "چونکہ میں نووارد ہوں۔ اس لئے یہاں کی چیزوں کے متعلق میرا قیافہ کہاں تک درست ہو سکتا ہے لیکن اس کی آواز دودھ والی لاریوں سے بہت ملتی ہے۔"

لاری کے پہنچنے سے پیشتر میں نے چھ پنس نکالے اور کرایہ کے لئے اسے پیش کر دیئے۔ اسے کرایہ ادا کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ یہ لاری دودھ کے برتنوں سے لدی پڑی تھی۔ لاری ڈرائیور کو مجبوراً اترنا پڑا کیونکہ لاری کے اندر جگہ نہیں تھی اور اسے برتن ہٹا کر ایک نشست بنانی تھی۔ وہ گاڑی میں سے نیچے اتر آیا۔ اور ہم سے پوچھنے لگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہم نے معاملہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ وہ نارفک کو جا رہا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو وہ موٹر کو کھینچ کر وہاں تک لے جانے کیلئے تیار ہے لیکن موٹر کی مالکہ اس تدبیر پر عمل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ

موٹر رات بھر کے لئے میرے موٹر خانے میں دھکیل دی جائے۔ جہاں سے وہ دوسرے دن واپس منگوالے گی۔ فی الحال وہ لاری میں بیٹھ کر نارروک تک ہی چلی جائے گی۔

چنانچہ میں نے موٹر خانے کی چابی منگوائی اور لاری ڈرائیور نے دغالبًا اس کا نام ولیم تھا) اور میں نے دونوں نے مل کر موٹر کو اندر دھکیل کر دروازے کو قفل لگادیا اس سے فارغ ہوکر میں نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ آج رات سردی غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے بہتر ہوتا کہ تم ذرا گرم ہوجاتے۔ ولیم نے میری رائے کی تائید کی۔ میں ان دونوں کو اندر لے گیا۔ اور شراب میں پانی ملاکر تین گلاس تیار کئے کیونکہ میرے پاس سوڈا نہیں تھا۔ قدرتی بات تھی کہ اس ساری تگ ودو نے میرا جسم بھی بے حس کر دیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اوورکوٹ بھی نہیں تھا۔

ابھی تک مجھے اس جوان عورت کے متعلق اچھی طرح غور کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہاں اندھیرا تھا اور دوسرے بگڑی ہوئی موٹر کی طرف توجہ دینا اس وقت زیادہ ضروری تھا لیکن یہ بیان میرے خیال کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مکانکی دماغ کے لئے موٹر کا اس حالت میں پانا باقی چیزوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے ——— زیادہ ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن اب اس بات پر بحث کیوں کی جائے۔ اس بیٹھک میں جہاں لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے متعلق کوئی قرین قیاس رائے ہی نہیں بلکہ اس کی اصلی حقیقت کا پتہ لگالینا بھی نہایت آسان تھا۔ اس کی عمر میرے اندازے سے زیادہ تھی اور اس کی آنکھیں ایک دوسری کے بہت زیادہ قریب تھیں۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ——— کہ اس کی حرکات میں سکون اور اطمینان نہیں تھا۔ اور وہ انگریزی بولنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی لیکن حقیقت بات یہ بھی نہیں تھی۔ اس کا سلوک ہمارے ساتھ غیر دوستانہ تھا ——— خیر ہم نے کیا بھی کیا تھا کہ ہم اس سے دوستانہ سلوک کی امید رکھتے۔ اس کی طبیعت سے ایک بے سروپا خوف اور اندیشہ ٹپک رہا تھا جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بھاری مصیبت کا سامنا کر رہی ہے اور وہ سائے میں بیٹھنے کو اس قدر ضروری سمجھتی تھی کہ اگر میں نے لیمپ کو پرے نہ ہٹالیا ہوتا تو وہ آگ کے قریب بھی نہ بیٹھتی اور جس طریقے سے اس نے جلدی اور گھبراہٹ ڈال کر بیچارے ولیم کا گلاس ختم کرایا کافی تکلیف دہ تھا جب وہ گاڑی سٹارٹ کرنے باہر نکل گیا تو میں نے لڑکی سے دریافت کیا کہ اسے اور پیسوں کی ضرورت تو نہیں۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ اسے ضرورت نہیں۔ پھر وہ رخصت ہوگئے اور میں دروازوں کو بند کر کے اندر چلا آیا۔

میں نے دیکھا کہ میرے سونے والے کمرے میں لوکل گائیڈ کی ایک جلد جس میں چند نقشے بھی تھے پڑی تھی۔ میں نے ان کو دیکھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ عورت موٹر میں بیٹھ کر آئی کہاں سے ہے۔ یہ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سڑک نہایت غیر اہم معلوم ہوتی تھی یعنی یہ سڑک۔ صرف وہی شخص اختیار کرسکتا تھا جو لوگوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہو۔ مثلاً ایسا آدمی جو چوری کی ہوئی موٹر بھگا رہا ہو اور یہ تصور خاصا سنسنی خیز تھا۔ میں نے سوچا کہ موٹر کو ایک مرتبہ اور دیکھ لینا بہتر ہوگا۔ چنانچہ میں نے دوسری دفعہ جاکر باورچی خانہ کی الماری میں سے چابی لی اور باہر برفانی فضا میں نکل آیا۔ رات سیاہی کی طرح تاریک تھی اور فضا اتنی ساکن کہ میری بتی کا شعلہ بھی بمشکل جھلملاتا تھا۔ یہ موٹر خانہ بہت بڑا نہیں تھا اور موٹر نے تقریبًا ساری جگہ روک لی تھی ——— ہاں اور ہم نے موٹر کو اس طریقے سے اندر دھکیلا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ بآسانی باہر نکل آئے۔

انجن تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ اس لئے میں دیوار کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا موٹر کے پچھلے حصہ کی طرف جا پہنچا۔ میں نے صرف قفل کو ابھی موڑا ہی تھا کہ کسی چیز نے دروازے کو اندر سے دھکیل کر کھول دیا۔ اور ——— نہ جانے کیا چیز ——— باہر نکل کر مجھ پر آگری۔ یہ مجھے زور سے پیچھے دیوار میں میخ کی طرح گاڑے ہوئے تھی اس نے میری شمع بھی میرے ہاتھ میں سے گرادی اور میں اندھیرے میں رہ گیا جس سے مجھے کسی قدر تکلیف محسوس ہوئی۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر یہ چیز ہو کیا سکتی ہے جو مجھ پر اس طرح لدی جا رہی ہے ——— میں نے اس کو چھوا اور جب اچھی طرح ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی ہے ——— مردہ آدمی ——— اور اس کی مونچھیں بھی ہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ عین دروازے کے ساتھ ٹک کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بطریق احسن اسے اندر رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیا۔ دیر تک موٹر کے نیچے ہاتھ مارتے رہنے کے بعد آخر مجھے بتی مل گئی۔ میں نے اسے روشن کیا اور دوسری طرف جاکر اس کے سامنے والا دروازہ کھول کر چھت کا چھوٹا لمپ روشن کیا۔ کیونکہ آخر مجھے کسی نہ کسی طریقہ سے معائنہ بھی کرنا تھا۔ وہ بے حد لمبا اور دبلا شخص تھا میرے خیال میں چھ فٹ تین انچ سے ضرور کچھ زیادہ ہوگا۔ وہ سیاہ رنگ اور مردار صورت تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندگی میں کبھی اتنا کریہہ منظر دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ وہ ایک سپاہیانہ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اس کی موت کی وجہ معلوم کرنی مشکل نہیں تھی۔ اس کی پیٹھ پر گولی لگی ہوئی تھی۔ گولی کا سوراخ دائیں بازو کی ہڈی کے نیچے دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں بالکل وہیں ——— اور یقینًا گولی سیدھی پھیپھڑے کے اندر گھس گئی تھی۔

اس کی جیبوں میں نہ تو کوئی کاغذ تھا اور نہ اس کے کپڑوں پر کسی درزی کا نام لیکن اس کے پاس ایک بٹوا تھا اور اس میں نو پونڈ تھے۔ یہ منظر اور

بھی المناک تھا۔ یہ درست ہے کہ خدا کے کاموں میں دخل دینا ٹھیک نہیں لیکن جو بھی اس نظارے کو دیکھتا یہ کہنے سے نہ رک سکتا کہ یہ واقعہ نہ ہوتا تو اچھا تھا یہ بات کسی قدر پُراسرار بھی تھی —— اسے کس نے قتل کیا تھا؟ یہ قرین قیاس نہیں تھا کہ لڑکی اس کے ساتھ آس پاس کے دیہات میں تفریح کیلئے سواری کر رہی تھی اور اگر کسی اور نے اسے قتل کیا تھا تو اُس نے اس واقعے کے متعلق ذکر کیوں نہیں کیا تھا؟ نہیں اس نے نہیں کیا تھا۔ اب وہ جا چکی تھی اس لئے فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں کوئی ٹیلیفون نہیں تھا۔ میں نے موٹر خانے کے دروازے کو قفل لگا دیا اور اپنے بستر پہ جا لیٹا۔ اس وقت دو بج رہے تھے۔

دوسرے دن کسی وجہ سے میری نیند صبح سویرے ہی کھل گئی۔ اور مجھے اٹھتے ہی جو پہلا خیال سوجھا وہ یہ تھا کہ میں جا کر ان چیزوں کو دن کی روشنی میں مسز سیلٹن کے آنے سے پہلے ہی دیکھ آؤں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پہلی بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ گزشتہ رات بہت زیادہ برف پڑی ہے کیونکہ کسی جگہ پہ نہ تو پہیوں کی لکیریں نظر آتی تھیں اور نہ پاؤں کے نشان اور دوسرے یہ کہ میں چابی موٹر خانے کے دروازے پر ہی بھول آیا تھا۔ میں اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی موٹر تھی۔ نہ کوئی انسان نہیں وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش پر جہاں بتی گری تھی۔ موم کا ایک نامعلوم سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے سوا اس سے پہلے میرے وہاں داخل ہونے کا اور کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ دو باتوں میں سے ایک تو لازمی طور پر ہوئی ہوگی۔ یا تو رات کے وقت کوئی آیا تھا اور موٹر لے کر بھاگ گیا تھا۔ یا میں آگ کے سامنے سو گیا ہونگا اور یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہوگا۔

پھر مجھے شراب کے گلاسوں کا خیال آیا۔ وہ ابھی تک بیٹھک میں پڑے ہونے چاہئیں میں ان کو دیکھنے کے لئے پیچھے مڑا۔ وہ تینوں وہیں موجود تھے۔ پھر یقیناً یہ خواب نہیں تھا۔ بلکہ سچ مچ کوئی وہاں آیا تھا اور موٹر اڑا لے گیا تھا لیکن اگر یہ حقیقت تھی تو انھوں نے حیرت انگیز خاموشی سے کام لیا ہوگا۔

لڑکی نے اپنا گلاس انگیٹھی پہ رکھا تھا اور اس پر اس کی انگلیوں کے نہایت باریک اور صاف نشان نظر آ رہے تھے۔ ان نشانات میں سے چند میرے بھی تھے۔ کیونکہ پہلے تو میں جا کر باورچی خانے سے گلاس لایا تھا۔ اور پھر اس میں اس کے لئے شراب ڈالی تھی۔ لیکن اس کے —— اس کی انگلیوں کے نشان صاف تھے اور میرے چکنے۔ اس لئے ان دو قسم کے نشانوں کا الگ الگ تمیز کر لینا مشکل نہیں تھا۔ کیا اس بات پر توجہ دلانا ضروری نہیں کہ مذکورہ گلاس کافی اہم چیز تھی یقیناً وہ قتل یا اسی قسم کا کوئی اور معاملہ تھا۔ اور لڑکی اگر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ قتل نہیں کیا تھا تب بھی وہ اس کے متعلق سب کچھ جانتی ہوگی اور آج جو کچھ بھی شہادت کے طور پر پیچھے چھوڑ گئی تھی پولیس کو حوالہ کرنا چاہئے تھا اور جو کچھ وہ چھوڑ گئی تھی وہ صرف یہ نشان تھے میں نے گلاس کو بہ احتیاط تمام ایک پرانے بسکٹوں کے ڈبے میں محفوظ کر لیا۔

جب مسز سیلٹن آئی میں نے اس سے اپنا حساب صاف کیا اور شہر واپس چلا آیا۔ میں نے راستے میں مالک مکان سے بھی ملاقات کی اور اس سے کہا کہ میں مکان کے متعلق "اسے چند روز بعد لکھوں گا"۔ چنانچہ میں گاڑی پر سوار ہو گیا اور عین وقت پر سکاٹ لینڈ یارڈ کے اسٹیشن پر آ پہنچا۔ میں اوپر چڑھ گیا اور اپنے ایک دوست سے ملاقات کی۔ میں نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ کیا اس کے ماہرین ان نشانوں کو پہچان سکتے ہیں۔ اس نے کہا "شاید نہیں" لیکن اس نے اسے تفتیش نشانات انگشت کے شعبے میں بھیج دیا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ مجھے یہ کہاں سے ملا ہے؟ میں نے کہا "جلدی کیا ہے پہلے شناخت تو ہو لینے دو"۔ اُسنے کہا "بہتر یہ لوگ خوفناک پھرتی سے کام لیتے ہیں —— بمشکل تین منٹ گزرے ہوں گے کہ ان کا کلرک ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ لئے ہوئے واپس آ گیا۔ وہ لڑکی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے مجھے اُسکا نام اور اسکی اصلی تصویر دکھائی۔ وہ ایک نہایت جانباز عورت تھی جسنے ہوش سنبھالنے کے بعد جو پہلا پیشہ اختیار کیا وہ اٹھائی گیری تھا اور وہ زیادہ تر کتابوں کی دکانوں پر ڈاکے مارا کرتی تھی۔ اسکے بعد اس نے ڈاکوؤں کی ایک جماعت کے کسی رکن سے رفاقت پیدا کی

میرے دوست نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا پھر ڈاکوؤں کے دو گروہوں میں لڑائی ہو گئی اور اس لڑائی کے دوران میں اس کا دوست گولی کا شکار ہو گیا پھر اس عورت نے اسے موٹر میں لیجانے کا انتظام کیا۔ لیکن موٹر نارفوک کے قریب پہنچکر بگڑ گئی۔ وہ موٹر اور اس دوست کی لاش وہیں کسی کے موٹر خانے میں چھوڑ گئی اور خود لاری پر سوار ہو کر نارفوک کی طرف چلی گئی بگر وہ نارفوک پہنچ سکی۔ راستے میں لاری پھسل گئی اور وہ عورت اور لاری ڈرائیور —— جس کا نام ولیم تھا گر کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے سر ایک پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرا کر پس گئے ہر کوئی جانتا ہے کہ یوں کرنا موت کا پیغام ہوتا ہے کم از کم ان کے حق میں تو ایسا ہی ثابت ہوا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ یہ تمام باتیں ٹھیک ہیں فرق اتنا ہے کہ تم یہ سب واقعات جان نہیں سکتے کیونکہ انھیں گزرے کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا —— یہ واقعہ گزشتہ رات کا ہے"۔

وہ کہنے لگا "پاگل ہو گئے ہو۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۱۹ء کا ہے جن آدمیوں کا تم نے ذکر کیا ہے۔ انھیں مرے ہوئے سالہا سال گزر چکے ہیں"۔

یہ سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مگر پھر مجھے رہ رہ کر ان طلائی سکوں کا خیال آنے لگا جو میں نے مقتول کی جیب میں دیکھے تھے۔

محمود احمد خاں

آزادی

ہندوستان سیاسی تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے جوں جوں ترقی کر رہا ہے لفظِ آزادی کا استعمال بھی زیادہ ہو رہا ہے۔ لفظ آزادی کئی ایک معانی میں استعمال ہو رہا ہے اور ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں:۔

اوّل انفرادی آزادی بمقابلہ انفرادی غلامی۔ ان معنی میں آزادی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کوئی فرد اپنے جیسے کسی اور شخص کی ملکیت نہیں اور اُسے وہ تمام حقوقِ انسانی جو امارت میں افراد کو حاصل ہوں ملے رہتے ہیں۔

دوم حق شہریت۔ ان معنی میں زبانِ انگریزی میں آزادی کے مرادف لفظ "لبرٹی" ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ تمام آسانیاں سہولتیں اور حقوق دربارہ تحفظِ جان و مال ہیں جو فرد کو امارت کے تابع فرمان رہنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اوروں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے فرد کا اپنے آپ پر بعض عام پابندیاں اور قیود عائد کرنا تاکہ اور لوگ بھی اُن کے معاوضہ میں اس کے ایسے ہی حقوق کا احترام کرتے ہوئے اُن کے تلف کرنے سے باز رہیں۔

سوم بمعنی بے تکلفی۔ جسارت

چہارم قومی آزادی۔ یعنی کسی ملک کے کسی غیر قوم کے زیرِ حکومت نہ ہونے اور اندرونی و بیرونی تمام معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق سرانجام دینے کی حالت۔

پنجم حقوقِ خصوصی۔ خاص حق جو عام لوگوں کو حاصل نہ ہوں اور کسی کسی کو حاصل ہوں۔ مثلاً کسی شخص کو حکومت کی طرف سے یا کسی مقامی ادارہ کی طرف سے یہ حق مل جانا کہ وہ کسی خاص رسوم یا محاصل کی ادائیگی سے آزاد ہے یا کوئی اور بات جس کے کرنے کی اوروں کو ممانعت ہو لیکن اس کو آزادی۔

ششم بمعنی رسم و رواج سے لاپروائی۔ ان معنی میں لفظ "آزادی" کا ان دنوں عام استعمال ہو رہا ہے۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیوں کے سلسلہ میں۔

ہفتم بے آئینی۔

ہشتم سیاسی آزادی۔ افراد کو حقِ رائے دہی کی ادائیگی سے حکومت میں حصہ دینا۔

لفظِ آزادی کے مرقومہ صدر معانی میں سے صرف دو سب سے زیادہ اہم اور اس قابل ہیں کہ ان پر کسی قدر مفصل بحث کی جائے۔

قومی آزادی

قومی آزادی کا تعلق امارت سے ہے۔ جس طرح ایک فرد اپنے کاروبار میں آزاد ہونا پسند کرتا ہے۔ اُسی طرح ایک ملت بھی امارت کے کاموں میں خود ہی اپنے سیاہ و سفید کی مالک بننا پسند کرتی ہے۔ اگر فرد کسی اور کے تابع فرمان رہنا عزتِ نفس کے خلاف خیال کرتا ہے تو ملت بھی اپنے آپ پر غیر ملکی حکومت کو ملی وقار کے منافی سمجھتی ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسی قوم نہ تو اب تک ہوئی ہے اور نہ ہے جس نے کسی غیر ملکی حکومت کو برضا و رغبت قبول کیا ہو اور اس کے تابع فرمان مطمئن رہی ہو محکوم اقوام کو جذبۂ ملی کسی نہ کسی صورت میں برانگیختہ رکھتا ہے۔ اور وہ شورش و اضطراب پیدا کرتی رہتی ہیں۔ جب تک ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ ہندو شورش اور بغاوت کرتے رہے اور جب مغلیہ حکومت کمزور ہو گئی۔ ہندو مراکز میں خود مختار ہندو حکومتیں قائم ہو گئیں۔

ہالینڈ اور بلجیم والے ایک عرصہ تک سپین اور کنٹربری کے خلاف جنگِ آزادی لڑتے رہے اور بالآخر آزاد ہوئے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بھی انگلستان کی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بذریعۂ جنگ آزادی حاصل کی۔ زمانۂ ماسبق میں باشندگانِ سپین اسلامی حکومت سے مطمئن نہ تھے اور انہوں نے بھی جب موقع پایا اسلامی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور آزاد ہو گئے۔

اِسی طرح اہلِ روم کے خلاف مصر اور ان کے دیگر مقبوضات میں شورشیں برپا ہوتی رہیں اور بالآخر رومن حکومت کے کمزور ہونے پر جس جس کو

موقع ملا آزاد ہو گیا۔

ایشیا میں اسلامی حکومتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ترکی حکومت سے نجات پانے کے لئے اہلِ عرب نے بغاوت کی۔ آئرلینڈ کئی صدیوں تک انگلستان کی حکومت کے خلاف شورش کرتا رہا۔ کئی دفعہ وہاں بغاوتیں ہوئیں اور متعدد بار اُسے فتح کرنا پڑا۔ وہاں کے باشندے ہمیشہ مضطرب رہے۔ اور اپنے آپ کو انگلستان کے ظلم وستم کا شکار سمجھتے رہے۔ بڑی جد وجہد سے انہوں نے ہوم رول حاصل کئے جو کم وبیش آزادی کے مرادف ہیں۔

اس کے علاوہ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندے ملکی آزادی نہیں چاہتے بلکہ کسی اور طاقتور ملت کے ساتھ شامل ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سکاٹ لینڈ والے اگرچہ ایک عرصۂ دراز تک انگلستان کے خلاف معرکہ آرا رہے۔ لیکن بالآخر انہوں نے انگلستان کے ساتھ الحاق کو اپنے لئے فائدہ مند جانا اور الحاق کے بعد اُن کی حالت پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو گئی۔ کنیڈا والوں نے بھی سلطنتِ برطانیہ میں شامل رہنے کو ملکی آزادی پر ترجیح دی۔ اس وقت انہیں وفاقی درجۂ حکومت حاصل ہے اور وہ ہر لحاظ آزاد ہیں۔ انگلستان بھی اُن کے معاملات میں دخل درمعقولات نہیں کرتا۔

کینیڈا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہمسایہ ہے۔ لیکن جہاں مؤخرالذکر نے مکمل آزادی کو ترجیح دے کر انگلستان کے خلاف بغاوت کی اوّل الذکر نے انگلستان کے ساتھ شامل ہونا پسند کیا اور اسی شمولیت سے اُسے فائدہ بھی کافی پہنچا۔

ہندوستان میں انگلستان کی حکومت قائم ہے۔ اور ہندوستان وفاقی درجۂ حکومت حاصل کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ اس کے لئے جہاں آئینی جہاد کیا جاتا ہے وہاں غیر آئینی کارروائیاں بھی کی جاتی ہیں۔ غیر آئینی کارروائی کرنے والے اگرچہ معدودے چند ہیں لیکن اُن کے خیال میں مکمل آزادی زیادہ مفید اور عزت بخش ہے۔ وفاقی درجۂ حکومت کے حامیوں کی تعداد مقابلۃً سب سے زیادہ ہے اور وہ اپنی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور جانتے ہوئے کہ ہمسایہ ممالک کے ہاتھوں اُن کی آزادی کا سلب ہو جانا قرینِ قیاس ہے۔ وفاقی درجۂ حکومت کو ہی اپنے حق میں بہتر خیال کرتے ہیں۔

ان مثالوں کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مکمل غلامی کی حالت میں کوئی ملک کبھی خوش نہیں رہ سکتا اور بعض صورتوں میں بعض محکوم ممالک غلامی کے مقابلہ میں آزادی چاہتے ہیں اور بعض حکمران ملک کے مساوی حقوق حاصل کرکے اُس کے ساتھ شامل رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ اُن حالات کی تشخیص جن کی بنا پر ملک مکمل آزادی اور وفاقی درجۂ حکومت کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے گئے ہیں ضروری نظر آتی ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے تعلیمی وسیاسی لحاظ سے ترقی یافتہ ہوں اور اُن کے متحد ہونے یا متحد ہو جانے کی توقعات کافی سے زیادہ ہوں اور ملک کے تمام مفاد آزادی ہی سے وابستہ ہوں تو ایسا ملک مکمل آزادی کو ہی اپنا نصب العین بنائے گا لیکن اگر کوئی ملک بلحاظ ادبی تعلیم اور سیاسی ترتیب پس ماندہ ہو اور لسانی۔ مذہبی۔ نسلی، تمدنی اختلافات کی بنا پر اُس کے باشندوں کا متحد ہونا بھی ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں غیر ملکی حکومت اُن کے اقتصادی مفاد کو نظرانداز کرتی ہوئی اُسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچائے وہ مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنانے سے بدکتا ہی رہے گا۔ کیونکہ اس کو اپنی اِس کمزوری کا احساس ہوگا کہ مکمل آزادی حاصل کرکے وہ اُسے قائم نہیں رکھ سکے گا۔ کوئی ایسا ملک وفاقی درجۂ حکومت ہی کو اپنا نصب العین بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ملک جس کے باشندوں کا مذہب تہذیب وتمدن اور زبان ایک ہو وفاقی درجۂ حکومت کو نصب العین بناتا ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُسے اس بات میں اپنے آپ پر پورا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ وفاقی درجۂ حکومت حاصل کرکے اُن حقوق کو جو اُسے حکمران ملک کے مساوی حاصل ہوں گے اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے کا مجاز ہوگا۔ اور حکمران ملک ان حقوق کی بلاواسطہ یا بالواسطہ قطع وبرید سے قاصر ہوگا۔

کینیڈا نے اس خود اعتمادی کی بنا پر وفاقی درجۂ حکومت کو ترجیح دی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پیروی میں مکمل آزادی یعنی سلطنتِ برطانیہ سے علیحدگی کو پسند نہ کیا۔ ہندوستان ایسے ملک کے لئے جسے زبان۔ مذہب۔ تہذیب وتمدن کی یکسانیت حاصل نہیں وفاقی درجۂ حکومت ہی سیاسی نصب العین ہو سکتا ہے۔ اگر کسی ایسے ملک کی ہمسایہ اقوام ملک کے مختلف قطعات پر آباد ہوں اور اُن کی حد بندی بھی ممکن ہو تو اُن کے لئے ملکی تقسیم کے بعد وفاقی درجۂ حکومت مفید یا مکمل آزادی کا نصب العین قابلِ حصول ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہمسایہ اقوام ملک کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں آباد نہ ہوں بلکہ ان کی آبادی ملی جلی ہو تو یہ بات حکمران قوم کے لئے مفید ہوگی۔ اگر ایسا ملک وفاقی درجۂ حکومت بھی حاصل کرے تو اس کے تحت اُسے جو حقوق ملیں گے وہ ادنیٰ قسم کے ہوں گے۔ ہمسایہ اقوام ایک دوسری کے خلاف ریشہ دوانیوں سے باز نہیں رہیں گی اور اس طرح حکمران قوم

کو مواقع دیتی رہیں گی کہ وہ وفاقی درجۂ حکومت سے حاصل ہونے والی تمام برکات سے انہیں محروم رکھے۔

سیاسی آزادی

سیاسی آزادی صرف اُن ممالک کے باشندوں کو حاصل ہوتی ہے جن کی حکومت اصول جمہوریت کے مطابق قائم ہو۔ مطلق العنان حکومتوں کے ماتحت باشندوں کو سیاسی آزادی نہیں دی جاتی۔ سیاسی آزادی سے مراد وہ حقوق ہیں جو عوام کو حکومت کے قائم کرنے۔ اُس کے اساسی قانون تیار کرنے اور اُس قانون میں تغیر و تبدل کرنے اور حکومت کے دیگر انتظامی کاموں کی نگہداشت کرنے کے بارے میں دیئے جاتے ہیں۔ ان حقوق کو اگر فرداً فرداً ہر شخص استعمال کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ استعمال کا طریقہ جو عام طور پر تمام جمہوریت پسند ممالک میں رائج ہے یہ ہے کہ افراد کو حق دیا جاتا ہے کہ وہ کونسلوں کے لئے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ کونسلوں کا کام نئے قانون بنانا۔ بوقتِ ضرورت پرانے قانونوں کی ترمیم یا تنسیخ کرنا اور حکومت کے مختلف محکموں کے اخراجات کی منظوری دینا ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت میں شریک ہو جاتے ہیں اور اس کے کاموں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

(میاں) **کفایت علی**



غزل

ہر قدم پر وہ نیا فتنہ اٹھاتے آئے
دل جو پایا اُسے مٹی میں ملاتے آئے

محفلِ حشر ہے یہ جلوہ گہہ خاص نہیں
اُن کے دیوانے کہاں خاک اُڑاتے آئے

اُٹھے اُس در سے مگر دل کو مٹا کر اُٹھے
آئے تو اُس کو ٹھکانے سے لگاتے آئے

دلِ پُرسوز کو چھوڑ آئے ہیں جلنے کے لئے
ہم بھی اُس بزم میں اک شمع جلاتے آئے

بن گیا ہے دلِ بے تاب ہر اک ذرہ قبر
آپ آئے بھی تو اک حشر اُٹھاتے آئے

اُٹھ کر اُس بزم سے آنا ہمیں دشوار ہوا
راستے بھر دلِ مضطر کو مناتے آئے

آئے کاشانۂ دل میں مرے یوں حضرتِ عشق
دُور سے مژدۂ آفات سناتے آئے

دل جلے جاتے ہیں ہر سمت سرِ راہ گذر
وہ جدھر آئے اُدھر آگ لگاتے آئے

آتے تھے بارگہِ پیرِ خرابات سے ہم
راستہ کعبے کا زاہد کو بتاتے آئے

دیکھ اے نجمؔ ذرا نقشِ کفِ پا کی بہار
وہ سرِ راہ گذر پھول کھلاتے آئے

نجمؔ ندوی بی اے

شہزادیوں کی شاعری

اردو جیسا کہ عام خیال ہے شاہان مغلیہ کی وجہ سے بنی اور اسی سلطنت کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ گو شاہان مغلیہ اسے سرکاری زبان نہ بنا سکے مگر پھر بھی دہلی کے آخریں فرمانرواؤں نے اردو کی بڑی خدمت کی، بادشاہوں کی اسی اردو نوازی کی وجہ سے اردو نے حرم شاہی میں بھی بار پایا اور محلات میں بھی اس کا چرچا ہو گیا، اردو کی ترقی شعری حیثیت سے بہت ہوئی چنانچہ بادشاہوں، وزیروں، امیروں کے دوش بدوش محلات شاہی اور بیگمات نے بھی اردو شاعری میں حصہ لیا اور برابر شعر کہتی رہیں، چنانچہ بعض بڑی اچھی شاعرات گزری ہیں، مگر افسوس ہے کہ نہ تو کوئی ایسی شعری تاریخ مرتب کی گئی جس میں شہزادیوں اور بیگمات کی شعروشاعری کا حال ہو اور نہ کوئی ایسا تذکرہ ہی لکھا گیا جو اس موضوع پر مکمل معلومات بہم پہنچا سکے، یوں تو اردو شعر کہنے والی عورتوں کے چار چھ تذکرے ملتے ہیں مگر افسوس ہے کہ کوئی تذکرہ بھی ایسا نہیں جو حقیقی معنی میں تذکرہ کہلانے کا مستحق ہو، تذکرۃ النساء نادری، سے لے کر تذکرۃ الخواتین (آسی) تک دیکھ ڈالئے کوئی کار آمد چیز نہیں ملے گی بلکہ جتنی تلاش و تفحص کی جائے اتنی الجھن پیدا ہوتی جائے گی۔

مدت سے ہمارا خیال تھا کہ اردو کی صرف اُن شاعرات کے حالات اور کلام کا نمونہ ایک جگہ کیا جائے جو محلات شاہی یا شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، مدت کی تلاش اور جستجو کے بعد ہم آج اپنے مرتبہ مواد کو پیش کر رہے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے خاندان شاہی کی ساری شعر کہنے والی خواتین کے حالات جمع کئے ہیں، کیونکہ مواد نہایت منتشر اور میدان تحقیق بہت ہی تنگ ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اور نام بھی مل سکیں۔

اس مضمون کی ترتیب کے لئے خوش نصیبی سے ہمیں بعض نایاب بلکہ ناپید تذکرے اور بعض اہم یادداشتیں استاذی مولانا تمکین کاظمی صاحب کے پاس سے مل گئیں، کیونکہ آپ نے اردو شعر کہنے والی عورتوں کا ایک مفصل اور مبسوط تذکرہ ترتیب دینا شروع کیا ہے جس کے لئے بڑی محنت اور کاوش سے نایاب اور کمیاب تذکرے اور دواوین وغیرہ فراہم کئے ہیں، اس امداد کے لئے میں مولانا کا ممنون احسان ہوں۔

فطرت نے عورت کو نہ صرف صنف لطیف بنایا ہے بلکہ اس میں وہ تمام لطافتیں جو دنیا میں ہو سکتی ہیں ودیعت کی ہیں، چنانچہ فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری، اور شاعری کا ذوق عورت کی فطرت ثانیہ بن گیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورت نے ان تینوں لطیف فنون میں کتنی جان ڈال دی، یونانی ادب میں سے اگر سیفو کے اشعار نکال دیئے جائیں تو یقیناً یونانی ادبیات کی نمایاں خصوصیت زائل ہو جائے گی، ایام عرب کی بعض شعر گو خواتین کا کلام اگر ضائع کر دیا جائے تو عرب کے دور جاہلیت کی تاریخ سراپا جاہلیت نظر آتے گی، اسی طرح دنیا کی ادبیات میں عورت کا حصہ بہت نمایاں رہا ہے۔ ہندوستان میں مصوری کا کچھ ایسا گلا گھونٹا گیا کہ عورتیں تو عورتیں، مرد بھی اس کے پاس پھٹکتے ہوئے جھجکتے رہے، قریب قریب یہی حال موسیقی کا بھی ہوا، مردوں نے اس طرف بہت کم اعتنا کی مگر عورتوں نے اس فن کو زندہ رکھا، شاعری کا بھی یہی حشر ہوتا جو مصوری کا ہوا، مگر خدا جنت نصیب کرے نورجہاں اور زیب النساء کو ان دونوں نے شاعری میں ایک روح پھونک دی، گو نورجہاں کی شاعری کے کوئی مستقل اور اعلیٰ نمونے ہمارے سامنے نہیں ہیں اور نہ زیب النساء کا زیادہ کلام ہے (کیونکہ زیب النساء کے نام سے جو دیوان مشہور ہے وہ مخفی شیرازی کی ایک ایرانی شاعرہ کا ہے) مگر پھر بھی ان دونوں خواتین کا تھوڑا بہت کلام اور ان کی شاعرانہ سرپرستیوں کی روایات ہم تک پہنچی ہیں، گو یہ فارسی میں شعر کہتی تھیں مگر ان کی شاعری بعد میں محلات کی بیگمات اور شریف خواتین کے لئے [illegible] بن گئی اور انہوں نے ان دونوں کی مثال دے دے کر اپنے شاعرا[illegible] کو جاری رکھا، چنانچہ آئندہ اوراق میں آپ کو مغلیہ گھرانے کی گم[illegible]

کا کلام ملے گا۔

ان شہزادیوں نے نہ صرف خود شاعری کی بلکہ شعرا کی سرپرستی بھی کی ہے نواب آصف الدولہ کی بیگم نواب بہو بیگم صاحبہ نے بڑی سرپرستی کی، لکھنؤ کے بعض اچھے شاعر اسی سرکار کے متوسل تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیۂ بھوپال نے نہ صرف خود شعر کہے بلکہ اکثر شعرا کی سرپرستی بھی کی اور خواتین میں شاعری کا چرچا کیا، واجد علی شاہ کی محل خاص عالم نہ صرف خود بڑی اچھی شاعرہ تھیں بلکہ ان کی سرکار میں کئی ایک شاعر مرثیہ خوانی کے سلسلہ میں پرورش پاتے تھے، اسی طرح بیشتر شہزادیوں نے شعری خدمت اور سرپرستی کی ہے۔

آج صرف دو شہزادیاں ایسی ہیں کہ جن کو ہم شاعرہ کی حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں (۱) ملکۂ دکن حضرت دلہن پاشا صاحبہ اعجاز (۲) ہر ہائی نس بیگم صاحبہ رام پور عصمت، ان دونوں مخدرات کے علاوہ اور شہزادیاں ایسی نظر نہیں آتیں جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتی ہوں، بدنصیبی سے اردو کی جگہ انگریزی لیتی جا رہی ہے۔ مرد تو خیر مجبور ہیں انہیں کاروباری اور ملازمتی ضروریات کے لحاظ سے انگریزی بولنا اور لکھنا پڑتا ہے مگر حیرت ہے عورتوں پر جو بلا ضرورت انگریزی کی طرف کھنچی جا رہی ہیں، ہم اردو کو اپنی مادری زبان اس لئے کہتے ہیں کہ ہم نے جس ماں کی گود میں پرورش پائی اس کی زبان اردو تھی، اگر ہمارے بچے، خدا جانے اردو کو مادری زبان کہنے کے مستحق ہوں گے یا نہیں! کیونکہ وہ جس ماں کی گود میں پرورش پائیں گے اس کی زبان اردو نہ ہوگی یا اردو ہوگی بھی تو ایسی جس کا غالب حصہ انگریزی ہوگا، کیا ہم اس کے متعلق اپنی ہندوستانی ماؤں، بہنوں کو متوجہ کرا سکتے ہیں!

اس مضمون کو ہم نے شہزادیوں کے تخلص کے اعتبار سے حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا ہے کیونکہ اکثر شہزادیوں کے سنین ہمیں مل نہ سکے اور بعضوں کے متعلق تو زمانے کا تعین تک نہ ہو سکا اس لئے ہمیں افسوس کے ساتھ ایسی ترتیب قائم کرنی پڑی،

اعجاز

حضرت ملکۂ دکن دلہن پاشا صاحبہ قبلہ دام اقبالہا، آپ نواب جہانگیر جنگ بہادر ابن نواب حیدر الدولہ حیدر جنگ بہادر ابن نواب حید الملک رفیع الدولہ کی صاحبزادی ہیں، آپ کی دادی راحت النسا بیگم صاحبہ قبلہ نواب روشن الدولہ (خلف غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر) کی صاحبزادی تھیں، آپ کے والد اعزاز مرشدزادگی، جاگیر، منصب اور خطاب سے سرفراز تھے، آپ کی تعلیم و تربیت والد بزرگوار ہی کے زیر نگرانی ہوئی، آپ کا عقد مبارک حضور بندگان عالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر دام اللہ ملکہ و سلطنتہ سے ۱۹ر صفر ۱۳۲۴ھ / ۱۳۱۵ف کو (جبکہ بندگان عالی ولیعہد دکن تھے) حضرت نواب میر محبوب علی خاں نے بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے فرمایا، ۸ر محرم ۱۳۲۵ھ کو آپ کے بطن مبارک سے والاشان نواب اعظم جاہ میر حمایت علی خاں بہادر ولی عہد و سپاہ سالار عساکر آصفی کی ولادت عمل میں آئی اور ۲۵ر ذی قعدہ ۱۳۲۵ف کو والاشان نواب معظم جاہ بہادر کی ولادت باسعادت ہوئی، آپ نے ۱۳۵۴ھ میں فریضۂ حج بھی ادا فرمایا،

آپ کو شعر و سخن سے بھی خاص دلچسپی ہے اور علمی ادبی انہماک بھی رکھتی ہیں فکر شعر بھی گاہے گاہے فرماتی ہیں:-

اُن کو عہد وفا کی لاج نہیں
دردِ دل کا کوئی علاج نہیں

حالِ عاشق کبھی سنا تو کرو
کیا حسینوں میں یہ رواج نہیں

دو ہی دن میں بدل گیا وہ رنگ
کل جو تھا لطف مجھ پر آج نہیں

بوئے گیسو صبا جو لائی ہے
دل کو تسکیں ہے اختلاج نہیں

سچ ہے اب خسروِ دکن کے سوا
کوئی شایانِ تخت و تاج نہیں

سارا عالم ہے بندۂ اخلاق
کوئی سلطان سلخوش مزاج نہیں

درد دینے لگا مزا دل کو
اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

کیا نبھے عشق ان سے اے اعجاز
سنگ و شیشہ میں امتزاج نہیں

یہ قصیدہ بیگم صاحبہ نے مدینۂ طیبہ میں موزوں فرمایا تھا، جس کے لفظ لفظ سے محبتِ رسول نمایاں ہے

میرا مولا درِ آقا پہ مجھے لایا ہے
آج کیا اخترِ طالع نے شرف پایا ہے

بڑھ کے جب بُرجِ علیٰ سے نظر آیا گنبد
مرحبا صلِ علیٰ لب پہ مرے آیا ہے

ہے وہ در آپ کا دربان ہیں جس کے جبریل
اور اسی باب سے خالق کا سلام آیا ہے

روضۂ پاک پہ دیکھی وہ تجلی جس سے
طور پر حضرتِ موسیٰ نے بھی غش کھایا ہے

کیا بشر کی ہے حقیقت جو کوئی وصف کرے
شان میں آپ کے لولاک لما آیا ہے

عرض مقصد جو کیا بیٹھ کے جالی کے قریب
کس زباں سے کہوں دل میں جو جواب آیا ہے

اے مسیحِ دو جہاں لطف ہو اعجاز پہ بھی
سب مریضوں نے یہیں جامِ شفا پایا ہے

(تزک محبوبیہ جلد دوم، بستان آصفیہ جلد اول و چہارم، اخبار صبح دکن ۱۶ر جون ۱۹۳۵ء، رسالہ جہانگیر لاہور نظام نمبر ۱۹۳۲ء)

اختر

تیموری گھرانے کی شہزادی تھیں، شعر خوب کہتی تھیں، نعت میں بڑا کمال تھا، قدسی کی غزل پر لاجواب خمسہ کیا ہے۔ پھر لطف یہ کہ عاشقانہ شعر بھی

نہایت اچھے کہتی تھیں۔

تجھ پہ قربان ہوں میں ہاشمی و مطلبی — کہ ہے مشہور دو عالم تیری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی — مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

وہ ترا نور ہے ماہِ فلکِ مہر کرم — تیرے جلوے سے منور ہوئے دونوں عالم
تاب یوسف کو کہاں ہے کہ ترے دیکھے قدم — من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

دردِ عصیاں کے سبب سے ہے مری جان چلی — اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اختر کی بھی قدسی کی طرح سے یہی — سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درمانِ طلبی

آستاں پر ترے پیشانی کو گھسنے گھسنے — سر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

لکھ کر جو مرا نام زمیں پر مٹا دیا — ان کا تھا کھیل خاک میں مجھ کو ملا دیا

(تذکرۃ النساء، عورت مرد کا مکالمہ، حدیث قدسی، المخدرات، ماہِ درخشاں، مشاہیر نسواں، نسیم سخن، بہارستانِ ناز، رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء)

اسیر

اسیر بیگم نام تیموریہ خاندان کی شہزادی تھیں ۱۸۴۸ء کے پس و پیش زندہ تھیں، شاہ فخر الدین احمد دہلوی سے تلمذ تھا، مولف تذکرۃ النساء کا بیان ہے کہ کسی نے اسیر کو یہ مصرع سنایا "بے قراری قرار ہے اپنا" اور اسیر نے اس پر فی البدیہہ یہ مصرع بہم پہنچایا "عشق دار و مدار ہے اپنا" اور پھر ایک شعر بھی سنایا جس سے اسیر کی بدیہہ گوئی اور موزونیٔ طبع ظاہر ہوتی ہے۔

عشق دار و مدار ہے اپنا — بے قراری قرار ہے اپنا
خاک میں مل گئی ہو جس پہ اسیر — اس کے دل میں غبار ہے اپنا

صاحب بہارستانِ ناز نے اپنے تیسرے ایڈیشن میں لکھا ہے کہ یہ شعر کسی مرد کے ہیں مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا، پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں یہ شعر خود انہوں نے اسیر کے نام سے نقل کئے ہیں۔

(تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، المخدرات)

اشک

دہلی کی ایک شہزادی تھیں جو ۱۲۹۲ھ میں زندہ اور قلعہ سے متعلق تھیں، مولف تذکرہ بہارستان ناز کو شبہ ہے کہ یہ کلام کسی مرد شاعر کا ہے اور مطلع کے متعلق ہمیں بھی شبہ ہے کیونکہ یہ مطلع مدت سے ہم سن رہے ہیں مگر تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، المخدرات متفق ہیں کہ یہ شاعرہ تھیں اور یہ کلام انہیں کا ہے۔

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے — تجھے تو لے بتِ کافر فقط ترسانا آتا ہے
کسی عاشق کا بیشک استخواں ہے میں نہ مانوں گا — کہ شانہ تیرے رخ تک آتا آتا کانپ جاتا ہے

(تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستانِ ناز، المخدرات)

بدر

بدرِ عالم بیگم صاحبہ جانِ عالم واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی چہیتی ممتوعہ تھیں، شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق تھا نہ صرف بہترین شعر کہتی تھیں بلکہ نثر بھی بہت عمدہ لکھتی تھیں۔ آپ کے چند خطوط کا مجموعہ جو آپ نے واجد علی شاہ کے نام لکھے تھے مدت ہوئی حیدرآباد میں طبع ہو چکا ہے۔ آپ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ نہ جا سکیں بلکہ آخر تک لکھنؤ ہی میں رہیں، افسوس ہے اس سے زیادہ حالات نہ مل سکے۔

سوزاں ہوں مگر دھواں نہیں ہے — گویا منہ میں زباں نہیں ہے

ستاتا ہے بہت دردِ جدائی — دہائی ہے خداوندا دہائی

تمہارے خط کو جب دیکھا تنِ مردہ میں جاں آئی — ہوا ثابت کہ ہے تحریر میں اس کی مسیحائی

ایک دو میں سے حال ہو جائے — وصل ہو یا وصال ہو جائے

تپِ فرقت میں یہ بیتاب ہے دل — مثلِ پارۂ سیماب ہے دل

ہے تپِ فرقت سے بھڑکی دل میں آگ — آہ کا سینہ سے اٹھتا ہے دھواں

(رقعات بدر عالم مطبوعہ، تذکرۃ النساء، رسالہ ادبی دنیا لاہور بابتہ جنوری ۱۹۳۵ء، عالمگیر ۱۹۳۵ء)

بہو

بہو بیگم، محل خاص نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم مرحوم والیٔ رام پور، شعر خوب کہتی تھیں طبیعت میں روانی اور شوخی تھی ۱۲۹۰ھ کے قبل زندہ تھیں۔

شب بزمِ ملاقات میں ہر چند یہ چاہا — ق — آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس ترکِ قمر سے
پر خوف مرے دل میں یہی آیا کہ ہے ہے — نازک ہے نہ دب جائے کہیں بار نظر سے

(تذکرۃ النساء، شمیم سخن، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، المخدرات)

بیگم

رشک محل خطاب تھا پنجاب کی متوطن اور سلطان عالم واجد علی شاہ کی ممتوعہ تھیں، ایک مدت تک واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ میں رہیں اور پھر لکھنؤ چلی گئیں، موسیقی میں اچھا ملکہ تھا اور ریختی کہتی تھیں ۱۲۹۹ھ میں زندہ تھیں، افسوس ہے کہ مولفِ تذکرۃ الخواتین نے آپ کا ذکر نہایت ہی بری طرح کرکے اپنی بے بضاعتی کا ثبوت دیا ہے۔

ہے منظور باجی ستانا تمہارا　　گلہ کرتی ہے جو دوگانا تمہارا
نہ بھیجوں گی میں تم کو سسرال خانم　　نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمہارا

(سخن شعرا، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، شمیم سخن، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، المخدرات)

پارسا

نواب میر تقی خاں ہوس نیشاپوری کی بڑی صاحب زادی تھیں، مرزا ہوس نواب آصف الدولہ بہادر والیٔ اودھ کے قریبی عزیز تھے، اور انہوں نے وضعداری کے مرنے تک اپنی دونوں صاحبزادیوں پارسا اور حیا کی شادی نہیں کی اس لئے کہ خسر بننے کا ننگ گوارا نہ تھا،

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا　　یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا
چلتا نہیں ہے ابلقِ ایام ایک چال　　اکثر یہ بدرکاب بنا اور بگڑ گیا

(تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، شمیم سخن، بہارستانِ ناز، تذکرہ الخواتین آسی)

پروین

شہزادی فرطیس بانو، اختر جہاں آرا نام اور کج کلاہ خطاب ہے پروین اور شریا تخلص کرتی ہیں، آپ کے والد مرزا عاشق حسین بزم قزلباش گھرانے کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں، جن کا سلسلۂ نسب نوشیروانِ عادل پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ کا نام میری وکٹوریہ سارکس نپولین تھا، جو کونٹ ولیم سارکس نپولین کی چھوٹی صاحبزادی تھیں، کونٹ ولیم مشہور شہنشاہ نپولین بونا پارٹ کے خاندان سے تھے اور ریاست بھوپال کے کمانڈر انچیف تھے، نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحوم والیٔ رام پور نے مرزا بزم کو وزیر بھوپال کا اے ڈی سی مقرر فرمایا تھا اور انہیں کی عنایت کی وجہ سے مرزا بزم اور میری وکٹوریہ کی شادی ہوئی چونکہ شادی کے بعد مرزا بزم عہدِ زفاف (ہنی مون) منانے کے لئے طہران چلے گئے تھے اور وہاں مدت تک قیام رہا اس لئے پروین کی ولادت بھی طہران ہی میں ہوئی، چونکہ پروین نہایت ذہین اور تیز تھیں اس لئے نویں سال ہی عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم ختم کرکے شعر کہنے لگیں، گیارہ سال کی عمر میں سید علی رضا نقوی زمیندار سرسی سے پروین کی شادی ہوئی مگر شادی کے آٹھویں سال کچھ ایسے اختلافات ہوئے کہ علیحدگی ہوگئی، مولف تذکرۃ الخواتین کا بیان ہے کہ آپ ۱۹۱۰ء میں رام پور میں تھیں اور منا صاحب ہوم سیکرٹری رام پور سے مشورۂ سخن کرتی تھیں،

پروین غزل اور نوحہ خوب کہتی ہیں اور زبان پر خاصا عبور ہے جس کے متعلق خود ان کو حیرت ہے۔ چنانچہ کہتی ہیں،

ہیں کسرائی وطن طہرانِ مسکن گونڈوانے ہیں　　خدا معلوم کیونکر آگئی اردو زباں مجھ کو

کسی گلبدن پر جو آئی ہوئی ہے　　طبیعت عجب رنگ لائی ہوئی ہے

کیا ایسا مایوس ناکامیوں نے　　دعا میری بابِ اثر ڈھونڈتی ہے
یہ عقدہ کھلا قیس کی جستجو سے　　محبت بھی راحت کا گھر ڈھونڈتی ہے

دیکھتے ہی دیکھتے بسمل کی آنکھیں پھر گئیں　　کھینچتے ہی کھینچتے سفاک خنجر رہ گیا
تونے اے ضبطِ محبت خوب ہی کی بے زباں　　شکر ہے پردہ کسی کا روزِ محشر رہ گیا

سنبھل کے پروین قدم اٹھانا کہ سخت مشکل ہے راہِ الفت
ہزاروں جانباز مرمٹے ہیں وہ ڈھب ہے قاتل کی آستیں کا

(تذکرۃ الخواتین آسی)، (رسالہ زمانہ کانپور بابت جولائی ۱۹۳۲ء)

تاجور

شاہ جہاں بیگم صاحبہ، نواب جہانگیر محمد خاں کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ ۲۰ رجمادی الاول ۱۲۵۴ھ میں سکندر بیگم صاحبہ کے بطن سے قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں، والد کے انتقال کے بعد جب آپ تخت نشین ہوئیں تو اس وقت آپ کی عمر سات آٹھ سال کی تھی،

انیس۱۹ سال کی عمر میں نواب امراؤ الدولہ باقی محمد خاں بہادر سپہ سالارِ افواج بھوپال سے شادی ہوئی، غدر کی گڑبڑ ہو گئی تو آپ نے نہایت دور اندیشی سے اپنی والدہ کو تخت نشین کر دیا اور خود ولیعہد بن گئیں ۱۲۷۴ھ میں آپ کے بطن سے سلطان جہاں بیگم صاحبہ تولد ہوئیں جو بعد کو سریر آرائے سلطنتِ بھوپال ہوئیں اور اپنے لائق اور ہوشیار شہزادے نواب حمید اللہ خاں بہادر کو تختِ سلطنت سونپ کر علیحدہ ہو گئیں،

۱۲۷۷ھ میں آپ کے بطن سے سلطان جہان بیگم صاحبہ پیدا ہوئیں جو ۱۲۹۲ھ میں انتقال کر گئیں، ۱۲۸۴ھ میں نواب امراؤ الدولہ بہادر نے انتقال کیا اور اس کے کچھ دنوں بعد آپ کی والدہ نواب سکندر بیگم صاحبہ بھی انتقال کر گئیں اور آپ ۱۲۸۵ھ میں دوبارہ تخت نشین ہوئیں، ۱۲۸۹ھ میں آپ کو جی، سی، ایس، آئی اور پھر ۱۲۹۳ھ میں نشانِ شاہی اور تمغۂ قیصرِ ہند پھر ۱۲۹۹ھ میں کراؤن آف انڈیا کا اعزاز ملا، آپ نے ایک مدت کے بعد نواب صدیق الحسن خاں بہادر سے نکاح ثانی کیا،

۱۳۱۹ھ میں پینسٹھ سال کی عمر پا کر چونتیس سال برسرِ حکومت رہ کر وفات پا گئیں۔

آپ بڑی رحم دل اور فیاض تھیں علم و ادب کا خاصہ ذوق تھا دو دیوان ایک مثنوی اور کئی ایک کتابیں آپ نے تصنیف کیں، ایک اخبار بھی "عمدۃ الاخبار" کے نام سے جاری کیا تھا، ابتداً شیریں اور اس کے بعد تاجور تخلص کرتی تھیں، شعر خوب کہتی تھیں،

برگِ گل ہونٹ ہیں گل گوش ہیں نرگس آنکھیں ‏ ‏ ‏ ‏ زلف سنبل ہے دہن غنچہ گلستاں ہے، وہ رُخ

ذرا خدا سے ڈرو اے بتو جفا نہ کرو ‏ ‏ ‏ ‏ ذرا یہ سوچو تو کیا ہم خدا نہیں رکھتے

اپنی یہی مراد فقط شاعری سے ہے ‏ ‏ ‏ ‏ شیریں ہمارا نام جہاں میں سدا رہے

خاطر سے تری جھوٹ کو کہہ دیتے تھے ہم سچ ‏ ‏ ‏ ‏ ورنہ تری باتوں کا بھلا کس کو یقیں تھا

اب ہم سے کیوں ملوگے ہر ٹڑا ہماری کیا ‏ ‏ ‏ ‏ پیدا کئے ہیں اب تو نئے تم نے یار دوست

عشق نے بھڑکائی ایسی اس دلِ مضطر میں آگ ‏ ‏ ‏ ‏ لگ گئی سینہ میں پہلو میں جگر میں ہر میں آگ

تڑپا رہی ہے دم ملوں کو اک بیوفا کی یاد ‏ ‏ ‏ ‏ بے بس مرا کلیجہ ہے بے اختیار دل

تاجور چشم اہلِ الفت میں ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ فقیری سے بڑھ کے راج نہیں

(خواتین (اسلم جیراجپوری) ایشیائی شاعری، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

جانی

بیگم جان نام اور بہو بیگم خطاب تھا، نواب قمر الدین خاں بہادر کی صاحبزادی اور نواب آصف الدولہ بہادر شاہِ اودھ کی محل تھیں، ۱۲۰۰ھ کے قبل زندہ تھیں، مؤلف تذکرۃ النساء راوی ہے کہ آپ ایک دفعہ بیمار تھیں آپ کی عیادت کے لئے "ہمدم" نامی ایک خواجہ سرا آیا تو آپ نے فی البدیہہ یہ شعر سنایا،

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جسمِ ناتواں کی ؟
رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی ؟

شعر خوب کہتی تھیں زبان اچھی اور تخیل میں نزاکت بھی خاصی ہے ر

نہیں ٹانکے مرے زخمِ جگر پر ‏ ‏ ‏ ‏ یہ اس کا خندۂ دنداں نما ہے
نہیں ٹلتی کسی عنوان سر سے ‏ ‏ ‏ ‏ شبِ غم بھی کوئی کالی بلا ہے

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمن جانی ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہیں ہے

(تذکرۃ النساء، گلشن بے خار، مشاہیر نسواں، سخن شعرا، ماہ درخشاں، بہارستان ناز)

جینا

جینا بیگم نام، مرزا بابر ابن بہادر شاہ ظفر کی دختر اور جہاندار شاہ کی محل خاص تھیں، مرزا رفیع سودا سے تلمذ تھا، قیاس ہے کہ ۱۸۴۵ء میں زندہ تھیں، آسی صاحب وغیرہ نے گنا بیگم شوخ کے نام سے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ آپ کے نام سے بھی نقل کئے ہیں ہم نے دونوں کے اشعار علیحدہ علیحدہ کر دئے ہیں،

یہ کس کی آتشِ پنہاں نے جی جلایا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ تا فلک مرے شعلے نے سر اٹھایا ہے

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر ‏ ‏ ‏ ‏ کیا جانئے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی

نہ دل کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا ‏ ‏ ‏ ‏ دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

(تذکرہ ہندی مصحفی، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، تذکرۃ النساء، گلشن بے خار، تذکرۃ الخواتین، سخن شعرا، چمن انداز)

حیا

حیات النساء بیگم عرف بھوری بیگم شاہ عالم ثانی کی صاحبزادی تھیں،

شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا، غدر سے پہلے سن یاس کو پہنچ کر انتقال فوت ہوئیں، بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی سے ان کے کلام کو پارسا کی بہن حیا کے کلام سے ملا دیا ہے۔ دراصل یہ حیا الگ ہیں اور ہوس کی بیٹی جدا۔

نہ کیوں حیرت ہو یا رب وہ زمانہ آ گیا ناقص
حیا ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

(حدیقۂ عشرت، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، بہارستان ناز)

حیا

پارسا کی چھوٹی بہن اور مرزا تقی خاں ہوس کی صاحبزادی تھیں۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا ۔۔۔ آب گہر میں عکس بہاتا ہے یار کا

نہ سنئے گا کبھی بھولے سے بھی قصہ محبت کا ۔۔۔ اڑا دیتی ہے نیند اللہ اثر ہے اس کہانی کا

آج صیاد ستم پیشہ نے کیا گل کترے ۔۔۔ دور سے جا کے چمن سے پر بلبل کترے

دل میں اک بوند تو رہنے دے لہو کی بیر ۔۔۔ چشم خونبار ابھرے ہاتھ سے مٹ خاک میں ہے

(بہارستان ناز، تذکرۃ النساء)

حجاب

نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم، نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے وزیر معتمد الدولہ کی پوتی اور داروغہ اعظم علی خاں کی بیٹی تھیں ۱۲۵۹ھ میں پیدا ہوئیں تھیں، بعض لوگوں نے ان کو واجد علی شاہ کے محلات میں شمار کیا ہے مگر یہ غلط ہے البتہ یہ واجد علی شاہ کی عزیز ضرور تھیں، آپ کا ایک دیوان "تحریر عشق" کے نام سے ۱۲۹۵ھ میں مطبع حسینی لکھنؤ میں چھپا ہے۔ شعر بڑے اچھے کہتی تھیں، سنہ ۱۳۰۳ھ تک زندہ تھیں۔

خفا ابھی سے نہ ہو مدعا سنو تو سہی ۔۔۔ قبول کرنا نہ کرنا بھلا سنو تو سہی

وہ خلق سے پیش آئے پہ تھی ان کی عنایت ۔۔۔ گردن کو جھکائے ہوئے ڈرتے گئے ہم تو

دامن محبوب تک پہنچا نہ جب دست جنوں ۔۔۔ بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف

کچھ خوف خدا کیجئے اس طرح نہ چلئے ۔۔۔ سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

رہے بتخانہ میں رسوا نہ کعبہ میں فورا ٹھہرے ۔۔۔ غرض تھی دل کو بہلانے سے جس جا دل لگا ٹھہرے

بن کے تصویر جو حجاب اس کو سراپا دیکھو ۔۔۔ منہ سے بولو نہ کچھ آنکھوں سے تماشا دیکھو

(رسالہ نگار لکھنؤ بابت اکتوبر ۱۹۲۹ء، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، حدیقۂ عشرت، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

دلہن

دلہن بیگم اور نواب بہو مشہور تھیں، نواب انتظام الدولہ بہادر کی دختر اور نواب آصف الدولہ بہادر والئ اودھ کی محل تھیں سنہ ۱۲۱۲ھ میں زندہ تھیں۔

بہار کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں ۔۔۔ مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا ۔۔۔ تری ہی راہ سے جاتا ہی قافلہ دل کا

ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں ۔۔۔ گل کے مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی ۔۔۔ عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

(تذکرۂ ہندی مصحفی، گلشن بیخار، تذکرۃ النساء، سخن شعرا، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، نغمۂ عندلیب)

رعنائی

ارہم بانی نام رعنائی تخلص اور قدسیہ بیگم اور ممتاز محل خطاب تھا، نہایت فہیم اور طرحدار تھیں، ابوالفتح محمد شاہ خلف شاہجہاں ابن بہادر شاہ ظفر شہنشاہ دہلی کی محل تھیں، شعر اچھے کہتی تھیں۔

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا ۔۔۔ کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

(ماہ درخشاں، تذکرۃ الخواتین، مخدرات تیموریہ حصہ اول، تذکرۃ النساء، بہارستان ناز)

سلطان

سلطان بیگم، نواب غازی الدین حیدر کے وزیر معتمد الدولہ کی صاحبزادی تھیں اور شعر بہت اچھے کہتی تھیں، بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ صاحب دیوان تھیں، واجد علی شاہ والئ اودھ کی قریبی عزیزہ تھیں۔

کب تک یہ تیرے ہجر کے صدمے اٹھائے دل ۔۔۔ ڈرتے ہیں کہ جان سے اپنی نہ جائے دل
تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا ۔۔۔ ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں تھامے ہوئے دل
سینہ اگر ہے داغوں سے معمور کیا ہوا ۔۔۔ خالی ہے تیرے واسطے عشرت سرائے دل

(حدیقۂ عشرت، بہارستان ناز، سخن شعرا، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں
عورت مرد کا مکالمہ)

سومی

خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں، غدر ۱۸۵۷ء میں شباب کا عالم تھا، غدر کے بعد بھی مدت تک زندہ تھیں، تذکرہ نویس ان کے اور حالات سے بے خبر ہیں، بعض تذکرہ نویسوں نے سومی اور عالم آرا بیگم نازک کو ایک ہی تصور کیا ہے مگر یہ غلط ہے یہ دونوں الگ الگ ہیں:

شور ہے اُس کی بے وفائی کا — بس نہیں چلتا کچھ رسائی کا
دامِ زلفِ سیاہ سے توبہ — نہ بنا ڈھب کوئی رہائی کا

(تذکرۃ الخواتین آسی، تذکرۃ النساء نادری)

شوخ

گنا بیگم نام اور شوخ تخلص کرتی تھیں، نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر نظام کی زوجہ تھیں، قمر الدین منت سے مشورہ کرتی تھیں، بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ علی قلی خاں شش انگشتی کی صاحبزادی تھیں، میر سوز اور سودا سے مشورۂ سخن کرتی تھیں، مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ قمر الدین منت ہی کی شاگرد تھیں کیونکہ میر منت عماد الملک کے رفیق اور مصاحب خاص تھے کہا جاتا ہے کہ گنا بیگم اس قدر نازک بدن تھیں کہ انہیں تولا گیا تو نو سو تولے وزن ٹھہرا، بدیہہ گوئی میں بڑا کمال تھا، ایک دفعہ عماد الملک نے شمع کو دیکھ کر کہا،

سر سے پاؤں تک سفیدی آگئی تس پر یہ حال
شمع سی ہم نے نہیں دیکھی کوئی بوڑھی چھنال

گنا بیگم نے فی البدیہہ یہ شعر کہا،

پردۂ فانوس میں کہتی ہے عصمت کو سنبھال
کاٹ لو اُس کی زباں جو شمع کو بولے چھنال

ایک دفعہ یہ نواب کے کمرہ میں ایسے وقت پہنچیں جبکہ وہ سو رہے تھے انہیں سوتا پاکر لوٹنے لگیں تو ان کے پاؤں کی چاپ سے نواب کی نیند ٹوٹی اور انہوں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا،

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے

بیگم نے فوراً کہا،

خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

بعض تذکرہ نویسوں مثلاً آسی صاحب وغیرہ نے آپ کے اور جینا بیگم کے شعر ملا دئے ہیں اور ایک ہی شعر آپ کے نام سے بھی لکھا ہے اور جینا بیگم کے نام سے بھی،

شمع کو چہرۂ دلدار سے کیا ہے نسبت — کیونکہ یہ ہے رخ خنداں وہ ہے روتی صورت

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا — ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا

اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسی کی — جس طرح مرے دل کو لگی چاہ کسی کی

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے — جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

لے اڑی طرز فغاں بلبل نالاں ہم سے — گل نے سیکھی روش چاک گریباں ہم سے

(تذکرۂ ہندی مصحفی، ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء بہارستان ناز)

شہزادی خالہ

گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ نواب عماد الملک کی خالہ بدر النسا بیگم جو محلات میں شہزادی خالہ کے نام سے مشہور تھیں شعر کہتی تھیں، مگر افسوس ہے کہ ان کا کلام کہیں نہیں ملا،

(رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء)

صدر

صدر محل خطاب اور صدر تخلص تھا جان عالم واجد علی شاہ کی ممتوعہ تھیں، مولف تذکرہ مشاہیر نسواں کا بیان ہے کہ "صاحب دیوان تھیں، ایک دیوان بادشاہ نامہ" اور ایک "گلدستہ یادگار ہے" مگر افسوس ہے کہ کہیں نہ آپ کا دیوان ہی مل سکا اور نہ گلدستہ، شعر نہایت اچھے کہتی تھیں ہمیں ایک ہی غزل ملی ہے مگر یہ ایک غزل ایک دیوان پر بھی بھاری ہے۔ جناب آسی نے اپنے تذکرۃ الخواتین میں تذکرۃ النساء سے ان کا حال نقل کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی سنہ وفات ۱۲۹۳ھ بھی لکھا ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ سنہ کہاں سے لیا ہے کیونکہ حسب عادت حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم یہ سنہ صحیح بھی ہے یا نہیں،

جوشِ جنوں میں رات دن جب سے رہا الگ الگ — میں ہوں جدا الگ الگ لوگ جدا الگ الگ
خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریض عشق کی — میں ہوں دوا سے دور اور مجھ سے دوا الگ الگ
حسرت آرزوئے وصل اور مصیبت فراق — سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب ادھر — منہ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پہ — چلیو خدا کے واسطے باد صبا الگ الگ

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، مشاہیر نسواں، ماہ درخشاں، بہارستان ناز، چمن انداز، تذکرۃ النساء، تذکرۃ الخواتین آسی)

صدیقہ

ہز ہائی نس نواب صاحب مانا ودر (کاٹھیاواڑ) کی والدہ بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہیں، افسوس ہے کہ آپ کے چند ہی نعتیہ شعر مل سکے،

گل نعت نبی سے ہیں بھرا کرتی ہوں اس کو — ہمیشہ کو ہرا بھرا رہے گا یہ چمن میرا
میں پروانہ صفت صدقے جو ہوں روئے محمد پہ — بھرا کرتی ہے دم ہر دم یہ شمع انجمن میرا
شب معراج خود اللہ نے سرور سے فرمایا — تجھی سے ہے بہاروں پر خدائی کا چمن میرا
ہمیشہ ذکر میلاد نبی سے شوق ہے مجھ کو — میں صدیقہ ہوں سچ کہتی ہوں ہے یہی چلن میرا

(رسالہ عصمت بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء)

ضرورت

شریف النساء بیگم، تیموریہ گھرانے کی شہزادی تھیں اور خاندان تیموریہ ہی کے مشہور شہزادے مرزا کوچک سے بیاہی گئی تھیں شعر بھی کہتی تھیں

سرسبز ہے باغ سدا دین نبی کا — کیا مدنی ہاشمی و مطلبی کا
مشکل ہو جو آسان دعا مانگ ضرورت — کر عرض کہ یہ وقت ہے حاجت طلبی کا

(تذکرۃ النساء، بہارستان ناز، رسالہ نشاط افزا)

عابدہ

امراؤ بیگم نام اور عابدہ تخلص تھا، نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروائے رام پور کی صاحبزادی اور نواب زین العابدین خاں بہادر کی محل تھیں، ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا، ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار باقی ہے۔

کشتہ ہیں اے لالہ رخ ہم رنگ گندم گوں کے جو — ہے شگون گندم کی بس کافی ہماری قبر پر

(ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں)

عالم

نواب بادشاہ محل بیگم صاحبہ متخلص بہ عالم آپ نواب علی نقی خاں بہادر ابن شرف الدولہ بہادر کی صاحبزادی اور نواب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی محل خاص تھیں، آپ کی شادی جان عالم سے ۱۲۵۳ھ میں ہوئی جبکہ جان عالم ولیعہد تھے، عالم نے شادی کے بعد خاص محل خطاب پایا اور جان عالم نے فرماں روائے اودھ ہونے کے بعد بادشاہ محل خطاب دیا، بعض تذکرہ نویسوں نے خاص محل اور بادشاہ محل دونوں کو الگ الگ سمجھ کر خاص محل کو واجد علی شاہ کی ایک اور محل عالم کے علاوہ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اشہری سے لے کر جناب آسی تک کو یہی مغالطہ ہوا ہے۔

عالم کو نہ صرف ذوق شعری تھا بلکہ وہ فن شعر پر خاصہ عبور رکھتی تھیں، غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن پر بھی قادر تھیں، چنانچہ ایک مثنوی جو طبع ہو چکی ہے اس کا زندہ ثبوت ہے۔ دیوان بھی طبع ہو چکا ہے۔ جس میں بڑے معرکہ کی غزلیں ہیں، آپ کے بطن سے نوشیرواں قدر اور کیواں قدر دو شہزادے تھے، آپ کو مرثیہ خوانی کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ جان عالم کے ساتھ جب کلکتہ گئیں تو روضہ خوانوں کو ساتھ لیتی گئیں۔

صبح کی میں نے کروٹیں لے کر — رات کو دل جو بے قرار ہوا

یاد رخ گیسو میں سدا ہم نے بسر کی — رو رو کے کبھی شام کی اور گاہ سحر کی

ہو جو بازار محبت کہیں سودا نقد — کھوٹے داموں کوئی یوسف کا خریدار نہ ہو

پھر شوق سے حضور سزا لیجئے گا بلا — ثابت کیا تو ہم نہ ہمارے قصور کو

گیسوئے خمدار اس کے رخ پہ بل کھانے لگے — سینۂ عشاق پر بس سانپ لہرانے لگے

اے باغباں چمن میں یہ کہہ دے پکار کے — لو بلبلو چلو کہ دن آئے بہار کے

عالم وہ طلبگار ترے ہونگے اسی دن — جب تازہ ستم کوئی بھی ایجاد کریں گے

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، تذکرۃ النساء، ماہ درخشاں، بہارستان ناز، شمیم سخن)

عشرت

عشرت محل خطاب اور عشرت تخلص کرتی تھیں، جان عالم کی ممتوعہ تھیں، شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا۔

گرمی عشق بار نشو و نما ہوئی — میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

شعلۂ عشق لگا آگ نہ دل میں میرے — یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی کافر کا نہیں

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں،

بہارستانِ ناز)

عصمت

ہر ہائی نس بیگم صاحبہ رام پور بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں، آپ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کی تعلیمیافتہ خاتون ہیں، نواب محمد حامد علی خاں بہادر مرحوم والیٔ رام پور نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنے ولیعہد نواب رضا علی خاں بہادر سے آپ کی شادی کی اور جون ۱۹۳۰ء سے بیگم صاحبہ رام پور کہلاتی ہیں، غزل بڑی اچھی کہتی ہیں، طبیعت میں شوخی اور روانی ہے،

کیا کیا صلے ملے ہیں قاتل کو پیار کر کے   دن کاٹتے ہیں رو کے سب انتظار کر کے
کہتے ہیں وعدہ کیسا اک یہ بھی دل لگی تھی   میں نے کہا تھا بیٹھو تم اعتبار کر کے
کس کو زمیں میں سونپا کس کی لحد بنائی   بیٹھے ہو گیسوؤں کو کیوں پُر غبار کر کے
ممنوں تمہارا ہو کر ممنون غیر کیوں ہو   جاؤ تو گل چراغ طاقِ مزار کر کے
کیونکر خیال و پاس اہل ہنر نہ رکھوں   بھیجی گئی ہوں عصمت میں تاجدار کر کے

چشم و جان و دل ہیں زخمی تیری تحریر سے   کے نشانے اڑ گئے جلاد کے اک تیر سے
جب تبسم جل چکا تب آئی گلشن میں گھٹا   پانی کے چھینٹے جگر پر پڑ رہے ہیں تیر سے
ہاتھ سیدھے لو کماں ہاں اک ادا اٹھ جائیگی   ورنہ چشم ناز کے کشتوں کو ڈر کیا تیر سے
ہاں ٹھہر اے موت آ آ کے ناواقف جذبات عشق   میں خدا حافظ تو کہہ لوں دوست کی تصویر سے
حشر میں کیونکر نہ ہو عصمت کا چہرہ آفتاب   نورِ رُخ کا بڑھ گیا خاکِ درِ شبیر سے

(رسالہ جوہر بابت دسمبر ۱۹۳۲ء، اخبار خادم کلکتہ اپریل ۱۹۳۳ء، رسالہ نظارہ اکتوبر ۱۹۳۳ء)

قدسیہ

قدسیہ سلطانہ اختر بیگم صاحبہ محل نواب اختر زماں خاں بہادر والیٔ باندہ۔ آپ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ ایک قطعۂ وفات کے چند شعر جو ہمیں مل سکے پیش کئے جاتے ہیں،

ہے یہ کس نونہال کا ماتم   رو رہی ہے یہ کس لئے شبنم
کس کی آوازِ گریہ آتی ہے   کس پہ ٹوٹا ہے کوہِ رنج و الم
صبر کہتا ہے دل سے ضبط کرو   ضبط کہتا ہے اشک سے تھم تھم
عقل کہتی ہے رنج سے حاصل   کوئی جا کر پھر آبھی ہے آدم

(رسالہ عصمت بابت فروری ۱۹۳۰ء)

قمر

حیدری بیگم نام اور ماہ طلعت بیگم خطاب تھا، شہزادۂ مرزا ہمایوں بخت کی دختر اور مرزا محبوب علی قوس کی بہن اور جان عالم واجد علی شاہ کی منکوحہ تھیں، مولف تذکرۃ النساء راوی ہے کہ جان عالم کے انتقال کے بعد قمر نے عبد الغفور نساخ سے عقدِ ثانی کیا تھا۔ ۱۳۰۸ھ میں فوت ہوئیں، عشقیہ شعر بڑے اچھے کہتی تھیں،

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا   بھول کر بیٹھے ہمیں پھر نہ کبھی یاد کیا

آنکھیں پتھرا کے ہو گئی ہیں سفید   کسی بت کی جو انتظاری ہے

لے گیا قیس پہ بھی فوق تمہارا وحشی   مر کے بھی دستِ جنوں سے نہ گریباں چھوٹا

ہوئی ہوں تشنۂ جامِ شراب اے ساقی   اٹھوں گی قبر سے میں بھی سبو سبو کرتی

(سخن شعرا، تذکرۃ النسا، ماہ درخشاں، بہارستانِ ناز، حدیقۂ عشرت، مشاہیر نسواں)

رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء)

کنیز

کنیز فاطمہ بیگم، نواب نصرت الدولہ بہادر کی چھوٹی صاحبزادی تھیں، پندرہ سال کے سن میں علوم ضروریہ کی تحصیل سے فارغ ہو کر شعر کہنے لگیں اور بیس برس کی عمر میں انتقال کیا، ان کے متعلق تذکرہ نویسوں کو اختلاف ہے، مولف ماہِ درخشاں کا خیال ہے کہ نصرت الدولہ کی کنیز تھیں، مولف چمن انداز اور مولفِ تذکرۃ النسا نے نصرت الدولہ کی چھوٹی بیٹی کی کنیز لکھا ہے، مگر مولفِ بہارستانِ ناز دعویٰ سے کہتے ہیں کہ یہ خاتون نصرت الدولہ کی صاحبزادی تھیں، ممکن ہے کہ ان کے نام کے جزو کنیز کی وجہ سے اِن تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہو، بہر حال شعر خوب کہتی تھیں،

نقاش نے اُس بت کا مرے نقش جو کھینچا   ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ وہ ہاتھ کو کھینچا

جلتے بھی ہو پری رو تم کیا کرتے ہو کیا؟   مارتے ہو زندہ کرتے ہو، قیامت کرتے ہو

وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں جو نانسے   جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائیگی

ماہِ درخشاں، تذکرۃ النسا، چمن انداز، بہارستانِ ناز)

کیفی

تیموریہ گھرانے کی شہزادی تھیں، یہ بھی عجیب بات ہے کہ اکثر تیموری

شہزادیوں نے قدسی کی غزل کو خمسہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ کا بھی ایک خمسہ ملاحظہ فرمائیے جس کے چند بند یہ ہیں۔

کس کا منہ ہے جو کرے مدح تری میرے نبی — نعت اطہر میں ہو جب شخص ذکی محض غبی
حبذا ذات تری مایۂ حاجت طلبی — مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

نور تھا تیرا وہاں نور حقیقت سے بہم — دیکھ کر موسیٰ عمراں ہوئے غش شاہ امم
نور مہر رخ تاباں پہ ہے کیا ہی عالم — من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

درد عصیاں سے ہے بیتاب نہایت کبنی — حکمت لطف سے اس درد کے تم ہو ساقی
عازم درگہہ قدسی ہے نشاں قدسی — سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

(حدیث قدسی، تذکرۃ النساء)

محبوب

نام معلوم نہ ہو سکا، واجد علی شاہ کے محل کی زینت ہوئیں تو محبوب محل خطاب پایا، منکوحہ تھیں، شعر کا ذوق فطری تھا خوب کہتی تھیں۔

اٹھا سکی نہ مصیبت فراق یار میں روح — نکل گئی تن لاغر سے انتظار میں روح
جو آنا ہو تجھے مدنظر تو آ ظالم — نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح
نہ نکلی حسرت دل ایک بھی کہ موت آئی — ہمیشہ تڑپے گی تیرے لئے مزار میں روح

(رسالہ عالمگیر عید قربان نمبر ۱۹۳۵ء، تذکرۃ النساء، سخن شعرا، ماہ درخشاں، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، نشاط افزا)

مخفی

نواب سلطان جہاں بیگم نام اور مخفی تخلص تھا، صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر ابن مرزا اکرم بخت ابن مرزا خورد نبیرۂ ظفر بن جہاں دار شاہ بادشاہ دہلی کی محل خاص تھیں، مرزا صابر کا ایک تذکرہ گلستان سخن بہت مشہور ہے ۱۲۷۱ھ کے بیس و پیش زندہ تھیں آپ شعر نہایت اچھے کہتی تھیں خصوصاً غزل گوئی میں بڑا اچھا ملکہ تھا، یوں تو آپ کے سبھی شعر اچھے ہیں مگر ایک بڑے غضب کا کہا ہے جو ایک دیوان پر بھاری ہے ؎

کوئی اُن کی شوخی تو دیکھنا، لئے زلف خم شدہ ہاتھ میں
مرے پاس آکے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

اس میں آپ نے اپنے مطلوب کی شوخی اور شرارت کی تصویر کھینچی ہے کہ وہ زلف خم شدہ ہاتھ میں لے کر پیچھے سے دبے دبے آکر چہرے کے پاس خم شدہ زلف کو لٹکا دیتا اور سانپ کہہ کر ڈراتا ہے۔ زلف کو یوں بھی سانپ کہا جاتا ہے اور سانپ سے سبھی ڈرتے ہیں، اور عورتوں کی تو اس کے نام سے روح فنا ہوتی ہے۔ اس پورے قصے کو صرف ایک شعر میں اس عمدگی سے ادا کیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی،

لُٹا گئی مے کہ ہیں خفتگان خاک ثرا — قسم خدا کی عس کو بڑا ثواب ہوا!

خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی — کہ اس ظلم پر جی کو بھاتا بہت ہے

(کارنامہ سروری، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

ناز

عالم آرا بیگم المتخلص بہ ناز (خاندان تیموریہ کی شہزادی اور رند مذہب امامیہ کی پیرو تھیں، تذکرۃ النساء نادری کے ترتیب کے وقت زندہ تھیں مولف تذکرۃ الخواتین نے حالات اور کلام کا نمونہ تذکرۃ النساء نادری سے لیا ہے۔ مگر وہی شعر جو سوسی کے نام سے لکھے جا چکے ہیں ان کے نام سے بھی لکھ دیئے ہیں یہ اپچ ہے ہمارے تذکرہ نویسوں کی، مولف تذکرۃ النساء کو بھی یہی شک ہوا ہے کہ ناز اور سوسی ایک ہی ہیں۔

مجھ سے روٹھا وہ یار جانی ہے — جان جانے کی یہ نشانی ہے

کر غلامی علی کی تو اے ناز — ہے اگر دھیان بادشاہی کا

(ماہ درخشاں، تذکرۃ النساء، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز، تذکرۃ الخواتین (آسی))

ولائتی

ولائتی بیگم، خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں، آپ نے ایک غدری ہولی کہی ہے جو بہت مشہور ہے

چودہ کا وہ سال، مہینہ ماہ کا اس لیکھائی — روز جمعہ کا تھا درج تھی ولائتی بیگم نے ہولی گائی
کری دونوں کی بُرائی — ہند میں کیسی ہوری مچائی

(تذکرۃ النساء)

یاد

خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں، مولف تذکرۃ النساء کے کسی دوست سے مشورہ کرتی تھیں، جنھوں نے ان کی وفات کی تاریخ کہی ہے جس سے ۱۲۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔

لحد میں یاد نے جب منہ چھپایا — رہا ہے کثرت غم سے کسے ہوش
کہو تاریخ اس کی کون کہوے! — ہوئی جو یاد اب از خود فراموش

یاؔد نے یہ قطعہ نزع کے عالم میں کہا تھا اور حق یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

عبث فکرِ درماں ہے اے اقربا! کہ اب یاؔد تو یاں سے چلنے کو ہے
سر انجام غسل و کفن کر رکھو تنِ زار سے جاں نکلنے کو ہے

(ماہِ درخشاں، تذکرۃ النسا، مشاہیر نسواں، بہارستان ناز)

آپ نے جن شہزادیوں کے کلام اور حالات کا مطالعہ کیا وہ سب کی سب نری شہزادیاں یعنی بادشاہوں کی بیٹیاں نہیں ہیں مگر ان میں سے بعض بادشاہوں کی بیٹیاں، پوتیاں ہیں اور بعض بادشاہوں اور شہزادوں کی محلات اور بعض ان کی اقربا ہیں اس طرح جن خواتین کے حالات فراہم کئے گئے ہیں یہ سب کسی نہ کسی طرح محلات شاہی سے متعلق ضرور ہیں۔

تذکرہ نویسوں نے بڑی بڑی ستم ظریفیاں کی ہیں کسی نے ایک ہی شعر دو خواتین سے منسوب کر دیا ہے کسی نے تخلص ایک خاتون کا اور نام ایک خاتون کا ملا کر دونوں خواتین کے شعر یک جا لکھ دئے ہیں، غرض اس قسم کی بوالعجبیوں سے اردو شعر کہنے والی عورتوں کے تذکرے بھرے ہیں ہم نے جہاں تک ہو سکا احتیاط سے حالات فراہم کئے ہیں اور غور و فکر کے بعد ایک دوسری خواتین کے اشعار بھی الگ کر دئے... ہیں مگر ممکن ہے پھر بھی کچھ نہ کچھ خامی رہ گئی ہو کیونکہ تحقیقات کا حال تو یہ ہے کہ آج جو مواد فراہم ہوا کل اس کے خلاف مواد دستیاب ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ایک سطحی خاکہ ہے جو پیش کیا جا رہا ہے اور اپنی نوعیت کا بالکل پہلا مقالہ ہے جو معرض طبع میں آ رہا ہے

اس مواد میں آپ کو بعض خواتین کے ایسے اشعار ملیں گے جو بہترین اور عمدہ کہلانے کے مستحق ہیں بعض ایسی محترم خواتین جو گاہے ماہے فکر شعر فرماتی ہیں ایسے عمدہ اور اچھے شعر کہتی ہیں کہ بڑے بڑے شاعروں کے اشعار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں، حضرتہ بیگم صاحبہ دکن ہی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اُن کو عہدِ وفا کی لاج نہیں درد دل کا کوئی علاج نہیں
دو ہی دن میں بدل گیا نقشہ کل جو تھا لطف مجھ پہ آج نہیں
درد دینے لگا مزا دل کو اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

مطلع کس قدر جذبات میں ڈوبا ہوا ہے اسی طرح دوسرا شعر اختلافِ مزاج کی کتنی اچھی تصویر پیش کر رہا ہے۔ تیسرا شعر غالبؔ کے اس خیال ع رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج کی کتنی عمدہ شرح ہے۔

اس کے بعد بیگم صاحبہ رام پور کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔

ہاں ٹھہرا اے موت! اے ناواقفِ جذباتِ عشق!!
میں خدا حافظ تو کہہ لوں دوست کی تصویر سے!

کتنا پاکیزہ خیال ہے۔ شہزادی اختؔر تیموریہ کا خمسہ حضرتِ قدسیؔ کی غزل پر کتنا مقبول اور بے ساختہ ہے، اس خمسہ کے علاوہ بھی جو شعر کہے ہیں کس قدر ڈوبے ہوئے ہیں، خصوصًا

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا اُن کا تھا کھیل خاک میں مجھ کو ملا دیا!

یا اسیرؔ کا یہ شعر

عشق دار و مدار ہے اپنا بے قراری قرار ہے اپنا

نواب ہوسؔ نیشاپوری کی صاحبزادی پارساؔ کا یہ شعر پڑھئے اور سر دھنتے جائیے۔

تن صورتِ حباب بنا اور بگڑ گیا یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا

تاجورؔ مغفور بیگم صاحبہ بھوپال کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے۔

تاجور چشمِ اہلِ الفت میں کچھ فقیری سے بڑھ کے راج نہیں

پارساؔ کی چھوٹی بہن حیاؔ کا یہ شعر کس غضب کا ہے۔

آج صیادِ ستم پیشہ نے کیا گل کترے دُور سے جا کے چمن سے پر بلبل کترے

شہزادی قدسیہ بیگم رعناؔئی کا یہ شعر کس کیفیت کا ہے۔

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

صدر محل بیگم صدؔر کی مرصع غزل کے یہ شعر پڑھئے،

حسرتِ آرزوئے وصل و مصیبتِ فراق سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر چلیو خدا کے واسطے بادِ صبا الگ الگ

عشرت محل عشرؔت کا یہ فلسفیانہ شعر غور سے پڑھئے

گرمیٔ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

صاحبِ عالم مرزا صابر بخش کی محل مخفؔی کا یہ شعر ایک استاد کے دیوان پر بھاری ہے۔

کوئی ان کی شوخی تو دیکھنا لئے زلفِ خم شدہ ہاتھ میں
مرے پاس آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

غرض اس گلشن سدا بہار کی سیر سے آپ خود حظ اٹھائیے ان خواتین نے گلستانِ شاعری میں وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

تسکینِ عابدی

تجلّیات

(۱)

دل کو میں حسن سے تو بہلاؤں
اور اگر جان سے چلا جاؤں!
رفعتِ چرخ کو سمجھ لوں گا
اک ذرا سطح تک اُبھر آؤں
تُو جہاں اے خیال رہتا ہے
کاش میں بھی وہیں پہنچ جاؤں
ہو گیا عیش سے بھی جی بیزار
ہائے اب کیا کروں کہاں جاؤں

میرے اشعار ایسے ہیں اختر!
کہ میں جادو نگار کہلاؤں

(۲)

حُسن کو بے نقاب دیکھا ہے
میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے
اپنے ایک ایک سانس میں میں نے
عمر بھر کا عذاب دیکھا ہے
زندگی کی ہر ایک کروٹ میں
اک نیا انقلاب دیکھا ہے
میری نظروں میں کیا جچے اب غم
میں نے اس کا شباب دیکھا ہے

دل کے آئینے میں کبھی اختر
خود کو بھی بے حجاب دیکھا ہے

اختر انصاری

دو مسئلے

رحم

مسجد کا حجرہ۔ شام سے کچھ پہلے

(مولوی صاحب مصلّے پر گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں، ہاتھ میں ایک لمبی تسبیح ہے اُن کے قریب اُنکا لڑکا (عمر دس سال) بیٹھا ہوا مٹھائی کھانے میں مصروف ہے ایک شخص حجرے میں داخل ہوتا ہے جو مسجد سے متصل ایک دکان میں کرایہ دار ہے)

کرایہ دار۔ مولوی صاحب! اجازت ہے؟

(ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

مولوی صاحب۔ (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کسی قدر درشت لہجے میں) تم کیوں آئے ہو؟

کرایہ دار۔ آپ نے میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے، میں تو . . .

مولوی صاحب۔ (بات کاٹ کر) مقدمہ دائر نہ کرتا تو کیا کرتا، تم ایسے کرایہ کب دینے لگے؟

کرایہ دار۔ جناب مجھے کرایہ دینے سے تو انکار نہیں، آج تک باقاعدہ دیتا رہا ہوں، کبھی ایک کوڑی نہیں رکھی،

مولوی صاحب۔ دو مہینے سے تو ایک پیسہ نہیں دیا، اور اگر پہلے دیتے رہے ہو تو کیا مجھ پر احسان کرتے رہے ہو!

(تسبیح زور سے پھیرنے لگتا ہے)

کرایہ دار۔ نہیں جناب احسان کی تو کوئی بات نہیں۔

مولوی صاحب۔ تو پھر اس بکواس سے فایدہ؟

کرایہ دار۔ آپ ناراض نہ ہوں، میں نے کوئی گستاخی کی بات تو نہیں کی، صرف اتنا عرض کیا تھا کہ پہلے بھی کرایہ دیتا رہا ہوں، اب بھی دے دوں گا،

مولوی صاحب۔ تو دیتے کیوں نہیں؟ دینے کا ارادہ بھی ہو!

کرایہ دار۔ (ہاتھ باندھ کر) چند روز اور انتظار کیجئے، میں کوڑی کوڑی چکا دوں گا، گھر میں بیماری کی مصیبت نہ ہوتی تو کبھی یہ نوبت نہ آتی، مہینے بھر سے میرے دونوں بچے بیمار پڑے سسک رہے ہیں، ایک گھڑی بھی آرام نصیب نہیں، کاروبار بھی نہیں کر سکتا۔ کئی دن سے دکان بھی بند ہے، آپ میری حالت پر رحم کریں۔

مولوی صاحب۔ بچے بیمار ہیں تو میں کیا کروں! علاج کراؤ، اور یہ بیماری تو ایک بہانہ ہے کرایہ نہ دینے کا، ابھی کل کہتے تھے میری بیوی بیمار ہے، آج کہتے ہو بچے بیمار ہیں کل آؤ گے تو کسی اور کی بیماری کا بہانہ کرو گے، تمہارا تو یہی دستور ہو گیا ہے۔

کرایہ دار۔ جناب ایوں ہی بیمار کون بنتا ہے! جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ الگ بات ہے غریب نادار ہوں شرافت اور غیرت کا مارا آپ کی منت سماجت کر رہا ہوں، میرا ترس کیجئے، آپ کے بال بچوں کو دعائیں دوں گا۔ (آبدیدہ ہو جاتا ہے)

مولوی صاحب۔ تم بڑے غیرت مند ہو تو کرایہ ادا کر دو، اول تو اب یہ بات کرنا ہی فضول ہے، عدالت خود ہی وصول کرے گی، مجھ سے رحم کی درخواست کے کیا معنی؟ جج کے بچوں کو دعائیں دو، وہ تمہیں چھوڑ دے تو چھوڑ دے میں تو نہیں چھوڑ سکتا

کرایہ دار۔ مولوی [illegible] بال بچوں والا ہوں میری حالت پر رحم کیجئے

(لڑکا بڑے [illegible] گھبرایا ہوا باپ کی طرف دیکھتا ہے)

مولوی صاحب۔ رحم، رحم، پکارنے سے آخر فائدہ؟ ایک دفعہ کہہ جو دیا ہے، میرا وقت ضائع نہ کرو، جاؤ۔ (وظیفہ میں مصروف ہو جاتا ہے)

کرایہ دار (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مایوسی کے انداز میں) جناب چلا جاؤں؟

مولوی صاحب۔ ہاں جاؤ

کرایہ دار۔ آپ مقدمہ واپس نہیں لے سکتے؟

مولوی صاحب۔ نہیں،

(کرایہ دار سخت غمگین ہو کر باہر نکل جاتا ہے)

لڑکا۔ ابا جان!

مولوی صاحب۔ خاموش رہو بیٹا،

لڑکا (قریب آ کر بیٹھ جاتا ہے) ابا جان! آپ نے صبح سبق پڑھاتے وقت کہا تھا رحم کرنا بڑا اچھا ہے۔

مولوی صاحب۔ صبح؟ ہاں کہا تھا

لڑکا۔ آپ نے کہا تھا کہ غریبوں پر رحم کریں تو اللہ میاں خوش ہوتے ہیں

مولوی صاحب۔ ہاں اللہ میاں بہت خوش ہوتے ہیں

لڑکا۔ تو آپ نے اس شخص پر رحم کیوں نہیں کیا؟

مولوی صاحب۔ رحم غریبوں پر کرنا چاہئے۔

لڑکا۔ یہ بے چارہ بھی غریب ہے۔

مولوی صاحب۔ نہیں یہ غریب نہیں،

لڑکا۔ وہ تو کہتا تھا میں بہت غریب ہوں

مولوی صاحب۔ جھوٹ بکتا ہے،

لڑکا۔ تو غریب کون ہوتا ہے؟

مولوی صاحب۔ جب تم بڑے ہو گے تو جان لو گے، اور دیکھو تمہیں کہا جائے مان لیا کرو، زیادہ باتیں نہ بنایا کرو، جاؤ اب امی جان سے جا کر پوچھو، ابا جان کہتے ہیں کھانا تیار ہے؟

تعلیم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

مکان کا کمرہ

استاد (عمر ۴۰ سال)۔ شاگرد (گیارہ سال کا لڑکا)

[illegible] ایک کتاب کھلی پڑی ہے۔

لڑکا۔ ماسٹر جی! اس کا مطلب ہے کہ اکبر بادشاہ ان پڑھ تھا۔

استاد۔ ہاں، بالکل ان پڑھ، جاہل،

لڑکا۔ تو کیا وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا؟

استاد۔ نہیں، کچھ بھی نہیں، کہتے ہیں، ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کا ایلچی خط لے کر اس کے دربار میں آیا، اکبر نے خط کو الٹا پکڑ کر دیکھنا شروع کیا، اس پر وہ ایلچی بہت حیران ہوا اور درباری بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکے۔

لڑکا۔ وہ اتنا ہی ان پڑھ تھا تو بادشاہ کیسے بن گیا؟

استاد۔ بادشاہ کیسے بن گیا؟ وہ بڑا بہادر اور دانا تھا، اس نے تھوڑے ہی عرصے میں بڑے بڑے علاقے فتح کر لئے، سلطنت کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کیا، راجپوتوں کی قوم بڑی طاقتور تھی، ان سے رشتے ناتے جوڑ کر انہیں بھی مطیع بنا لیا،

لڑکا۔ لوگ اس کی بات کیسے مانتے تھے؟ کیا وہ بڑا ہی دانا تھا؟

استاد۔ ہاں، بڑا دانا، اس کے دربار میں بڑے بڑے شاعر، فلسفی اور عالم فاضل لوگ موجود تھے، وہ نورتن کہلاتے تھے، یہ درباری امیر جب جمع ہوتے تو بڑے بحث مباحثے کرتے، بادشاہ بھی ان کی مجلس میں شریک ہوتا اور ہر مسئلہ پر گفتگو کرتا،

لڑکا۔ اگر وہ ان پڑھ تھا تو ایسے پڑھے لکھے لوگوں سے بحث کیسے کر سکتا تھا؟

استاد۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ دانا بہت تھا۔

لڑکا۔ لیکن، ماسٹر جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی ان پڑھ ہو اور پھر دانا بھی ہو؟

استاد۔ تم عجب بے وقوف لڑکے ہو، تمہیں ابھی سمجھایا ہے اور تم نے کتاب میں بھی پڑھا ہے، پھر پوچھتے ہو۔

(لڑکا ندامت اور تعجب سے کبھی کتاب کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی استاد کا منہ تکتا ہے)

ایران کی جدید شاعری

ادبیات کا تعلق قوموں کی زندگی کے ساتھ اس قدر گہرا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ادبیات ہر ملتے کاشفِ احساسات آں ملت ست" مشہور ہے۔ قوموں کے دورانِ حیات میں جتنے انقلاب آزیں واقعات گزرتے ہیں ان سے شاعری ضرور متأثر ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان کی شاعری مختلف زمانوں میں جدا جدا رنگ رکھتی ہے۔ ایرانی شاعری پر بھی اس کے دورانِ حیات میں موافق اور مخالف واقعات گزرتے رہے۔ اور اس انقلاب کی وجہ سے ایرانی شاعری اور ادب کا معیار گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔

جدید شاعرانہ احساس کے بیدار ہونے سے پہلے ایرانی شاعری کی جو کچھ عام حالت تھی۔ وہ چند فطری اسباب کے تابع تھی۔ ان میں سے اکثر اسباب سیاسی اور بعض معاشرتی ہیں۔ عربوں نے جب ایران پر تسلط کیا تو ان کی ہر چیز پر عربی رنگ چڑھنے لگا۔ چنانچہ فارسی شاعری نے عربی شاعری کے زیرِ اثر نشو و نما پائی جس کا اعتراف خود عجمیوں کو ہے ؎

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود اوّلِ شاں امرأالقیس آخرِ شاں بو فراس

(انوری)

عرب کی شاعری ابتدائً نیچرل شاعری تھی جس میں سچے جوش اور فطری جذبات کا خاکہ ہوتا تھا۔ فارس نے جب عرب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ غلامانہ تملق اور خوشامدانہ جذبے نے شاعری کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ اور اس فنِ لطیف کا دائرہ زیادہ تر مدحیہ اور عشقیہ مضامین ہی میں محدود ہو گیا۔ شاگرد ذہین اور طباع تھا۔ اس غیر فطری شاعری کے میدان میں استاد سے آگے بڑھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری چند مضامین کی تاریک وادی میں پھنس کر رہ گئی۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ جدید شاعری سے کس دور کی شاعری مراد ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر فارسی شاعری کے مختلف دوروں پر ڈالی جائے۔ انقلابی شاعری سے پیشتر عہد کی شاعری حسبِ ذیل دوروں پر منقسم کی جاسکتی ہے:۔

پہلا دور قبل از اسلام اور دوسرا دور بعد از اسلام۔ پہلا دور تقریباً قدیم ترین ازمنہ تاریخی سے پانچویں صدی میلادی تک۔ اور دوسرا دور غالباً اس کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس میں دورِ انحطاط کو نکال کر اس دور کی شاعری کی ذیلی تقسیم اس طور پر ہو سکتی ہے:۔

(۱) سنہ ۹۰۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ء تک یعنی رودکی۔ اسدی عنصری اور فردوسی وغیرہ کا زمانہ۔ یہ دور چونکہ تمدن اور شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا اس لئے زبان سادہ تکلف اور مبالغہ سے خالی۔ فطری تشبیہیں اور استعارے بہت قریب کے ہیں۔ اس دور کی مشہور تصنیف شاہنامہ ہے۔

(۲) سنہ ۱۱۰۰ء سے سنہ ۱۲۵۰ء تک یعنی خاقانی۔ انوری۔ نظامی ظہیر فاریابی وغیرہ کا زمانہ۔ اس دور میں ایران نے عربی مدرسہ میں علوم معانی بیان اور رموز فصاحت و بلاغت کی تعلیم حاصل کر لی۔ تمدن اور تنعم نے بھی ترقی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استعارات پیچیدہ اور دور از کار تشبیہات کی بھرمار ہو گئی۔ اس دور کی مایۂ ناز تصنیف سکندر نامہ ہے۔ شاہنامہ اور سکندر نامہ کے طرزِ بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اوّل الذکر میں شاہدِ زبان حسن ذاتی کے ساتھ سادہ۔ مگر دلکش پیرایہ میں جلوہ افروز ہے۔ بخلاف اس کے موخر الذکر استعارات کے لباس فاخرہ اور تشبیہات کے بیش بہا زیورات سے آراستہ ہے۔ اسی طرح قصائد میں بھی نمایاں فرق ہے۔

(۳) سنہ ۱۳۵۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک یعنی سلمان۔ سعدی۔ خواجہ حافظ وغیرہ کا زمانہ اس دور میں شاعری میں رد عمل ہوا۔ دوسرے دور کی پر تکلف اور مصنوعی شاعری سے لوگوں کی طبیعتیں اکتا گئی تھیں۔ اب پھر سلاست

زبان لطافتِ الفاظ اور جذبات کی تصویر کشی کی طرف توجہ کی گئی لایعنی تکلفات سے احتراز کیا گیا۔ سعدی اور حافظ اس انقلاب کے روحِ رواں ہیں۔

۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک یعنی عرفی۔ ظہوری، اسیر، نظیری۔ بیدل وغیرہ کا زمانہ۔ اس دور میں جب شعرا نے دیکھا کہ شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہو گیا ہے اور ان کے لئے کوئی چیز باقی نہیں رہی تشبیہات اور استعارات کا سرمایہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنا کمال اسی میں سمجھا کہ استعارہ کو استعارہ در استعارہ اور مجاز کو مجاز در مجاز بنا کر خراجِ تحسین لیں جلال، اسیر۔ بیدل۔ ظہوری وغیرہ اسی میدان کے مرد ہیں۔

(۵) یہ دور ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پھر ردِ عمل ہوا۔ زبان کی سلاست اور بندش کی سادگی کا دور دورہ قائم ہوا۔ یہی دور ہے جس کو انقلابی شاعری کا پیش خیمہ یا عصرِ اصلاح کہا جا سکتا ہے۔ اور جدید شاعری کا ابتدائی زمانہ یہی ہے جس کا علم بردار قاآنی ہے۔ اس نے استعارہ در استعارہ اور مجاز در مجاز کی بدعت کو ترک کر کے دورِ ثالث کا رنگ اختیار کیا۔ سلاست اور روانی کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ مگر درحقیقت عصرِ حاضر کی شاعری کے جس کو جدید شاعری یا انقلابی شاعری کہا جاتا ہے، خط و خال اس کے کلام میں بھی نمایاں نہیں۔

جدید شاعری کی ذیلی قسمیں بتانے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی امتیازی خصوصیات پر سرسری نظر ڈالی جائے۔

۱۔ زبان صاف اور سلیس۔ بندش بالکل سادہ اور سہل ہوتی ہے۔ اشرف الدین رشتی کی ایک قومی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اسلام رفت غیرتِ اسلامیاں چہ شد　　　ناموس رفت ہمتِ ایرانیاں چہ شد
دستِ بلند تا در گیتی ستاں چہ شد　　　اے تیرہ بخت دست زپیکر جدا وطن
بیکس وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

آخری مصرع کتنا سیدھا سادہ اور صاف ہے۔ مگر کس قدر مؤثر۔

ڈاکٹر محمود خاں افشار کی ایک نظم "شبِ مہتاب" کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شبے از نورِ مہ چوں روز روشن　　　فروزندہ مہے گستردہ خرمن
تو گفتی آسماں طاقے بلند است　　　چراغِ مہ بداں طاق است آدن
و یا مانند آتیا نوس آرام　　　مہ تاباں بسانِ پرتو افگن

زبان کس قدر سلیس ہے اور تشبیہات بہت قریب کی مگر کس قدر موزوں اور جاذب۔

۲۔ زبان کی توسیع کو مدِ نظر رکھ کر خارجی زبانوں کے صدہا الفاظ مفرس کر کے یا یوں ہی استعمال کر دئیے ہیں ؎

دربفت آسمانم الا یک ستارہ نیست　　　نامے زمن بہ پرسنل[1] ایں ادارہ نیست
بے اعتنا بہیئتِ کابینۂ[2] فلک　　　گردیدہ ام کہ پارتی[3] ام یک ستارہ نیست
(میر محمد رضا عشقی)

یا مثلاً فرخی یزدی کے ایک مسمط سے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اے دموکراتی[4] بتِ با شرفِ نوع پرست　　　کہ طرفداری ما رنجبراں خوئے تو نیست

چند شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

روز و شب از عشق جہت تو بہ سلسل در نوا　　　چوں کبوتر صف زدہ ایرو پلا[5] نہا در ہوا

یورپی الفاظ خصوصاً فرانسیسی زبان اور اس کے مصطلحات کثرت سے ایرانی ادبیات میں داخل ہو گئے ہیں کہیں کہیں تو ان کی ایسی بھرمار ہوئی ہے کہ زبانِ قدیم کے قدردانوں کو ایران کی جدید شاعری کچھ سے کچھ نظر آئے گی۔ مرزا ایرج کی ایک نظم ملاحظہ ہو ؎

بسکہ در لیور[6] و ہنگام لتہ[7]　　　دوسیہ[8] کردم و کارتن[9] ترتہ[10]
بسکہ نت[11] دادم و انکت[12] کردم　　　اشتباہ بروت[13] دقت کردم
سوزن ارودم دسنجاق زدم　　　پونز[14] و پنس[15] با وراق زدم
ہی تپاندم دو سیہ لائی شمیز[16]　　　ہی نشستم بمناعت پس میز
ہی پاراف[17] ہشتم و امضا کردم　　　خاطر مدعی ارضا کردم
گاہ بازنگ زمانے باہو　　　پیش خدمت طلبیدم بہ بورو[18]
تو بمیری ز آمور[19] افتادم　　　از شرو شور دشعور افتادم
چکنم زانہمہ شیفر[20] و نومرو[21]　　　نیست در دست مرا غیر زرو[22]
ہی بدہ کارتن و بستاں روسیہ　　　ہی بیار از در دکان نسیہ

---

[1] PERSONAL
[2] CABINATE
[3] PARTY
[4] DEMOCRAT
[5] ہوائی جہاز
[6] L. LIUER جاڑا
[7] LETE گرمی
[8] DOSSIER فائل
[9] CORTONE بڑا فائل
[10] TRAITE مرتب کرنا
[11] NOTE یادداشت
[12] INQUETE تفتیش کرنا۔
[13] BRUT خادم
[14] PUANISE آپسن
[15] PINCE کلپ
[16] CHEMISE لفافہ
[17] PARAPHE (INITIAL) چھوٹا دستخط
[18] BUREAU دفتر
[19] AMOUR عشق
[20] CHIFFER عدد
[21] NUMERO نمبر
[22] ZERO صفر

اس کے علاوہ اس قسم کے دوسرے الفاظ نئے قالب میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں مثلاً خطِ آہن (لوہے کی پٹری) جوانانِ نظامی (پولیس کے نوجوان) حکومتِ مشروطہ، عصرِ مشعشع (دورِ تمدن) دوچرخہ (بائسکل) وغیرہ وغیرہ

۳۔ جملہ اصنافِ نظم میں مسمط کا رواج بہت زیادہ ہے خصوصاً مخمس ہر بند کے پہلے تین مصرعے ایک قافیہ میں ہوتے ہیں اور یہ قافیہ ہر بند میں بدلتا رہتا ہے چوتھے اور پانچویں مصرع کا قافیہ اول سے آخر تک ایک ہی رہتا ہے مخمس کو عملی جامہ درحقیقت قاآنی نے پہنایا لیکن اس کے مخمس پرانے طرز کے ہوتے ہیں۔ آج کل کے مخمس کا طرز یہ ہے ؎

از چیست چنیں بیچارہ شدیم   کوتہ دست و غم خوارہ شدیم
از خانۂ خود آوارہ شدیم   نادیدہ چو ماکس در بدری
اے خو حق مددی مولا نظری

(پور داؤد)

مسمط کے بعد مستزاد کا نمبر ہے۔ قدیم شاعری میں اس کا رنگ رباعی کے ساتھ مخصوص تھا مگر اب عام ہے۔ اس دور میں مستزاد کی ایک صورت "مستزاد در مستزاد" ہوگئی ہے ؎

اے وطن پرور ایرانی با مسلک و ہوش   ہاں مکن جوش و خروش
پندہائے من با تجربہ بنمائے بگوش   گر توئی پند نیوش
اجنبی گر بشکل سید بدہت ساغر نوش   نوش نیش است منوش
در پئی خستن اند بہر اوقات بکوش   تا تواں واری و توش
کہ عدو دوست نگردد بخدا گر بنی ست   اجنبی اجنبی ست
من سرگشتہ چو پرکار جہاں گردیدم   رنج ہا بکشیدم
پا برہنہ رہِ دشت و درہ را بریدم   دستِ غم بگزیدم
حالِ ملتِ عثمانی وز من دیدم   خوب و بد بشنیدم
باز برگشتہ ز ازاجنبیاں نوسیدم   حالیا فہمیدم
کہ اگر شیخ خورد گول اجانب صبی ست   اجنبی اجنبی ست

(فرخی یزدی)

(۴) عروض میں یورپی شاعری کا تتبع ہو رہا ہے۔ ایک ہی نظم میں قافیہ اور ردیف کا بدل دینا تو عام ہو رہا ہے۔ مگر ایک ہی بند میں بحر کا بدل دینا بھی رواج پذیر ہو رہا ہے ؎

بخواب اے دختر زیبا   بالالام لائے لائے   لالام لائے لائے
میان محمل دیبا   بالالام لائے لائے   لالالام لائے لائے
دو چشمانت بہ بند امشب   بروئے من مخند امشب   بالالام للائے   لالالام للائے
کہ سے بینی گزند امشب   بالالام لائے لائے   لالالام لائے لائے
مساجد گشتہ ویرانہ   معابد گشتہ میخانہ   وطن پرشد ز بیگانہ
بالالام لائے لائے   لالام لائے لائے   بخواب ای دختر شیرین ستم آمد ہمہ گیر
بالالام لائے لائے   لالالام لائے لائے
ببے خبری در پیش طہران   مرا خشکیدہ بین پستان
تو بے شیری و من بے نان   بالالام للائے   لالالام للائے

اس نظم میں تمام مصرعے ایک بحر میں ہیں لیکن لالام لائے الخ دوسری بحر میں ہے۔

(۵) فارسی قدیم میں اگرچہ طنزیات کی کمی نہ تھی لیکن یورپی طرز کے ستائر (SATIRE) کا مخصوص رنگ عہدِ حاضر ہی کی ایجاد ہے۔ اس قسم کی نظمیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ اشرف الدین رشتی کی نظم "خطاب بفرنگیان" اس صنف کی بہترین نظم ہے ؎

اے فرنگی ما مسلمانیم جنت مال ماست   در قناعت حور و غلمان ناز و نعمت مال ماست
اے فرنگی اتفاق و علم و صنعت مال تو   سل و قانون و مساوات و عدالت مال تو
نقل و عالمگیری و جنگ و جلادت مال تو   حرص و بخل و کینہ و بغض و عداوت مال ماست
خواب و راحت عیش و عشرت ناز و نعمت مال ماست
گر زنی بے سیم از دریا بساحل تلگراف   گر کنی خلق غراما فون و سینما توگراف
در نمائی بہر خود از اطلس و مخمل لحاف   سندس و استبرق اندر باغ جنت مال ماست
استراحت خواب راحت عیش و عشرت مال ماست

روحانی کی نظمیں حاتمہا۔ اور دیوان عدالت ؎ بھی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مختصر یہ کہ وطنی۔ قومی۔ جذباتی اور فطری شاعری اس عصر کی خصوصیات ہیں۔ ایران کی جدید شاعری کی حسب ذیل قسمیں ہوسکتی ہیں ؎

وطنی اور قومی شاعری

موجودہ صدی میں جس صنف نظم نے شاعری کے مردہ کالبد میں از سرِ نو روح پھونک دی ہے اور جس نے مشرقی شاعری کے مخالفین اور معترضین کی نگاہوں میں بھی اس کی اہمیت قائم کردی ہے۔ وہ محض قومی اور وطنی شاعری ہے بیسویں صدی سے پیشتر قومی شاعری کا وجود فارسی شاعری میں مطلقاً نہ تھا۔ اور ہوتا کیونکر کیونکہ اس قسم کی شاعری اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ملک کسی غیر قوم کے قبضہ میں ہو یا خود اپنا بادشاہ ظالم و سفاک ہو اور ساتھ ہی ساتھ قوم کو اپنی غلامانہ زندگی۔ یا اپنے بادشاہ کے مظالم کا احساس بھی ہو۔ اور اس سے گلو خلاصی کی فکر دامنگیر ہو،

؎ قطعہ وطنی   ؎ وطن

چنانچہ ایران میں بھی اس قسم کی شاعری کا وجود اسی جذبہ کا ممنون احسان ہے ایرانیوں نے استبدادی حکومت کو مشروطہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اسی وقت سے شاعری میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ وطنیت اور حریت کے جذبات نظم ہونے لگے۔ چنانچہ ادیب نیشاپوری۔ مرزا ابراہیم خان پورداؤد۔ حبیب یغمائی۔ حسام زادہ[1] پازارگاد۔ سید اشرف الدین[2] نسیم شمال۔ عارف قزوینی۔ عبدالعظیم گورگانی۔ فرخی یزدی۔ مرتضےٰ خاں فرہنگ۔ محمود طرزی وغیرہ وطنی جذبات نظم کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ جناب پورداؤد کی ایک وطنیہ نظم رستخیز کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

ہل شیشۂ مے بگیر شمشیر ——— از گیسوئے یار بند بپذیر
بشتاب کہ ہمت رسی دیر ——— اسے مست! نہ ہنگام درنگ ست

برخیز زخواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

از بہر وطن بجان بکوشیم ——— در رزم بسان پیل بجوشیم
چوں شیر وزرم ہم بخروشیم ——— گر دشمن اژدر و پلنگ است

برخیز زخواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

اسی طرح آپ کی دوسری نظمیں۔ نوائے بومی۔ ایرانیاں ایرانیاں وغیرہ وطنی اور قومی جذبات سے لبریز ہیں۔ حسام زادہ پازارگاد کی ایک نظم "سرود کودکان" ملاحظہ ہو جس میں وطنی اور قومی جذبات ہونے کے علاوہ موسیقیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے ؎

ما کودکاں ——— بہر ایراں ——— باید کوشیم از دل وجاں
علم و ہنر ——— موجب فخر ——— ما گردد۔ در دو جہاں

سعی و عمل رہبر یا باشد اے فرزندگیاں
نخر و شرف مشعل ما۔ دریں راہ تیرہ عیاں

ما ——— نو ——— باد ——— گان۔ دبستاں از بہر ایراں
باید ——— کوشیم ——— از ——— دل وجاں ہورا.....

سید اشرف الدین (نسیم شمال) کی نظم "بیکس وطن" کا ایک بند ملاحظہ ہو کہ کس غضب کا درد اور جوش وطن ہے ؎

اے باغ پر شگوفہ گل ویاسمن چہ شد
آں نزہت وطراوت سرو چمن چہ شد
بر عاشقان کشتہ مزار و کفن چہ شد
گریاں بحال زار تو مرغ ہوا وطن

بیکس وطن۔ غریب وطن بے نوا وطن

دردا رسید سیل فتن وا محمدا
نبود کسے بفکر وطن وا محمدا
در حشت است روح زتن وا محمدا
اے تابع شریعت خیر الورائے وطن

بیکس وطن۔ غریب وطن بے نوا وطن

اسی طرح عارف قزوینی کی یاد وطن۔ عبدالعظیم گرگانی کی وطن، ایران، فرخی یزدی کی مسمط وطنی۔ اے دموکرات۔ اے وطن پرور..... فرہنگ کی کارکن در وطن.... خاک ایران۔ محمود طرزی کی وطن، آہ اسلام وغیرہ بہترین قومی اور وطنی نظمیں ہیں۔

ڈرامائی شاعری

اس قسم کی شاعری کا اطلاق اگرچہ فارسی کی قدیم مثنویوں کے جستہ جستہ ٹکڑوں اور بعض مخصوص نظموں پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ "نظامی" اور "خسرو" کی مثنویوں میں اس کا رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے مثلاً لیلیٰ مجنوں اور شیریں وخسرو کی مثنویوں میں مناظر قدرت کی صورتیں، خزاں اور بہار کے مناظر لیلیٰ کا حسن وجمال۔ واردات عشق نظارۂ حسن وغیرہ کے بیانات اور مکالمے ایسے ہیں جن میں ڈرامائی شاعری کی بہت کچھ جھلک پائی جاتی ہے لیکن اصل ڈرامائی شاعری جو موسیقی کے ساتھ یا بغیر موسیقی پڑھ کر سنانے یا اسٹیج پر اداکاری کے ذریعہ پیش کرنے کی غرض سے لکھی جائے۔ جدید ایرانی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ قاآنی کا ایک منظوم مرثیہ جس میں ڈراما اور مکالمہ کا رنگ پایا جاتا ہے ملاحظہ ہو ؎

بارد چہ؟ خون، کہ؟ دیدہ چساں؟ ——— روز و شب چرا؟
از غم، کدام غم؟ غم سلطان ——— اولیا؟
نامش چہ بود؟ حسین! نژاد کہ؟ ——— از علی!
مامش کہ بود؟ فاطمہ! جدش کہ بود؟ ——— مصطفےٰ!
چہ شد؟ شہید شد! بکجا؟ ——— دشت ماریہ
کے؟ ماہ محرم! پنہاں؟ ——— نہ بر ملا

اس کے بعد دوسرے شعرا نے اس طرف بہت کم توجہ کی۔ البتہ روحانی اور میر محمد رضا عشقی مرحوم اس کے علم بردار ہوئے۔ غلام رضا خاں روحانی نے

[1] چند کلمہ از پیران امروز ایران
[2] بیکس وطن۔ شاد وطن۔ گوشش بفتوا کرد

ایک اوپیرا "پیس فصلین ضعیف" نظم کیا اور چند قطعات ڈرامائی طرز میں منظوم فرمائے جو تھیٹریکل کمپنیوں میں بے حد مقبول ہیں۔

عشقی مرحوم کی نظم "ایدہ آل" ایرانی ڈرامائی شاعری کا بہترین نمونہ ہے تین پردوں کا مختصر سا منظوم ڈراما ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک بڈھا حریت اور آزادی کی راہ میں اپنے دولڑکے قربان کرتا ہے۔ اس کی لڑکی مریم ایک بوالہوس نوجوان کے عشق کا نشانہ بنتی ہے۔ جوان اور مریم کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔

جوان :- سلام مریم مہ پارہ -

مریم :- کیست ایوائی ؟

جوان :- منم مترس عزیزا ازچہ وقت ایں جائی ؟

مریم :- توئی عزیز دلم بچہ دیر میائی ؟

سپس درآں شب سرآں شب تماشائی

اسی قسم کی گفتگو کے بعد نوجوان شراب کی بوتل نکالتا ہے اور مریم کو پیش کرتا ہے۔ مریم انکار کرتی ہے ؎

مریم - ہزار مرتبہ گفتم نمی خورم من ازیں

جوان - بخور کہ نیست ازیں بہ شراب اندر دہر

مریم - برائے من کہ نہ خوردم بتر بود از زہر

شراب خوب است امابرائے مردم شہر ✦ کہ ہست خوردن نان از تنور و آب از نہر

نشاط و عشرت ما مردمان کوہ نشیں

شہریوں کی زندگی پر طنز خالی از لطف نہیں -

عشق کا انجام حسرت و ناکامی ہے۔ چنانچہ مریم اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔ اس کا باپ آتا ہے اور آہ و زاری کرتا ہے۔ اس کا نالہ و شیون ملاحظہ ہو :-

بزیر خاک سیہ فام مریم۔ اے مریم چہ خوب خفتہ آرام مریم اے مریم

برستی از غم ایام مریم۔ اے مریم بخواب دختر ناکام مریم اے مریم

بخواب تا ابد اے دختر اندریں بستر

تیسرے پردے میں بڈھا اپنی داستان سناتا ہے جس میں ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح وہ اراکین سلطنت کے جبر و ستم کا شکار رہا۔

اسی قسم کی دوسری تصنیفات رستاخیز سلاطین ایران اور خرابہ ہائے مدائن ہیں جن میں سلاطین ایران کی تباہی کے نظارے اور وطن پرستی کی تحریک ہے۔ خرابہ ہائے مدائن کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر جے ایس تارا پور والا نے کیا ہے، اور ۱۹۲۵ء میں شائع ہو گیا۔

بیانیہ شاعری

فنِ شاعری کی یہ صنف تمام دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ غیر معین ہے۔ اس میں افعال اور اعمال انسانی میں سے کوئی سا ایک فعل پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے بعض اوقات رزمیہ شاعری سے تشابہ ہو جاتا ہے اور اس میں ڈسکرپٹو منظومات کی طرح جزئی حالات کی تفصیل بھی شامل ہو سکتی ہے۔ فارسی زبان میں اس قسم کی شاعری کا ذخیرہ بہت کافی تھا لیکن جدید شاعری میں بیانیہ نظموں کا معیار اور بلند ہو گیا ہے۔ نئے نئے الفاظ اور جدید طرز کی خرادپر کچھ اس طرح رکھا ہے کہ وہ بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ جناب افشار کی ایک نظم "شب ماہتاب" کے کچھ اشعار لکھے جا چکے ہیں۔ جناب فلسفی کے ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شب افگندہ بر روئے گردوں نقاب بتاریکی اندر شدہ آفتاب

ز ابر سیہ روئے گردوں چو قیر نہ بہرام پیدا نہ کیوان نہ تیر

شبے در سیاہی و تنگی چو گور زتاریکیش چشم بینندہ کور

بہ گیتی دگر دوں نہ بینی فروغ تو گوئی کہ خود نور باشد دروغ

اندھیری رات کا بیان کس قدر عجیب اور موزوں الفاظ میں کیا ہے۔ مرزا غلام رضا خاں روحانی کی ایک نظم جو انھوں نے دوچرخہ (بائسکل) پر لکھی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

مرکبے دارم وایں طرفہ کہ باشد خوردو نہ علف خواہد و نہ یونجہ و نہ کاہ و نہ جو

چار شاخ است مرا را دو بالا دو بزیر تا با نہانہ نہم دست نہ گردد بہ رو

سائیکل کے لیمپ اور گھنٹی کو بیان فرماتے ہیں ؎

ہست اندر شب تاریک ز چشمش روشن یک چشمے بعقب وار دو چشمے بجلو

ہست یک جنبش چوں زہرہ و یک چوں مریخ پائے او ماہ تمام است و دمش چوں مہ نو

سائیکل ہارن کا بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ دوسری سواریوں کی طرح ہٹو بچو، خبردار، کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ؎

خود زند بانگ چو انگشت بگوشش بزنم خود کند بہر خبردار چو زنگ با عوعو

کارگر و کارفرما، مادر و قلب مادر (ایرج مرزا) قلب مجروح، اشک یتیم (بدیع الزماں خراسانی)، بازارگاہ (حسام زادہ) زارع، شب ماہتاب، کوہسار البرز (افشار)، پیرزال انزخاناں (مودہ دوسجدا)، توصیف بہار (رعدی)، شب آسماں، گل، پیش رس وغیرہ بہترین بیانیہ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ صدہا نظمیں ہیں

جو عمارتوں مقبروں۔ قدرتی مناظر پر مشتمل ہیں حسن بیان اور دل کشی میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

اخلاقی اور اصلاحی نظمیں

اس قسم کی نظموں میں شاعر کا مطمح نظر دنیا کو کسی اخلاقی سبق کا سکھانا کسی مذہبی عقیدے کا سلجھانا یا کسی فلسفیانہ خیال کی توضیح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ گویا شاعر ایک ریفارمر اور مصلح کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے اور ایک معلم کی خدمات انجام دیتا ہے۔ دیگر فنون لطیفہ کی طرح شعر کا بنیادی مقصد اخلاقِ انسانی کی آراستگی ہے۔ اگرچہ اخلاقی شاعری کا ذخیرہ ہر زبان میں محدود رہا ہے لیکن فارسی شاعری کو اس باب میں تمام دنیا کی زبانوں سے زیادہ فروغ حاصل ہے۔ سعدی شیرازی کی خالص اخلاقی شاعری اس نوع کا قابلِ رشک کارنامہ ہے لیکن عصرِ حاضر کے شعراء نے اس میں چار چاند لگا دئیے ہیں۔ اس دور میں شعراء نے انھیں چیزوں میں اصلاح کرنا اپنے ذمے لیا ہے جن سے ان کے خیال میں قوم اور ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے مثلاً حقوقِ نسواں کی پامالی کو دیکھ کر مرزا محمد کسمائی نے ایک نظم بعنوان "تسویۂ حقوق زن و مرد" لکھی۔ اس کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

در مملکتے کہ زن بہ قانون　　　با مردِ حقِ سخن ندارد
گر مرد شش بیست زن بگیرد　　　او جرأت چہ و چون ندارد
در موقعِ عقد بستن او　　　اصلاحِ این و آن ندارد
دیگر چہ تساوی حقوق است، آقائی مقالہ ساز بس کن
اندر رہِ عنکبوتِ خونخوار، کمتر تعریف از مگس کن

روحانی کی ایک نظم "در ترکِ اشیاءِ تجملی" کے چند شعر ملاحظہ ہوں جس میں انھوں نے فیشن اور تکلفاتِ لایعنی سے احتراز کرنے کی فہمائش کی ہے ؎

این ہمہ اشیاء لوکس[1] کہ میرسد از فرنگ　　　عروسک جور جور، تحفۂ رنگ رنگ
پس آنگہ اندر عوض زمملکت بیدرنگ　　　قران رود مشت مشت لیرہ رود تنگ تنگ
نقرہ رود کوہ کوہ طلا رود بار بار

اسی طرح چند بند لکھنے کے بعد فرماتے ہیں ؎

بجانب اقتصاد اگر گزاری قدم　　　متاعِ ایران شود در ہمہ جا محترم
کند بہ پیش دول دولتِ ما قد علم　　　ملّتِ ما رو سفید شود میان امم
شوکتِ ما مستدام قدرتِ ما برقرار

[1] عالی

ایران میں بھی پردے کا مسئلہ معرض بحث میں ہے اور وہاں بھی مخالفین کی تعداد کم نہیں چنانچہ ڈاکٹر افشار نے ایک نظم پردے کی موافقت میں بعنوان عفت[2] نظم فرمائی۔ اس کی مخالفت جناب محمد کسمائی صاحب نے فرمائی (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۳) حسام زادہ کی ایک نظم "غرق در لجہ . . . . ." بھی اسی موضوع پر ہے۔ اسی طرح صدہا اصلاحی اور مثل نظمیں ہیں جن میں بزرگ ترین گناہ (پورداؤد) درویش شوریغی خطاب بدختران مشرق۔ تریاکی وشیرہ وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔

غنائی شاعری

اس صنف کی شاعری کی کمی کسی دور میں نہیں رہی۔ قدیم فارسی میں غزل یہ خدمت انجام دیتی رہی لیکن دورِ جدید میں بذاتِ خود ایک مستقل صنف بن گئی ہے۔ چنانچہ ملک الشعرا بہار کو اس قسم کی نظمیں لکھنے میں خاص دسترس حاصل ہے۔ اور ان کی نظمیں گرامو فون میں ضبط ہوتی ہیں۔ ان کی گرامو فون والی ایک نظم ملاحظہ ہو :-

ز من نگارم خبر ندارد　　　بحالِ زارم نظر ندارد
خبر ندارم من از دلِ خود　　　دلِ من از من خبر ندارد
کجا رود دل کہ دلبرش نیست　　　کجا پرد مرغ کہ پر ندارد
اماں ازیں عشق فغاں ازیں عشق　　　کہ غیر خونِ جگر ندارد
ہمہ سیاہی ہمہ تباہی　　　مگر شبِ ما سحر ندارد
بہارِ سنبل بنال دیگر　　　کہ آہ و زاری ثمر ندارد

ترانہ ہا جناب روحانی کی تصنیف اور ان کی غنائی شاعری کا مجموعہ ہے۔

حسام زادہ پازارگاد کی وطنی نظم "سرودِ کودکاں" جس کا ایک بند لکھا جاچکا ہے غنائی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ عبد العظیم خاں گرگانی کی نظم "وطن" جو طلبائے اسکول کے وردِ زبان ہے اور گرامو فون میں بھی ضبط ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

کشورِ ما کشورِ ایران بود　　　مسکنِ شیران و دلیران بود
پادشہش کورس و دارا بود　　　چوں جم و کیخسرو شہ والا بود
پادشہ عادل انوشیرواں　　　گشتہ پر آوازہ زعدلش جہاں

اسی طرح فرمانے کے بعد لکھتے ہیں ؎

اے وطن، اے حبِ تو آئینِ من　　　دوستیت کیشِ من و دینِ من
بے تو وجودِ من یک دم مباد　　　سایۂ تو از سرِ من گم مباد

[2] ملاحظہ ہو سخن وران در عصرِ حاضر۔ جلد اوّل صفحہ ۸۱

دولت و اقبالِ تو پاینده باد   نامِ بلندت بجہان زنده باد

یوروپی طرز کی شاعری

اس صنف کے تحت میں وہ تمام اشعار آسکتے ہیں جو یوروپی طرز مثلاً سانیٹ ستائر وغیرہ کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ یا یہ کہ یوروپی بحروں میں نظم کئے گئے حسام زادہ پازارگاد کی ایک نظم یوروپی طرز میں جو انھوں نے طلبائے مدارس کے لئے نظم فرمائی ہے ملاحظہ ہو ؎

اے غنچۂ ناشگفتہ در باغ   اے نوگل زیب بوستانی
اے جلوۂ باغ و رونق راغ   واے ہمدم روح آسمانی
واے قلب تو پاک تر ز گوہر
واز عطر صفائے دل معطر
امروز مراست شکوہ ای چند   روے سخنم بتو است امروز

اسی طرح قوم کی حالت بیان فرمانے کے بعد بچوں سے فرماتے ہیں ؎

ہشدار کہ کس زہیچ گرہ دام   در رہگذر تو داہا ہست
در دفتر روزگار و ایام   از نیک و بد تو نامہا ہست
ہشدار کہ دیو رہ نہ بندد
بدخواہ بروے تو نہ خندد
چشم ہمہ خیرہ خیرہ بر تو است   برخیز کنوں نہ وقت خواب است
آں گوہر شاہوار در تو است   دیگر کہ نہ طاقت و نہ تاب است
در پوست چہ چینی؟ بروں آئی
واں گوہر اصل خویش بنمائی

عارف قزوینی کی ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہنگام مے و فصل گل و گشت (جانم گشت و جانم گشت و) چمن شد
در بار بہاری تہی از زاغ و (جانم زاغ و خدا از زاغ و) زغن شد
از ابر کرم خطہ ری رشک ختن شد
دل تنگ چو من مرغ (جانم مرغ) قفس بہر وطن شد
چہ کج رفتاری اے چرخ، چہ بدکرداری اے چرخ   ہر کیں داری اے چرخ
نہ دین داری، نہ آئین داری، (نہ آئین داری)   اے چرخ

آپ اس طرز کی نظمیں ڈھالنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں چنانچہ آپکی اکثر نظمیں اسی طرز میں ہیں۔

ملک الشعراء بہار کی قلب شاعر - مرغ سحر - دہخدائی - قطعہ وطنی اس طرز میں بہترین نظمیں ہیں۔

یہ ہے مختصر حال اس ایرانی انقلاب کا جس نے تمام چیزوں میں انقلاب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ادبیات میں بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ اور یہ ہے مختصر کیفیت ایران کی جدید شاعری کی جس کو انقلابی شاعری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

قارئین کرام اندازہ فرما سکتے ہیں کہ چند ہی سال کے عرصے میں ایرانی شاعری کہاں سے کہاں پہنچ گئی +

اظہر علی فاروقی

رباعی

مجھ سے ہے اور وہ مشغول سرگزشت
یہ بحث و نزاع اور یہاں سنگ و خشت
واں بحث سب سے فارغ
ہیں کنج خرابات میں سب خوش باش
ساغر ہے لئے بیٹھا ہوں خواب

اعجاز



SATIRE ستائر   SANNET سانیٹ

اشکبارِ فراق سے

مرے الم میں نہ ہو اشکبار جانے دے
خزاں قبول نہ کر، اے بہار! جانے دے

یہ زردِ حسنِ محبت، یہ سرخ دیدۂ شوق
یہ اہتمامِ شبِ انتظار جانے دے

نہ باندھ رات کے دامن سے دامنِ فریاد
کرم! کرم! مرے اخترشمار جانے دے

نگاہِ حسن طلب ہو نہ جائے شرمندہ
تصورات کا کیا اعتبار جانے دے

تری حیا کے تصدق تری وفا کے نثار
لٹا نہ اپنا سکون و قرار، جانے دے

نہ پھینک کاہکشاں پر کمندِ نالۂ غم
شبِ چمن کو نہ کر سوگوار جانے دے

نظر فروز جوانی کو پائمال نہ کر
نہ کر بہار میں خونِ بہار جانے دے

فلک نشین ستاروں کے دل نہ رک جائیں
پکار مجھ کو نہ دیوانہ وار جانے دے

میں گڑ رہا ہوں کہ تو اور دم بھرے میرا
بس اور مجھ کو نہ کر شرمسار جانے دے

مری حیاتِ حزیں میں بشاشتوں کو نہ ڈھونڈ
مری خزاں میں نہیں ہے بہار جانے دے

نہ اس طرح مجھے ممنون کر کہ مر جاؤں
فقیر پر یہ کرم شہریار جانے دے

احسانِ دانش

شیخ صاحب

شیخ صاحب کون تھے؟ اگر کوئی شیخ صاحب جو اپنے نام کے ساتھ شیخ . . . صاحب لکھنے کے عادی ہیں اس کردار کو اپنے نام کی طرف منسوب کریں گے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بر آئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب ایک عجیب "گھپّم گھپّا" انسان ہیں جن کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیا ہیں، جو خصلتیں تنیس کروڑ انسانوں میں علیحدہ علیحدہ پائی جاتی ہیں وہ سب ان میں اللہ میاں نے زبردستی اکٹھی کر دی ہیں، انہیں "شیخ تنیس کروڑ" کہنا تو بالکل بے معنی ہے کیونکہ یہ نہیں کہ وہ بے نام ہی پیدا ہوئے ہیں ان کا نام تو ضرور ہے اور صرف ان کا نام ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سے ان کا ساتھ دے رہا ہے ورنہ بعض اوقات تو ان کا سایہ بھی ان سے دور بھاگتا ہے، آپ کا نام صرف فخر الزمان ہے لیکن آپ کبھی کبھی محض اس وجہ سے کہ لوگ سوء ادبی سے کام نہ لیں اپنے نام کے ساتھ "شیخ الشیوخ" لکھ دیا کرتے ہیں، خدانخواستہ ان کا مقصد شیخی مارنے کا نہیں اور اگر ہو بھی تو جہاں اتنے لوگ دنیا میں نام پیدا کرنے کے لئے بقول کسے ۴۲۰ سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے ایسا کر بھی دیا تو اس سے ان کی شان کم نہیں ہو سکتی خوبی تو یہ ہے کہ آپ انسان ہونے کے علاوہ عجیب انسان ہیں ——

ایک نادر مجموعہ اضداد! تصادم تو ہر ایک انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ لیکن آپ کہا کرتے ہیں کہ جب تک ہولناک تصادم نہ ہو تو خوبی ہی کیا ہوئی، ہاں تو آپ کا اسم گرامی شیخ فخر الزمان ہے۔ رہنے والے آپ اس طرف کے ہیں جس کا ذکر آپ کے لئے سوہان روح ہوتا ہے، باتوں ہی باتوں میں ٹال جاتے ہیں۔ بھئی! ہمیں لاہور میں آئے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ اب ہمیں یہیں کا سمجھنا چاہئے"۔ معلوم نہیں اس راز میں کیا پردہ ہے۔ لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب لاہور میں انقلاب پسندوں نے شورش برپا کر رکھی تھی تو آپ کو ڈی اے وی کالج کے گرد گھومتے ہوئے پولیس نے آ دبوچا۔ آپ کے اس جواب نے کہ "مجھے لاہور کا ہی سمجھنا چاہئے"۔ پولیس کے شک میں دوچند اضافہ کر دیا۔ محض "اس سمجھنا چاہئے" کی بدولت آپ آٹھ دس روز تک حوالات کی ہوا کھاتے رہے، تو اس بات پر فیصلہ ہوا کہ آپ کے وطن کے متعلق یا تو خدا کو علم ہے یا شیخ صاحب کے باپ کو باقی رہی شکل وصورت تو اس کے متعلق بھی کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی، دنیا کی ناپائیداری کا ان کے چہرے پر اتنا اثر پڑا ہے کہ ان کے رخ مبارک کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کہنا زیادہ موزوں ہوگا، صبح کے وقت بدصورت اور شام کو حسین معلوم ہوتے ہیں اور کبھی شام کو کریہہ المنظر اور صبح کو سجیلے جوان دکھائی دیتے ہیں، بنیادی طور پر چہرے کی ساخت بالکل قطبی ہے یعنی پیشانی ہمالہ کی طرح کشادہ اور ٹھوڑی راس کماری کی طرح نکونی ہے۔ البتہ اس پر نمائشی تبدیلیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں کبھی کرزن فیشن اور کبھی اچھا خاصا ڈاڑھا کبھی فرنچ کٹ اور کبھی فلسطینی قطع کبھی آدھی مونچھ اور کبھی پوری لباس میں بھی وقت کی رنگینیاں گلتے ہیں۔ سوٹ بھی پہنتے ہیں قمیص شلوار بھی، پلس فور بھی پہنتے ہیں اور تہ بند باریک کرتے کے ساتھ بھی، گو کسی تہوار میں اعتقاد نہیں رکھتے لیکن عید میلاد کے دن خاص طور پر چھ دفعہ لباس بدلتے ہیں، گو محلے والوں سے زیادہ راہ ورسم نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ساری دنیا خصوصًا محلے والے مطلب پرست اور خود غرض ہوتے ہیں لیکن لباس تبدیل کرنے کے بعد ضرور ہر ایک کو سلام کرنے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بالکل ننگے (تہ بند ضرور ہوتا ہے) بھی بھاگ کر ڈاک خانے سے ٹکٹ لے آتے ہیں لیکن اس صورت میں کہ ٹکٹ انہیں خود استعمال کرنا ہو ورنہ ایک دن بیوی صاحبہ نے کہہ دیا تو دانت دکھا دکھا کر ڈاڑھی ہلا ہلا کر (ان دنوں ڈاڑھی رکھی تھی) دانت پیس پیس کر کہنے لگے، "دیکھتی نہیں! کس حال میں ہوں۔ ایسے چلا جاؤں تو ڈاکخانے والا بابو مجھے گاؤدی ہی سمجھے گا نا! اور تم تو یہی چاہتی ہو! میرا سوٹ جلدی نکال میں ابھی لائے دیتا ہوں"

جب انھوں نے سوٹ کا نام لیا تو بیوی نے ٹھنڈا سانس

لیا کیونکہ پندرہ منٹ میں محلے کے لال بکس سے ڈاک نکلنے والی تھی اور وہ کم از کم آدھ گھنٹہ سوٹ پہننے کے لئے صرف کرنے والے تھے۔

"آپ تکلیف نہ کیجئے، میں بیرنگ ہی بھیج دیتی ہوں"

"میں تمہارے باوا کو نہ جانتا ہوں تو کچھ بات بھی ہے، آخر دو آنے مجھے ہی دینے پڑیں گے، نیز ایک دفعہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم سوٹ پہنیں گے تو ہر صورت میں پہننا ہی ہوگا"

سوٹ آیا تو پتلون میں ایک شکن دیکھ کر ملتفت ہو گئے، شکن آ گیا۔

"لوہا گرم ہے؟ کہاں ہوگا اس وقت گرم! اچھا تو ٹھنڈا ہی اٹھا لاؤ"۔

ٹھنڈا لوہا پورے بل بوتے کے ساتھ آٹھ دس دفعہ پتلون پر اس طرح رگڑا کہ پسینہ آ گیا، شکن دور ہوا یا نہ ہوا لیکن انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

عادات متضاد اور جذبات سینے میں ہچکولے کھاتے ہیں، پل میں ماشی اور پل میں چیچڑی بابوں کہئے کہ پل میں مولانا شوکت علی اور پل میں مہاتما گاندھی، کبھی میز پر، کبھی فرش پر اور کبھی چولہے کے سامنے بھی کھانا کھا لیتے ہیں، پبلک کے خلاف انہیں شکایات ہیں بھی اور نہیں بھی، کسی وقت تو اپنے آپ کو "شہید قوم" بھی کہہ لیتے ہیں اور کسی وقت ساری قوم کو جہنم میں دھکیلتے ہیں، کبھی احرار کی تعریف میں انقلاب فرانس کی مثال پیش کرتے ہیں اور کبھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر تصور کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ سارے لیڈر قوم کا روپیہ کھاتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ اگر وہ نہ کھائیں تو ان کا گزارا بھی کیسے ہو۔ اسی دن سے آپ تمام اخبار نویسوں کو "نامعقول" کہتے ہیں جس دن سے آپ کا ایک مضمون "محبوبہ کی قبر پر" ایک مقامی روزنامے نے واپس کر دیا تھا، صبح اٹھ کر کالج کو جانے والی چھوکریوں کو گہری نظروں سے دیکھتے بھی ہیں اور جو دیکھتے ہیں انہیں بُرا بھی کہتے ہیں، کبھی شیکسپیئر کی مدحت سرائی کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ اس بڈھے کو آتا ہی کیا تھا، کبھی اپنے آپ کو افلاطون سے اعلیٰ و ارفع سمجھتے ہیں، چوبیس گھنٹوں میں ساڑھے تین گھنٹے شاعر ہوتے ہیں باقی وقت سب کچھ، اکثر کہا کرتے ہیں "دنیا میں ہر ایک شخص ایک دوسرے کو دھوکا دے رہا ہے" اور اس وقت اپنے کو اس دنیا سے بہت دور سمجھتے ہیں، یورپ کے سیاسیات کا مزے لے لے کر ذکر کرتے ہیں، کبھی وہاں کے سیاست دانوں کو عیار کہتے ہیں اور کبھی نامعقول، کبھی دلیر کہتے ہیں اور کبھی بزدل، کبھی کہتے ہیں کہ بس لڑائی ہوا چاہتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ جب تک انگریز قدم نہ بڑھائیں لڑائی نہیں ہو سکتی، غرضکہ آپ کے تضاد اور تصادم کی فہرست بہت لمبی ہے اور آپ جس آنکھ سے دنیا کو دیکھتے ہیں اس کا بیان سوہان روح بن کر رہ جائے گا۔ لیکن اتنا بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان ہچکولوں کے باوجود آپ نہایت مستقل مزاج ہیں یعنی جب ایک خیال آپ کے ذہن میں جاگزیں ہو گیا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے باہر نہیں نکال سکتی خواہ وہ عرصہ ایک گھنٹے کا ہی کیوں نہ ہو۔

آج بڑے گھمسان کی بارش ہو رہی ہے۔ آپ اپنے کمرے میں ٹہل رہے ہیں، آج کل آپ کی ڈاڑھی مونچھیں صفا ہیں۔ شتری رنگ کا ایک بڑا گرم کوٹ پہنے ہیں، گنجیا کو مفلر سے لپیٹے ہوئے ہیں اور پاؤں میں سلیٹی رنگ کی فوجی جرابیں پہنے ہوئے ہیں، انگیٹھی میں کوئلے راکھ بن چکے ہیں لیکن کبھی کبھی اس راکھ پر ہی ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے ہیں۔ غالباً کوئی مضمون لکھنا چاہتے ہیں، قلم ہاتھ میں لے کر کچھ لکھنا چاہتے ہیں کہ مغلانی اندر آتی ہے۔

"کیوں جی! وہ چائے کو کیا ہو گیا؟"

"حضور! آپ سے عرض کرنے آئی تھی کہ بیوی جی نے چائے تیار کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ چائے سے آپ کا دل کمزور ہو جائے گا"

"دل کی بچی! میرا دل یا میری بیوی کا دل۔ میرے دل سے اسے کیا تعلق؟"

"وہ کہتی ہے کہ میں آپ کے دل کی ذمہ دار ہوں"

"اری! وہ ہم سے زیادہ حکمت جانتی ہے؟ ہم اپنا نفع نقصان نہیں سوچ سکتے؟ اسے کہہ دو کہ ہمارے دل کا سوائے میرے کوئی ذمہ دار نہیں ہے، اس پگلی کو کیا علم کہ چائے کے بغیر ہم ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے بہر صورت تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ میرا حکم میرا حکم ہوگا۔ کسی بشر کو مجاز نہیں کہ اس میں رخنہ اندازی کرے، —— اف! میں سمجھ گیا! —— بات ہوئی نا! گھر میں دودھ نہیں ہوگا، بارش ہو رہی ہے۔ بیوی جان نے یہ خیال کیا ہوگا کہ ہماری پیاری بڑھیا نالائق، کام چور مغلانی کہاں جائے گی۔ بہانہ کر کے ٹال دیا، کیوں؟ یہی بات ہے نا؟ اب بولتی نہیں! خیر! جاؤ دودھ کے بغیر ہی لے آؤ، چلی ہو! ذرا بات تو سنتی جانا، ان رسالے

والوں نے بہت تنگ کیا ہے، ہر روز ایک خط آجاتا ہے رحالانکہ صرف ایک خط آیا تھا) کہ سالنامے نکل رہے ہیں، خدا کے لئے کوئی مضمون بھیجو، آپ کے مضمون کے بغیر سالنامہ ایک دمڑی کا نہیں ہوگا، آپ کی تصویر بھی شائع ہوگی، سمجھ میں نہیں آتا کس موضوع پر لکھوں، بہتیرا دماغ کو کھجلایا ہے۔ لیکن کوئی بات ذہن میں نہیں آئی، تمہیں بھی تو میرے پاس رہتے ہوئے بیس سال ہو گئے، کوئی بتاؤ راستہ، ہاں کوئی اچھا سا موضوع تجویز کرتا۔"

"حضور! میں کیا اور میری بساط کیا، مضمون نگاری میں آپ اپنے وقت کے حاتم طائی ہیں، آپ کو کچھ بتانا تو اندھے کو چراغ دکھانا ہوا، میرے خیال میں موسم پر آج تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا آپ لکھیں تو بس غضب ہی ہو جائے گا۔"

"کیا کہا؟ موسم؟ آگئی ہے کہیں سے مجھے مشورہ دینے! بھاگ یہاں سے، مجھے کوئی گنوار سمجھی ہو کہ موسم پر لکھوں؟ ایک حرف بھی اب تم نے بکا تو زبان تراش لوں گا۔"

مغلانی بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی تو آپ ہوا سے تکہ بازی کرنے لگے، رہ رہ کر مغلانی پر دانت پیس رہے تھے۔

"پاجی عورت! مجھے کوئی پانچویں جماعت کا لڑکا سمجھا ہے!"

قلم دانتوں میں لے کر کچھ سوچنے لگے لیکن اب کسی اور خیال کا ذہن میں گھسنا محال تھا، جھلّا کر اٹھے۔

"پاجی عورت! اس وقت سامنے ہو تو چوٹی ہی کاٹ لوں۔"

دو تین بار کمرے میں ادھر اُدھر نہایت تیزی سے چل گئے۔ پھر معاً کھڑے ہو گئے اور منہ چڑا کر کہنے لگے۔

"موسم پر آج تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا ——"

"آپ لکھیں تو بس غضب ہی ہو جائے گا۔" پاجی عورت! بڑھیا کھوسٹ! شیطان کی خالہ!"

بہت جدوجہد کی لیکن موسم کا خیال بار بار ستا رہا تھا، ادھر بارش کا شور ادھر دماغی کاوش نے کچھ عجیب جنجال میں ڈال دیا، گھونسا تان کر کھڑکی کی طرف چلے، قریب تھا کہ آپ گھونسے کا وار کر بیٹھتے لیکن معاً خیال آگیا کہ یہ ایڈیٹر تو نہیں شیشہ ہے۔

کم بخت دیتے دلاتے تو کچھ نہیں، چلو موسم پر ہی الم غلم لکھ کر ڈال دو، اب ذرا قلم کی روانی دیکھئے:

"معلوم نہیں ہندوستانیوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے، جب گرمی آئے تو کہتے ہیں اس سے تو جاڑا اچھا تھا، انسان لپٹ لپٹا کر اندر جا بیٹھتا ہے اور کچھ نہیں تو انگیٹھی سے کمرہ گرم کر سکتا ہے اور جب جاڑا آئے تو سب سینے پر ہاتھ باندھ لیتے ہیں، موسم کو، موسم بنانے والے کو اور ہندوستان کی آب و ہوا کو بے نقط سناتے ہیں۔ بھائی! اس سے گرمی ہزار درجے بہتر، بندہ چاہے ننگا ہی پھرے اور غریب کے لئے تو گرمی کا موسم کس قدر سود مند ہوتا ہے، چاہے گلی میں پڑ رہے یا کسی دُکان کے تختے پر دراز ہو جائے۔ غرضکہ حیف ہے ہندوستانی کی عقل پر، اگلے وقتوں کے کیا اچھے سمے تھے، ٹھیک وقت پر موسم کی افتاد ہوتی ہے، مجال ہے جو ایک دن بھی آگے پیچھے ہو، اب تو خدا کے پروگرام میں بھی عجیب بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں کہ کبھی تو اکتوبر ہی میں دانت بجنے شروع ہو جاتے ہیں اور کبھی سارا دسمبر ہی گرم کوٹ کی ضرورت کے بغیر گزر جاتا ہے۔ صدیوں سے ہندوستان کی روائت چلی آ رہی ہے کہ ساون میں سیاہ بادل جھوم کر آتے ہیں اور ہر روز گھٹا ٹوپ گھٹائیں چھاتی ہیں، مینہ کھل کر برس جاتا ہے تو چاروں طرف ہریاول ہی ہریاول نظر آتی ہے لیکن یہ زمانہ بھی دیکھنا تھا کہ سارا ساون ہی سوکھا گزر جاتا ہے اور لوگ منہ کھول کر آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، کبھی اکتوبر میں ہو رہی ہے اور کبھی نومبر میں، مانا کہ لوگوں کے اعمال درست نہیں ہیں۔ لیکن خدا کو بے قاعدگیاں کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، اسے غالباً معلوم نہیں کہ سدھرنے کی بجائے انسانوں پر اس طرح بُرا اثر پڑے گا۔"

اتنا لکھ کر آپ نے انگیٹھی کی طرف نگاہ ڈالی۔ دانت بجنے لگے گویا ٹائپ کی مشین چل رہی ہو، دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوب ملا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

"ہمارے نوجوانوں نے سن رکھا ہے کہ یورپ میں گرمی بہت کم پڑتی ہے اور سارا سال ایسا موسم ہوتا ہے کہ آدمی خوب جان مار سکتا ہے، یہاں پر جس کو دیکھو یہی کہہ رہا ہے کہ اگر ہندوستان کا یورپ جیسا موسم ہو تو پھر دیکھو ہم ۲۴ گھنٹوں میں سے ۱۸ گھنٹے کام کریں، ہندوستان کی غربت بھی جاتی نظر نہ آئے، ان بھلے مانسوں نے ہندوستان کو بدنام کر دیا ہے، ان اوندھی کھوپریوں سے کوئی یہ پوچھے کہ تمہارے اسلاف جنھوں نے دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دی، اسی موسم میں پل کر جوان ہوئے یہیں سے اُٹھے اور اسی خاک میں مل گئے اور اپنا نام دنیا میں چھوڑ گئے،

انہوں نے تو آج تک موسم کی شکایت نہ کی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، علیک سلیک کے بعد ہر ایک یہی کہتا ہے "شیخ صاحب! موسم اچھا نہیں، کسی کام کو دل نہیں چاہتا" "شیخ صاحب! موسم بہت اچھا ہے، باہر گھومنے کو دل چاہتا ہے" کوئی بیماری بھی ایسی ہو گی جس کے لئے موسم کو ملزم نہ ٹھہرایا جاتا ہو، اگر کسی سے کہا جائے کہ مجھے زکام ہو رہا ہے تو فوراً جواب ملے گا "موسم اچھا نہیں، ذرا احتیاط کیا کریں"۔ ایک دفعہ مجھے بخار ہوا، پہلے ہی کونسا میں پہلوان ہوں لیکن بخار نے تو میرا کچومر ہی نکال دیا، بہت علاج کیا لیکن جب تک ہڈیوں سے ہڈیاں نہ بج گئیں بخار نے پیچھا نہ چھوڑا، میرے ایک عزیز دوست تیمارداری کے لئے آئے، آپ ایسے منہ بنا کر کہنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"کوئی بات نہیں شیخ صاحب، آج کل موسم ہی خراب ہے۔ آج کل تو چنگا بھلا آدمی بھی بخار محسوس کرتا ہے، میں دانت پیس کر ہی تو رہ گیا، ان کے خیال میں مجھے ضرور بخار چڑھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ موسم ہی ایسا تھا، جس ڈاکٹر سے ملتا وہ یہی کہتا "موسم خراب ہے ذرا احتیاط رکھیں"۔ ڈاکٹر تو خیر ڈاکٹر ہی تھے لیکن جس جان پہچان والے سے ملا ہوں ہر ایک یہی کہتا تھا۔

"شیخ صاحب! موسم خراب ہے، ذرا کونین کا استعمال رکھیں"، "شیخ صاحب! میری صلاح پوچھئے تو جلاب ضرور لے لیجئے، آج کل جلاب کا موسم ہے"، "بنفشہ ابال کر ضرور پیجئے گا"، "میرے ابا جان نے ایک دوائی بنائی تھی، خدا جانتا ہے کہ اس کے ایک دفعہ کھانے سے کوئی بیماری نزدیک نہیں آتی"، "ہڑ کا مربہ آپ استعمال نہیں کرتے؟ اوہ اس سے بہتر اکسیر تو دنیا میں آج تک پیدا ہی نہیں ہوئی"، "شیخ صاحب! ہر وقت سونف چباتے رہئے۔ شفا تو خدا کے اختیار میں ہے۔ لیکن میں شرط بدنے کو تیار ہوں کہ ہاضمہ کبھی خراب نہ ہو گا اور ہاضمہ کی خرابی سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔"

کہاں تک لکھوں! دنیا کا ہر ایک مرد اور عورت ڈاکٹر ہے صحت کی تھوڑی سی شکایت کر دیجئے تو اس کے جواب میں ہر ایک شخص کی زبان سے ایک نسخہ سن لیجئے اور لطف یہ کہ ہر ایک شخص اس کے مجرب ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے ہاں ! تو بات یہ تھی کہ بیماری کے اسباب میں سے موسم کو سب سے پہلے مطعون کیا جاتا ہے۔ جیسے کانگرسیوں کے نزدیک گورنمنٹ کی ہر ایک حرکت قابلِ الزام ہے۔ اسی طرح موسم انسان کے لئے کبھی انصاف نہیں کر سکتا اور لطف تو یہ کہ انسان بھی کبھی کسی موسم سے خوش نہیں ہوتا۔"

یہاں تک لکھنے پائے تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی، دستک سے ہی پہچان گئے کہ عبدالرزاق ہے، باچھیں کھل گئیں کہ عبدالرزاق میرا اچھوتا مضمون سن کر ہنستے ہنستے نڈھال ہو جائے گا، حالانکہ انہیں ایک مرتبہ پہلے بھی یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اسی عبدالرزاق کے کہنے پر آپ نے بھری محفل میں ایک مزاحیہ مضمون سنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ سارا مضمون پڑھ گئے لیکن کوئی مسکرایا تک نہیں، البتہ ایک بوڑھا جو بہت دور بیٹھا تھا اور جس نے ایک لفظ بھی نہ سنا تھا مضمون کے ختم ہونے پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کیوں جی، یہ فکاہی مقالہ تھا؟" شیخ صاحب بہت جھلائے اور اس جھلاہٹ میں چند ایسی حرکات کیں جس پہ قہقہے اڑتے رہے، شیخ صاحب نے اس دن سے عہد کر لیا کہ کسی محفل میں اپنے قیمتی تخیلات کی ارزانی نہیں کروں گا، انہیں حیرت تھی تو اس بات کی کہ جب وہ نہایت متین اور شستہ موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو لوگ بے اختیار ہنستے تھے اور جب وہ مزاحیہ مضمون سناتے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا، لوگوں کی بدمذاقی پہ وہ آنسو بہانے لگے اور یہ وعدہ کر لیا کہ آئندہ صرف عبدالرزاق کو مضمون سنایا جائے گا اور بس، عبدالرزاق کا معمول ہو چکا تھا کہ آتے ہی پوچھتا

"شیخ صاحب! کوئی مضمون لکھا؟"

ادھر شیخ صاحب کا عینک اتارتے ہوئے کہنا "ہاں! مزاحیہ لکھا ہے"

عبدالرزاق مضمون سننے سے پیشتر لفظ "مزاحیہ" سنتے ہی ہنسنا شروع کر دیتا تھا اور دورانِ مضمون میں تو اکثر بے موقع قہقہے لگایا کرتا تھا

عبدالرزاق نے اندر آتے ہی کہا۔

"دیکھا شیخ صاحب! محض آپ کا مضمون سننے کے لئے بارش میں شرابور یہاں پہنچا ہوں، مزاحیہ لکھ رہے ہو نا؟ کیا کیا جائے موسم بہت خراب ہے"۔

"بس یار! اب کے تو میں نے موسم کو ہی رگیدا ہے"۔

عبدالرزاق ساتھ ساتھ کانپتا جاتا ہے اور بار بار خالی انگیٹھی کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے۔ "شیخ صاحب! جب تک انگیٹھی کوئلوں سے بھری

ہوئی باہر نہ آئے ہم ایک لفظ بھی نہ سنیں گے"۔

شیخ صاحب بھاگے ہوئے گئے اور دوسری انگیٹھی ہانپتے ہوئے لے کر اندر داخل ہوئے۔ نہایت تیزی سے دروازے کو چٹخنی چڑھا دی اور دروازے کے سوراخ پر کان رکھ کر کچھ سننے لگے گویا کوئی شخص ان کا تعاقب کر رہا تھا، عبدالرزاق تاڑ گیا تھا کہ بیوی ان کے پیچھے بھاگی آئی ہوگی

"اب بات بنی نا" یہ کہہ کر عبدالرزاق نے اپنا گیلا کوٹ اتارا اور انگیٹھی پر خشک کرنے لگا، شیخ صاحب کبھی متین ہو کر، کبھی مسکرا کر، کبھی مٹک مٹک کر، کبھی زور دے کر، کبھی ٹھوڑی کو ہاتھ کا سہارا دے کر اپنا مضمون سنا رہے تھے اور وہ پاجی بے اختیار قہقہے لگا رہا تھا، حالانکہ ان قہقہوں میں وہ کچھ بھی سن نہ رہا تھا،

جب مضمون سنا چکے تو شیخ صاحب فرمانے لگے۔

"دوست! کشمیرے کا ایک نیا سوٹ سلوایا ہے، ذرا دیکھو تو یہی بدن پر بیٹھتا ہے یا نہیں"۔

شیخ صاحب نے آن واحد میں سوٹ صندوق سے باہر نکالا اور عبدالرزاق کے سامنے ہی بدلنا شروع کر دیا، عبدالرزاق تھوڑا سا کھسیانا ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگا، جب شیخ صاحب فارغ ہو چکے تو عبدالرزاق چیخیں مار مار کر ہنسنے لگا۔

"ارے میرے دولہے! ارے میرے دولہے!" کہتا ہوا شیخ صاحب کے نزدیک آگیا اور ان سے بغلگیر ہو کر کہنے لگا،

"آج تو آپ کو ہر صورت باہر جانا ہوگا"۔

"عبدالرزاق! ذرا موسم اچھا نہیں، آج کیچڑ و کیچڑ بھی بہت ہوگا"۔

"ارے بھائی! آج تو اس سوٹ پر لڑکیاں قتل ہو جائیں گی، آج مال روڈ پر جس کی طرف تم نے دیکھا بس وہ عمر بھر کے لئے لونڈی ہو جائے گی، اب تو اکا دکا بادل آسمان پر بھٹک رہا ہے آج آپ نہ گئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے فرائض معاشرت کی عدم ادائیگی میں سنگین ترین گناہ کیا"!

عبدالرزاق کا اتنا کہنا تھا کہ شیخ صاحب فوراً تیار ہو گئے، اس میں شک نہیں جب وہ گھر سے چلے تھے تو مطلع صاف ہو چکا تھا لیکن راستے میں پھر مشرق سے بادل اٹھے اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ غالباً ان بوندوں کو تو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن زمین سے کیچڑ کا اچھال بالکل ناقابل برداشت تھا اور خاص کر شیخ صاحب تو اس دن نیا سوٹ پہن کر نکلے تھے اور خدا کی مرضی یہ کہ ان کی چال بھی عجیب و غریب تھی، کیچڑ اچھل اچھل کر رانوں کی خبر لا رہا تھا، سامنے کے چھینٹے ہاتھ سے صاف کر کے پتلون کی جیب میں صاف ہاتھ پونچھ لیتے، پچھلے حصے میں کیچڑ جو کچھ کر رہا تھا۔ اس سے بے خبر تھے، سردی کے مارے لرزہ براندام ہو رہے تھے۔ کم بخت عبدالرزاق نے سویٹر بھی تو نہ پہننے دیا، اس خیال سے کہ نئے سوٹ کی شان میں فرق آجائے گا، بے چارے عجیب مصیبت میں مبتلا تھے،

گھر پہنچے، دیر تک بے چارے سوٹ کا مرثیہ پڑھتے رہے اور چاقو سے چھیل چھیل کر گرم کپڑے کی تمام پُرا تار دی۔ لیکن کیچڑ تو ایسا دھس گیا تھا کہ صرف جلانے سے ہی نکل سکتا تھا۔ آپ از حد بپھرے اور خوب جی بھر کر عبدالرزاق کو بے نقط سنائیں جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو کوٹ کو میخ پر لٹکا دیا، تمام رات نیند نہ آئی، کئی بار اٹھ اٹھ کر میخ کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

دوسرے روز آپ بہت بے قرار تھے چنانچہ غصے میں بھر سویرے کو اکیلے ہی نکل کھڑے ہوئے، سب سے پہلے آپ نے چھاتا خریدنے کا تہیہ کیا، دکاندار سے کہا

"کوئی اچھا سا چھاتا دے دو"۔

"شیخ صاحب! آپ کو بالکل نئی چیز دکھاؤں گا"!

دکاندار خود بخود کھل جانے اور بند ہونے والا چھاتا لے آیا اور شیخ صاحب کے سامنے عمل کیا، شیخ صاحب کچھ اس خیال سے کہ دکاندار نے انہیں شیخ صاحب کہہ کر مخاطب کیا اور کچھ یہ بات کہ وہ نئی چیز ہاتھ میں دیکھنا چاہتے تھے، چھاتا خرید لیا۔

ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ بادل کڑکا اور چھم چھم بارش شروع ہو گئی، اب شیخ صاحب چھاتے پر دھرے ہو رہے ہیں لیکن بٹن دبانے کا ڈھنگ وہ بھول گئے، بھاگتے جا رہے ہیں اور چھاتے سے ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ کپڑوں میں سے پرنالوں پانی بہہ رہا ہے۔ جب خوب شرابور ہو گئے تو چھاتا ٹن سے کھل گیا، اس وقت بارش بھی ختم ہو چکی تھی، انہیں امید نہ تھی کہ چھاتا کھل جائے گا۔ اس بوکھلاہٹ میں چھاتا کھلنے سے ایک بھلے مانس کی ہیٹ اڑتی نظر آئی ہوا تیز ہو چکی تھی اس لئے ہیٹ سڑک پر قلابازیاں لگاتی ہوئی بھاگ رہی تھی، کہیں ایک صاحب کا کتا یہ تماشا دیکھ رہا تھا وہ ہیٹ کے پیچھے دوڑا اور کافی فاصلے پر جا کر ٹوپی کو دبوچ لیا، سڑک پر چاروں طرف قہقہے بلند ہو رہے